غالبؔ کی مکتوب نگاری

غالب نامہ
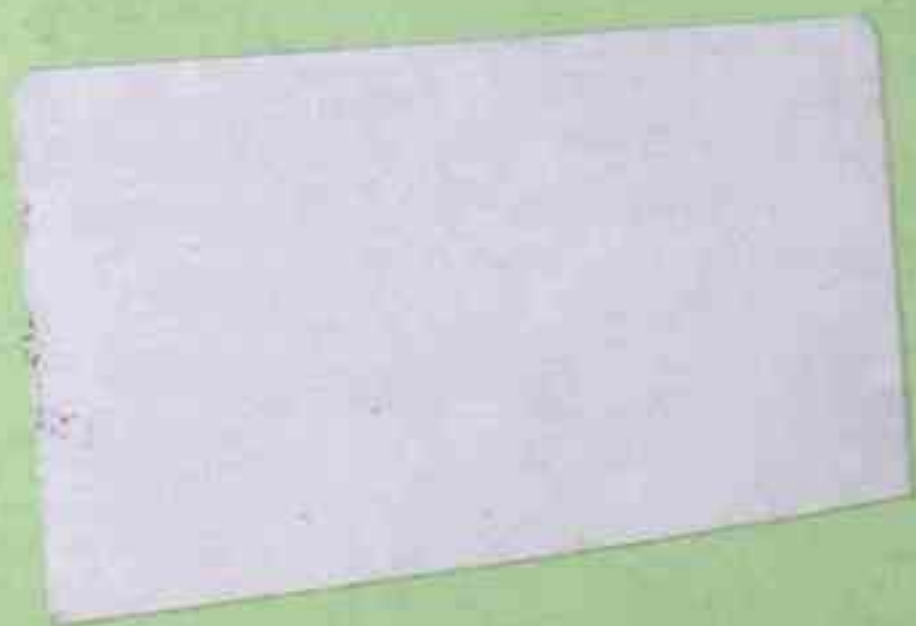
غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

مجلّہ
غالب نامہ

مجلہ

غالب نامہ

اُردو میں علمی اور تحقیقی رفتار کا آئینہ

مدیراعلا: پروفیسر نذیر احمد

مدیران:

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی

پروفیسر شریف حسین قاسمی

شاہد ماہلی

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

مجلّہ غالب نامہ نئی دہلی

جولائی ۲۰۰۳ء

جلد نمبر ۲۴ — شمارہ نمبر ۲

قیمت:- = ۱۲۰/روپے

ناشر و طابع : شاہد ماہلی

کمپیوٹر کمپوزنگ : محمد عمر کیرانوی

مطبوعہ : عزیز پرنٹنگ پریس، دہلی

خط و کتابت کا پتا

غالب نامہ، غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی۔۲

فہرست مضامین

اداریہ

غالب نامہ کا جولائی ۲۰۰۳ء کا شمارہ پیش خدمت ہے۔ اس میں وہ تمام مضامین شامل ہیں جو انٹرنیشنل غالب سمینار ۲۰۰۲ء میں پیش کیے گئے تھے۔ یہ سمینار غالب کے فارسی اور اردو خطوط سے متعلق تھا اس لیے شرکائے سمینار نے غالب کے فارسی اور اردو خطوط کے تقریباً تمام ہی اہم پہلوؤں پر اظہار خیال کیا ہے اور اس طرح یہ شمارہ غالب کی نامہ نگاری پر ایک سیر حاصل گزارش کا حامل ہے۔

غالب کے اردو خطوط ایک خاص اسلوب میں لکھے گئے ہیں جو غالب ہی سے مختص ہے لیکن فارسی خطوط میں غالب نے تقریباً وہی انداز بیان و نگارش اختیار کیا ہے جس کا ہندستان میں کئی صدیوں سے چلن تھا۔ غالب کے یہ خطوط بنیادی طور پر بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان میں گوناگوں امور سے بحث کی گئی ہے۔ یہ خطوط ان کی زندگی، احباب، شاگردوں وغیرہ سے ان کے تعلقات کی نوعیت، ان کے ادبی رجحانات، معاصر سماجی، معاشرتی حالات کی عکاسی اور ان کے بارے میں

غالب کی رائے، علمی و ادبی معرکے وغیرہ پر بھرپور روشنی ڈالتے ہیں۔ ان تمام موضوعات پر اس شمارے میں تحقیقی مقالات شامل ہیں۔ اس کے علاوہ چند دیگر مضامین میں غالب کے خطوط کا لسانی اور اسلوبیاتی تجزیہ، فارسی خطوط کے اردو تراجم پر تبصرہ، غالب کے جعلی خطوط، غالب کے مکاتیب میں طنز و مزاح وغیرہ کا تجزیاتی مطالعہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

غالب نامہ میں عام طور پر غالب سے متعلق ہی مضامین و مقالات شائع کیے جاتے رہے ہیں۔ ہماری کوشش یہ ہے کہ موضوعات و مطالب کے لحاظ سے اس کے دائرۂ کار کو وسعت دی جائے۔ فارسی اور اردو زبان و ادب سے متعلق دیگر اہم موضوعات پر تحقیقی مقالات بھی اس میں شامل ہوں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے امید ہے کہ ہمارے محققین تعاون کریں گے۔

پروفیسر نذیر احمد

مکاتیبِ غالب کے تین زاویے

مکاتیبِ غالب کے اس مطالعے کے تین زاویے ہیں۔
ایک مکتوب نگار کے مفہوم کو پیشِ نظر رکھ کر اور ان کے مضمرات کو سمجھنے کی کوشش دوسرے مکتوب الیہ کے نقطۂ نظر سے ان کے اپنے مرتبے اور حیثیت اور خطوط کے مطالب کو پیشِ نظر رکھ کر ان خطوط کہ سمجھنے کی کوشش اور تیسرے مکتوب کے نفس مضمون کے مطالعے اور تجزیے سے اور مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کی شخصیتوں اور ان کے ارتباط کے پیشِ نظر تاریخ کے اس دور کو پہچاننے کی کوشش۔ ممکن ہے ان کوششوں سے اس دور اور غالب کی شخصیت کے کچھ گوشے منور ہوں۔
غالب کے مکاتیب پر ان نقاط نظر سے غور کیا جائے تو بعض دلچسپ باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ مکتوب نگار کی شخصیت ان تمام معاملات پر غالب ہے۔ یہ خطوط رشید احمد صدیقی صاحب کے الفاظ میں شارع عام کی ایک گزرگاہ پر کھلنے والے دریچے بلکہ سہ دری میں بیٹھے ہوئے اس کھلے ڈلے شخص کو یاد دلاتے ہیں جو ہر

آنے جانے والے سے دوگال ہنس بول لیتا ہے، کچھ اپنی کہتا ہے کچھ اس کی سنتا ہے کہ اس کے نزدیک یہ کہنا سننا ہی زندگی کا بلکہ نشاط زیست کا حصہ ہے۔ مرزا غالب کی باتیں کچھ آپ بیتی ہیں کچھ جگ بیتی کچھ اپنی باتیں کچھ زمانے کی باتیں ہیں کہ زمانہ نام گزرنے کا ہے گزرتا ہے اور دونوں پر گزرتا ہے اپنے اوپر بھی اور دنیا پر بھی۔

مگر اس سلسلے میں ایک اور غور طلب امر یہ بھی ہے کہ غالب نے اپنے کو اس بظاہر کھلی ڈلی گفتگو میں کتنا دکھایا ہے اور کتنا چھپایا ہے۔ غالب کے انتقال کے سو برس سے زیادہ گزر جانے پر بھی یہ سوال اور بھی اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ غالب کی وہ تصویر کتنی حقیقی ہے جو حالی نے یادگارِ غالب میں سجا بنا کر پیش کی ہے یا ان مرقعوں میں بھی کچھ حقیقت ہے اور ہے تو کتنی حقیقت ہے جو ذکاء اللہ دہلوی نے اور ان کے بعد اپنے مخصوص تمثیلی رنگ میں محمد حسین آزاد نے آب حیات اور بقائے عام کا دربار میں پیش کی ہے اور اسی کے ساتھ وہ باتیں ہیں جو ادھر ادھر کی باتیں ہیں مگر ان کے مزاج اور کردار کے بارے میں ہیں اور مختلف ذرائع سے سامنے آئی ہیں۔ ان سب باتوں کو اگر جوں کا توں مان بھی لیا جائے تو بھی غالب کے کردار اور مزاج کا وہ پہلو سامنے آتا ہے جو ایک فرشتہ صفت انسان کی انسانی کمزوریوں کو ظاہر کرتا ہے۔ یہی وہ پہلو ہے جو ان کے مختلف مکاتیب میں بھی نمایاں ہے خاص طور پر ان فارسی مکاتیب میں جو انگریز افسروں یا ان سے قربت رکھنے والے غالب کے دوستوں کو لکھے گئے ہیں۔

مکتوب نگار کا مقصد اظہار ذات ہوتا ہے بلکہ اظہار ذات بھی اس حد تک جتنا کہ مکتوب الیہ کو مقصود ہو۔ گویا مکتوب نگار اپنی شخصیت کا صرف وہ پہلو اپنے خطوں میں ظاہر کرتا ہے جو مکتوب الیہ کے لیے کوئی معنویت رکھتا ہو۔ اس اعتبار سے ہر خط گویا مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے درمیان ایک حد اوسط کا درجہ رکھتا ہے کہ دونوں کے ذوق، معاملات، دلچسپیوں، مشغلوں اور شخصیتوں کے مشترک عناصر سے متعلق ہوتا

ہے۔ مرزا اس کا خاص طور پر بہت خیال رکھتے ہیں کہ کوئی خط بھی محض ان کی اپنی شخصیت کے گرد گھومتا نہ رہ جائے بلکہ اس میں کوئی نہ کوئی پرتو مکتوب الیہ کی ذات کا بھی شامل ہو یا اس کی دلچسپی اور دل بستگی کے چند نکات ضرور ہوں ورنہ مکتوب الیہ کے لیے خود اپنی ذات سے متعلق افکار و حوادث کا بیان ایسا دل نشیں ہو کہ مکتوب الیہ کے لیے دلبستگی اور قربت کا احساس پیدا کر سکے۔ اس سلسلے میں ظرافت اور خوش طبعی سے مرزا نے بڑی مدد لی ہے۔

ظرافت اور خوش طبعی یوں بھی مرزا کے آزمودہ ہتھیار ہیں۔ جہاں ان پر افسردگی اور قنوطیت کا شدید حملہ ہوتا ہے وہ ہمیشہ ظرافت کو سپر کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ یہ روش ان کی اردو اور فارسی شاعری ہی میں نہیں ان کے فارسی اور اردو مکاتیب میں بھی جا بجا برتی گئی ہے اور بڑی کامیابی سے برتی گئی ہے مثالیں ذہنوں میں گردش کرنے لگی ہوں گی، اشارے کے طور پر حاتم علی مہر کی بیگم کی تعزیت کا خط یا پھر سال کے آخری دن لکھنے کا انداز اور دوسرے دن یعنی دوسرے سال کے پہلے دن پہنچنے والے خط کا تذکرہ یا میر مہدی کے خط کا جواب دیر سے لکھنے کی پر لطف توجیہہ۔

اس ظرافت طبعی کو بھی مرزا نے ایک مستقل تکنیک کے طور پر استعمال کیا ہے۔ مکتوب الیہ اور مکتوب نگار کے درمیان قربت اور یگانگت کی راہیں کھول دی ہیں اور مکتوب نگار کو مکتوب الیہ سے قریب تر کر دیا ہے اور محض خوش طبعی اور خوش وقتی کے ذریعے قریب کر دیا ہے۔ جس کے عوض مکتوب نگار کو اپنی گرہ سے کچھ صرف کرنا نہیں پڑتا بس اقبالؔ کے لفظوں ''میں تبسم بہ لب اور رسید و ہیچ نگفت'' والی کیفیت ہی پیدا ہوتی ہے اور وہی مقصد ہے۔

یہاں یہ ذکر واجب ہے کہ غالب کے خطوط سے شاعر غالب کے شعری رویوں اور زندگی کے بارے میں تصورات کو سمجھنے کے سلسلے میں خاطر خواہ کام نہیں

لیا گیا ہے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر غالب کے تصورفن اور الفاظ کے انتخاب پر بھی ان خطوط کے ذریعے بہت کچھ روشنی پڑسکتی ہے مثلاً غالب نے اپنے خطوط میں کئی جگہ اپنے اشعار کے معانی ومطالب سے بحث کی ہے اور ان سے مختلف شارحین نے استفادہ بھی کیا ہے۔ اسی طرح شعری نظام میں بعض تسامحات کے جواز کا بھی پہلو ڈھونڈ نکالا ہے حافظ کے مشہور مطلع کے قوافی مختلف ہونے پر بھی بحث کی ہے اور اس کا جواز بھی شعر کے مفہوم یعنی اس کی سرمستی سے ڈھونڈ نکالا ہے:

صلاح کار کجا و من خراب کجا

بہیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

اس میں خراب کا قافیہ دوسرے مصرع میں تا بہ کجالا کر خود ہی حافظ نے توڑ دیا ہے اور اس کا جواز غالب نے پہلے مصرعے کے الفاظ میں خراب کی سرمستی اور آزادمنشی سے فراہم کیا ہے۔ علاوہ بریں خود غالب کے اردو اور فارسی کے اشعار کی شرحیں اور ان میں موجود تراکیب اور کسی قدر مبہم اشاروں کی توضیحات بھی بڑے لطف اور سلیقہ مندی سے کی گئی ہیں۔ ان میں دیوان غالب (اردو کا پہلا شعر بھی شامل ہے اور ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد، بھی اور

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم

میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

کی پوری داستان بھی۔ اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ۔

اس کے پہلو بہ پہلو غالب کے ساتھ کم سے کم اس قبیل کے خطوں میں ان کے مکتوب الیہ کی شخصیتیں ہی غالب ہیں۔ کسی کو تعزیت کا خط لکھتے ہیں، کسی کو مبارکباد دیتے ہیں، کسی کو اپنے ڈھب سے خط کا جواب دیر سے بھیجنے کی وجہ بیان کرتے ہیں۔ کسی سے قریبی تعلق کا اظہار مقصود ہے تو کسی سے اس تعلق خاطر کے باوجود تقریظ

یاد دیباچہ نہ لکھنے کی معذرت مگر یہاں اہم نکتہ یہ ہے کہ جس قسم کے الفاظ مکتوب الیہ کی تالیف قلب کے لیے ضروری ہیں، وہی صرف ہوئے ہیں اس طرح کہ جیسے مکتوب لکھ لیے ہوں مثالیں یہاں بھی بہت ہیں۔ ہر گوپال تفتہ کے نام خطوں کا مطالعہ ہی کافی ہے۔

بایں ہمہ ان تمام خطوں کا معکوس مطالعہ ہنوز باقی ہے یعنی ان خطوں کا اس طرح مطالعہ بھی ضروری ہے جیسے وہ مکتوب الیہ حضرات کو لگے ہوں گے اور انہوں نے جس طرح انہیں پڑھا ہوگا کہ یہ دراصل انہی کی دل دہی کے لیے گویا انہیں کے محاورے میں لکھے گئے ہیں گو طرز انشا غالب کا ہے خصوصیت سے ذکر ضروری ہے ان خطوط کا جن کا مجموعہ مرزا محمد عسکری نے ادبی خطوط غالب کے نام سے مرتب کیا تھا۔ وہ مدتوں ایم اے اردو کے نصاب میں شامل رہے ان میں غالب سے زیادہ غالب کے مکتوب الیہم کا غلبہ ہے اور ان دونوں سے زیادہ غالب کی سخن سنجی اور سخن فہمی کا۔

باقی رہا مکاتیب غالب کا تیسرا مصنف یعنی مصنف کا زمانہ جس نے غالب کے ہاتھ سے تقریباً قلم چھین کر غالب اور عہدِ غالب کی روداد اپنے ڈھنگ سے لکھ ڈالی اور اس میں صرف مصنف کے احوال و کوائف ہی نہیں ان کے دور، ان کے رفقا ان کے شہر کے ٹوٹے پھوٹے کھنڈروں سے اٹھتی ہوئی آہ و فریاد، نوحہ گری اور سینہ کوبی کو گویا درد و کرب کی آواز میں محفوظ کر دیا ہے۔ یہاں غالب یکے از مظلومین یا یکے از مجاہدین ہیں اور زمانے کا ظالم ہاتھ جو اس وقت انگریز حکومت یا فرنگی راج کہا جاتا تھا، سارے نظام او رانتظام کو توڑتا پھوڑتا ہے بے باکانہ گویا رقص بتاں آذری میں مصروف تھا۔ یہاں غالب غالب نہیں ہیں بلکہ زمانے کی دسترس سے مغلوب ہیں، ان میں زمانے کو تلاش کرنے کا کام بہت کچھ ہو چکا ہے مگر اس کے ساتھ غالب

کی مرثیہ خواں شخصیت بھی مدفون ہے لیکن یہ محض مرثیہ خواں ہی شخصیت نہیں گو گریہ و ماتم کی لے سب سے زیادہ نمایاں ہے مگر اس کے باوجود ایک صاحب بصیرت کے دل کی دھڑکنیں بھی کہیں کہیں سنائی دے جاتی ہیں جس کا درد ماضی سے حال کی آخری سرحد تک جا پہنچتا ہے اسی لیے تو جب کسی اندھیری رات کے سناٹے میں کسی فقیر کو اپنی غزل پڑھتے سنتا ہے تو بے چین ہو اٹھتا ہے:

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
ہم نے اپنے جی میں ٹھانی اور ہے

لیکن اس سے آگے بھی زمانے نے اور بھی کئی ورق الٹے۔ غالب کی شخصیت اور شاعری کو نیا رنگ و آہنگ ملا۔ ایک بار یاد کر لیجیے کہ یہ کسی دودھ کے دھلے شاعر اور نثر نگار کا ذکر ہے جو آگرے سے چلا اور اپنی سسرال آکر دہلی میں آباد ہوا جو رئیس زادوں کے شوق ہوتے ہیں وہ بھی سب اختیار کیے۔ شراب سے پرہیز نہیں تھا بلکہ ایسے علی الاعلان پیتے تھے کہ شعر و شاعری سے نکل کر شراب نوشی کا چرچا دوستوں کے نام خطوں تک میں برملا ہوتا تھا فسق و فجور نہ سہی مگر زہد و تقوی سے بھی کوئی خاص علاقہ کبھی نہیں رہا حد یہ ہوگئی کہ بہادر شاہ ظفر کے استاد ہونے کے باوجود جوے کا اڈا چلانے کے جرم میں قید فرنگ بھی بھگت آئے اور اس کی سرگزشت بھی اپنی فارسی مثنوی میں کھلم کھلا بیان کر ڈالی اور خطوط میں بھی اس کی پاداش بھگتنے پر رضامندی ظاہر کرنے سے گریز نہ کیا چاہے کوئی مرنے کے بعد احتساب کے طور پر لاش کو گلیوں میں گھسیٹتے پھرنے کی ہی سزا کیوں نہ دے۔

یہی نہیں سیاسی زندگی کے بدلتے تیوروں سے قدم قدم پر سمجھوتہ کرتے رہے۔ کچھ لوگ کہتے رہے کہ غدر کے زمانے میں جسے آج پہلی جنگ آزادی کا نام مل گیا ہے، بہادر شاہ ظفر کے لیے سکہ شعر انہوں نے ہی کہا تھا اور جب انگریزوں کی

حکومت بحال ہوگئی تو اس سے منکر ہو گئے نواب صاحب رام پور کے دربار سے اپنے پرانے محسن اور کرم فرما کا وظیفہ منسوخ کرا کے اپنے نام وظیفہ جاری کرانے کی کوشش بھی کرتے رہے۔

یہ اور اتنی کتنی ہی انسانی کمزوریوں کے باوجود زمانے نے ابد کے سرورق پر غالب کا نام تحریر کر دیا وہ بھی ایسا کہ اس دوران ذکاء اللہ دہلوی، اور محمد حسین آزاد سے لے کر ڈاکٹر عبداللطیف اور یگانہ چنگیزی کی بے رحم تنقیدوں کے باوجود اس طرح تابندہ ہے مگر اور زیادہ روشن ہے، کمال یہ ہوا کہ ۱۹۴۷ء کے بعد جب ملک سے انگریزوں کی حکومت کا خاتمہ ہوا تو فرنگی حکومت کے بارے میں اور اس حکومت کے دوران غالب کے بیانات نئی معنویت کے ساتھ ابھرے اور ان میں اس دور کے مصائب و آلام میں مبتلا ایک ذہین اور طباع شاعر اور نثر نگار کی روداد ہی سامنے نہیں آئی، پورے معاشرے کی مضطرب حسیت بھی نمایاں ہوگئی اور یہ محض تاریخ کے ایک دور ہی کی روداد نہ تھی کہ زمانہ ورق پلٹ دے اور وہ محض یادگار زمانہ بن کر رہ جائے بلکہ ایک زندہ اور متحرک فن کار کا تخلیقی وجود تھا جو زمانے کی سفاکی سے تڑپ رہا تھا اور اس کی ظالمانہ گرفت سے آزادی اور نجات چاہتا تھا اس کا مقصد تو اسی کشمکش کو بیان کرنا تھا جو ازل سے بندھی ٹکی انسانی صورت حال اور اس سے نبرد آزما لامحدود انسانی وجود کے ارمان و خواہشات اور ان کے غیر متعین حدود اور امکانات کے درمیان ہمیشہ سے جاری رہی ہے اور شاید ہمیشہ جاری رہے گی۔

مکاتیب غالب ان کا ایک ادنیٰ سا بیان ہیں مگر یہ ادنیٰ بیان ان عالمگیر صداقتوں کی بنیاد بنتا ہے جس پر ان کی شاعری اور شخصیت کی جادوگری کے سبھی تصورات قایم ہیں۔ نثر کے ان ٹکڑوں کے بغیر غالب بھی ادھورے ہیں ان کی تفہیم بھی ادھوری ہے اور شاید غالب کی تقدیر اور مستقبل اسی ادھورے پن سے وابستہ ہے۔

اس منزل پر غالب کی گرفت میں ماورائے وقت کی حقیقتیں بھی آ جاتی ہیں جن کے بیان کی ایک جھلک ہرگوپال تفتہ کے نام ان کے خط کے ان جملوں میں ملتی ہے:

"زیست بسر کرنے کو کچھ تھوڑی راحت درکار ہے باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری سب خرافات ہے۔ ہندوؤں میں اگر اوتار ہوا تو کیا اور مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا۔ دنیا میں نامور ہوئے تو کیا اور گمنام جئے تو کیا۔ کچھ معاش ہو کچھ صحت جسمانی، باقی سب وہم ہے اے یار جانی"

یا پھر اس کا اختتامیہ غالب کا یہ فارسی شعر بھی ہو سکتا ہے جو شاید انہوں نے ایسے ہی کسی عالم سرخوشی میں لکھا ہوگا:

خوشا کہ گنبد چرخ کہن فروریزد
اگرچہ خود ہمہ بر برق من فروریزد

کیا غالب کا یہ شعر نہیں جو ہمارے آپ کے پورے دور کے المیے کا موزوں اور مناسب بیان نہیں ہے!!

حنیف نقوی

غالب کا ایک فارسی خط اور ان کا سفرِ فیروز پور

غالب تاریخ و تحقیق سے دلچسپی رکھنے کے باوجود تاریخی و تحقیقی شعور سے یکسر عاری تھے۔ ان کے اندر اپنے رشحاتِ قلم کو محفوظ رکھنے اور نقل و اشاعت کے ذریعے دور دراز کے قدر شناسوں اور مستقبل کے قارئین تک پہنچانے کا داعیہ بے حد قوی تھا لیکن اسکا مطلق احساس نہ تھا کہ بیانِ واقعات کے معاملے میں کسی تحریر کو کتنا واضح اور غیر مبہم ہونا چاہیے۔ چنانچہ ان کی تحریروں یا مخصوص فارسی کے خطوں میں ان کی زندگی کے لاتعداد واقعات اور ان کی مصروفیات و مشاغل کی بے شمار تفصیلات محفوظ ہیں لیکن ان میں غالب اکثریت ان بیانات کی ہے جن کے ساتھ تاریخیں اور سنہ مذکور نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ بعض اوقات کسی اہم واقعے سے واقفیت کے باوجود، اس معمے کے حل کی کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ وہ کب پیش آیا۔ بے یقینی اور لاچاری کی اس کیفیت کے ساتھ ناگزیر طور پر قیاس آرائیوں کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جس کی تان زیادہ تر پراگندہ خیالی اور اختلافِ رائے پر ٹوٹتی ہے۔ تحریروں کے اس زمرے میں ان کا وہ خط بھی شامل ہے جو انہوں نے فیروز پور جھرکا سے اپنے محبِ خاص مولانا

فضل حق خیر آبادی کے نام لکھا تھا۔ غالب کی نگاہ میں اس خط کی وقعت اس اعتبار سے زیادہ تھی کہ یہ صنعتِ تعطیل میں لکھا گیا ہے اور فارسی میں ان کی نثر نگاری و انشاپردازی کا ایک مثالی نمونہ ہے لیکن غالب شناسوں کے نقطۂ نظر سے اس کی اہمیت کا اصل سبب یہ ہے کہ اس سے غالب کے سفرِ فیروز پور کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہے جو ان کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے اور بعد کے کئی برسوں کے واقعات کے سلسلے میں نقطۂ آغاز کی حیثیت رکھتا ہے۔

غالب نے اس خط کو ''پنج آہنگ'' یا ''سبدِ باغ دو در'' میں اپنے دوسرے فارسی خطوں کے ساتھ ایک مستقل بالذات مکتوب کی حیثیت سے شامل کرنے کی بجائے ''خاتمۂ گلِ رعنا'' اور مولوی محمد علی خاں صدر امینِ باندہ کے نام کے ایک خط میں اپنی فارسی نثر کے نمونے کے طور پر نقل کیا ہے۔ ان دونوں مقامات پر اس کے سیاق و سباق سے اس کے زمانۂ تحریر کے بارے میں جو اطلاعات ملتی ہیں، وہ بادی النظر میں باہم مطابقت نہیں رکھتیں۔ ''خاتمۂ گل رعنا'' میں غالب کا بیان ہے:

> ''روزے بود روزگارے کہ بہ فضائے جنت کدۂ دہلی بال افشاں بودم ... نہ بر چہرۂ من از روزگار گردے و نہ در دل سپہر از من غباری.. نا گرفتہ.. دل از آسودگی برآشفت و... شوقِ آوارگی از شش جہت آغوش بہ روے دل کشود۔ ناچار نخست بہ عزمِ زمیں بوسِ عم مغفور... نواب احمد بخش خاں بہادر رستم جنگ بہ پائے تختِ آں مرزبانِ بارائے و فرہنگ... پائے خاکی کردم۔ از بس کہ سراسیمگی سراپائے دل را فرا گرفتہ بود، از بزرگانِ وطن چہ رود ناشدہ بہ راہ اقتام۔ ہر چند از آں مردم شرمندۂ

مہر وفائے نہ بودم کہ در حسرتِ فوتِ فرصتِ تودیع پشتِ
دستے بہ دنداں بایستے گزید لیکن پارسا گوہر دوستے وآشنا
پرورپارے داشتم، چوں من بر من مہرباں و چوں دل
در سینہ جاگزیں.... مستغرقِ تماشائے جمالِ وجہِ مطلق،
مولوی حافظ محمد فضلِ حق کہ از روے دستوری ناخواستہ سفر
کردن بہ مذاقِ شوقم، ناگوار افتاد....دل بہ درد آمد و جاں
بہ یغمائے اندوہ رفت۔ چوں کارواں بہ منزل رسید و
رہرو از رنجِ راہ برآسود، کتابتے در صنعتِ تعطیل بہ
خدمتش فرستادہ شد.... چوں سررشتہ ہر کار بہ زمانے
بازبستہ است، دراں کشاکش از بند نہ توانستم
بدر جست۔ بے خودی گریبانم گرفت و بازم بہ دہلی
آورد۔ روزگارے دراز بہ خاک نشینی سپری شد و چرخِ
گردندہ بسی برگرد ایں خاکداں بگشت کہ غنودگی ہائے
مرا بامداد رسید و مرغِ سحر خواں شوقِ نو برآورد... شوقِ
سلسلہ خازنجیر خودداری گسیخت و.... پائے خوابیدہ بہ رفتار
آمد... ہر چند مرا بایستے بہ کلکتہ رسید و چارۂ لب تشنگیِ
خویش از محیط جست۔ امّا ازاں جا کہ عنانِ جنبشِ
ذراتِ کائنات بہ کفِ اضطرار سپردہ اند... نخست اتفاق و
رود بہ لکھنؤ افتاد....،،

اس تفصیل وتوضیح کا ماحصل یہ ہے کہ غالب بہ قول خود دہلی میں سکون و
عافیت کی زندگی گزار رہے تھے کہ ناگاہ شوقِ آوارگی نے سر اٹھایا اور انہیں پہلے مرحلے

میں نواب احمد بخش خاں کے دردولت تک پہنچادیا۔ چوں کہ وہ سراسیمگی کے عالم میں اس سفر پر نکلے تھے، اس لیے اپنے بزرگوں اور دوستوں سے وداعی ملاقات بھی نہ کرپائے تھے۔ خاص طور پر مولانا فضل حق سے نہ مل پانے کا انہیں بے حد افسوس تھا، چنانچہ منزل پر پہنچ جانے اور صعوباتِ سفر سے آسودہ ہوجانے کے بعد انہوں نے مولانا موصوف کے نام بہ طورِ معذرت صنعتِ تعطیل میں ایک خط لکھا۔ اس کے بعد کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ انہوں نے آگے سفر کا ارادہ ملتوی کردیا اور دہلی واپس چلے آئے۔ اس واقعے پر مدتِ دراز گزر جانے کے بعد یہ جنونِ آوارگی ایک بار پھر تازہ ہوا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اس بار وہ بہ راہِ راست کلکتہ پہنچتے مگر وقت اور حالات کی رو انہیں کلکتے سے پہلے لکھنؤ لے گئی۔

مولوی محمد علی خاں کے نام کے خط میں اس مکتوب کی شانِ نزول اس طرح بیان کی گئی ہے:

"درمبادیِ بسیچ سفرِ مشرق بہ فیروز پور کہ جاگیر عمو صاحب قبلہ... نواب احمد بخش خاں بہادر رستم جنگ است، بہ خدمتِ عمِ ممدوح گزرانیدہ بودم۔ فخر العلما مولوی فضلِ حق نام دوستے در دار الخلافہ تمکن داشت کہ من از فرطِ استعجال فرصتِ تودیع نہ یافتہ (واز و) پدرود ناشدہ بہ منزل مقصود شتافتہ بودم۔ دراں جا رسیدہ پوزش نامہ بہ خدمتِ کثیر الافادتش نگاشتم ودراں (صنعت) تعطیل مرعی داشتم"۔[۴]

اس بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا صاحب جب مشرق یعنی کلکتے کے سفر کا ارادہ کرکے دہلی سے نکلے تھے تو شروع میں انہوں نے کچھ دن فیروز پور میں نواب

احمد بخش خاں کے ہاں گزارے تھے۔ اسی زمانے میں انہوں نے مولانا فضل حق کے نام یہ خط لکھا تھا۔ یہ بیان "خاتمہ گل رعنا" کے بیان سے اس اعتبار سے مختلف ہے کہ اس میں فیروز پور دہلی سے واپس آنے اور ایک طویل مدت یہاں گزارنے کے بعد بادی النظر میں دہلی سے بہ راہ راست کلکتے کے سفر پر روانہ ہو جانے کا ذکر تھا جب کہ اس بیان میں کلکتے کے لیے آمادگیِ سفر کے آغاز میں فیروز پور میں قیام کی بات کہی گئی ہے۔ مرزا صاحب کی اس عرضداشت پر بعض اندراجات سے بھی جو انہوں نے کلکتے پہنچنے کے کچھ دنوں بعد ۲۸ر اپریل ۱۸۲۸ء کو گورنر جنرل کے حضور میں پیش کی تھی، کچھ اسی قسم کا تاثر ملتا ہے کہ غالب فیروز پور پہنچنے کے بعد قرض خواہوں کے خوف کی وجہ سے وہاں سے دہلی واپس نہ جا سکے تھے اور کان پور، لکھنؤ اور باندہ ہوتے ہوئے سیدھے کلکتے چلے گئے تھے۔ روودادِ سفر کے بیان میں نظام الاوقات اور ترتیبِ مراحل کے اس فرق نے غالبیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک عقدۂ لاینحل کی صورت اختیار کر لی ہے چنانچہ ان اہل علم میں سے کوئی بھی شخص اس بارے میں شرحِ صدر کے ساتھ کچھ کہنے کے موقف میں نہیں کہ غالب صرف ایک بار فیروز پور جا کر وہیں سے کلکتے کے سفر پر روانہ ہو گئے تھے یا انہوں نے بہ اختلاف اوقات فیروز پور کے دو سفر کیے تھے اور اگر دو سفر کیے تھے تو ان کے درمیان کتنا زمانی تفاوت تھا؟ جن محققین و ماہرینِ غالبیات نے اس سلسلے میں تجزیہ و تحقیق اور غور و فکر کے بعد مختلف قرائن و دلائل کی روشنی میں کسی نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کی ہے، ان میں سے شیخ محمد اکرام، جناب مالک رام، سید اکبر علی ترمذی، پروفیسر محمود الہی، پروفیسر ابو محمد سحر اور جناب کالی داس گپتا رضا کے بیانات اس وقت ہمارے پیش نظر ہیں۔ شیخ محمد اکرام "خاتمہ گل رعنا" اور مکتوب بہ نام رائے چھج مل (مشمولہ پنج آہنگ) کے حوالے سے اس سفر کے محرکات، اس کے زمانہ آغاز اور اس سے متصل واقعات کا ذکر کرتے

ہوئے لکھتے ہیں:

''۱۸۲۶ء کے قریب (غالب اور نواب احمد بخش خاں کے درمیان) اختلافات رونما ہوئے۔ مرزا کے خسر مرزا الٰہی بخش معروف جو نواب کے بھائی تھے، اس سال وفات پا گئے... (یہ وہ زمانہ تھا)... کہ غالب کی حساس طبیعت کے لیے ذریعۂ معاش کی تنگی، بھائی کی بیماری، قرض خواہوں کے تقاضے اور دوسری مصیبتیں ناقابل برداشت (ہو چکی) تھیں۔ دوستوں نے مشورہ دیا کہ نواب کی خدمت میں اپنا دکھ درد بیان کرو، بہت ممکن ہے کہ وہ امداد کرے، چنانچہ مرزا دہلی سے فیروز پور جھرکہ گئے۔ نواب ان دنوں الور تھا اور اپنی پریشانیوں میں گرفتار تھا، اس لیے مرزا کو فیروز پور جھرکہ رکنا پڑا..... جب خدا خدا کر کے نواب الور کے قضیوں سے فارغ ہوا اور فیروز پور واپس آیا تو معلوم ہوا کہ دوستوں کے مشورے سے امیدوں کے جو قلعے بنائے ہوئے تھے، ان کی بنیاد ریت پر ہے اور نواب سے کسی طرح کی توقع رکھنا عبث ہے... مرزا کو دہلی ناکام واپس آنا پڑا۔

مرزا کو جب نواب صاحب کی طرف سے قطعی مایوسی ہوئی تو انہوں نے... کلکتے میں جہاں اس وقت حکومتِ ہند کے دفتر تھے، اپیل کرنے کا ارادہ کیا... وہ

تیس اکتیس برس کے ہوں گے، جب اس دور دراز سفر
کے لیے گھر سے روانہ ہوئے''۔[۳۳]

شیخ صاحب کی طرح مالک رام صاحب نے بھی غالب کے اس سفر کو ۱۸۲۶ء میں معروف کی وفات کے بعد کے واقعات میں شمار کیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ ان کے مطابق غالب نے سفر کلکتہ کے آغاز میں فیروز پور کی بجائے لوہارو پہنچ کر نواب احمد بخش خاں سے صلح صفائی کی کوشش کی تھی اور اس میں ناکامی کے بعد وہ وہیں سے کلکتے کے لیے روانہ ہو گئے تھے[۳۴]۔ گویا ''خاتمۂ گل رعنا'' میں نواب صاحب سے اس ملاقات کے بعد دہلی واپس آنے اور ایک طویل وقفے کے بعد وہاں سے دوبارہ سفر پر روانہ ہونے کا جو ذکر ہے، وہ درست نہیں۔ لیکن ۱۹۶۹ء کے ایک مضمون میں عرضداشت موسومہ گورنر جنرل پر مبنی اپنی اس رائے سے رجوع کرتے ہوئے انہوں نے لکھا تھا کہ

''وہ جب سفر پر روانہ ہوئے تو چونکہ روانگی سے پہلے
مولوی فضلِ حق خیر آبادی سے وداعی ملاقات نہیں
کر سکے تھے، اس لیے ان سے ملنے کو (فیروز پور سے)
دہلی واپس گئے اور پھر دوبارہ سفر پر روانہ ہوئے۔ کلیات
(خاتمۂ گل رعنا) کا بیان صحیح معلوم ہوتا ہے...
درخواست میں انہوں نے اختصار سے کام لیا اور اس
کا ذکر مناسب نہیں خیال کیا''۔[۳۵]

معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر محمود الٰہی کے اس اعتراض کے بعد کہ مولانا فضل حق سے ملاقات کی غرض سے غالب کا فیروز پور سے دہلی آنا ان کی کسی تحریر سے ثابت نہیں ہوتا[۳۶]، مالک رام صاحب ایک بار پھر اپنے سابقہ موقف کی طرف پلٹ گئے

چنانچہ "ذکرِ غالب" کے "پوری نظرِ ثانی اور اضافے کے ساتھ" "فروری ۱۹۷۶ء میں شائع شدہ ایڈیشن اور "توقیتِ غالب" "مطبوعہ جنوری ۱۹۷۷ء میں فیروز پور سے دہلی واپس آنے کا مطلق کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ "توقیتِ غالب" میں سفرِ کلکتہ پر روانگی اور مقدمہ پنشن کی تیاری کو دسمبر ۱۸۲۶ء کا واقعہ قرار دیا گیا ہے۔ اس سے پہلے فیروز پور جانے یا اس کے بعد فیروز پور سے دہلی واپس آنے کا کہیں کوئی ذکر نہیں ہے۔

پروفیسر محمود الٰہی کا مضمون "غالب کا سفرِ کلکتہ۔ایک غلط فہمی کا ازالہ" ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں انہوں نے بہ طور خاص مالک رام صاحب کے اس موقف کی تردید کی ہے کہ غالب نے صرف ایک بار فیروز پور کا سفر کیا تھا۔ ان کی تحقیق کے مطابق غالب کے سفر فیروز پور کی تعداد ایک سے زیادہ ہے اور اس بات کی کافی شہادتیں موجود ہیں کہ ۱۸۲۵ء میں جب وہ بھرت پور کے لیے نکلے ہیں تو اس سے قبل کم از کم ایک بار فیروز پور کا سفر کر چکے تھے۔ گویا "خاتمۂ گلِ رعنا" میں جس سفر سے دہلی واپس آ جانے کا ذکر ہے، وہ دہلی سے بھرت پور اور فیروز پور ہوتے ہوئے کلکتے جانے والے سفر سے مختلف تھا اور اس سے پہلے پیش آ چکا تھا۔

پروفیسر ابو محمد سحر کا مضمون "خاتمۂ گلِ رعنا اور غالب کا سفرِ کلکتہ" محمود الٰہی صاحب کے اس مضمون کا جواب ہے۔ وہ اس معاملے میں مالک رام صاحب کے ہم خیال ہیں یعنی ان کے نزدیک بھی غالب کی تحریروں سے ان کا ایک بار سے زیادہ فیروز پور جانا ثابت نہیں ہوتا۔ ان کا استدلال حسب ذیل ہے:

> "خاتمۂ گلِ رعنا میں کلکتے کے سفر سے قبل فیروز پور کے کسی اور سفر کا ذکر نہیں کیا گیا۔ باندے کے مولوی محمد علی خاں کے نام ایک خط میں انہوں نے مولوی فضلِ حق کے نام کے ایک خط کو نقل کرنے سے پہلے جو صراحت

کی ہے، اس سے "خاتمۂ گلِ رعنا" کی طرح صرف
اتنا (ہی) نہیں معلوم ہوتا کہ یہ خط انہوں نے فیروز پور
سے لکھا تھا، بلکہ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ فیروز پور کے جس
سفر سے یہ خط متعلق ہے، وہ انہوں نے 'در مبادی بسیچ
سفر مشرق' یعنی سفر مشرق کے ارادے کے اوائل میں
کیا تھا۔ چنانچہ خاتمۂ گل رعنا میں فیروز پور کے جس
سفر کا ذکر ہے، اس کو سفرِ کلکتہ کے سلسلے سے الگ نہیں
کیا جا سکتا، اور یہ ماننے کے سوا چارہ نہیں کہ کلکتہ جانے
سے پہلے فیروز پور کا یہ آخری سفر تھا جو غالب نے
کیا تھا۔"

فیروز پور سے دہلی کی واپسی کے سلسلے میں مختلف تحریروں میں جن اسباب و محرکات کا ذکر آیا ہے، ان کا تجزیہ کرتے ہوئے سحرؔ صاحب نے ایک بار پھر اپنے اس خیال کا اعادہ فرمایا ہے کہ:

"فیروز پور سے دہلی کی وہ واپسی جس کا خاتمۂ گل
رعنا میں ذکر ہے، بلاشبہ کسی ایسی ہنگامی واپسی سے
مختلف ہے جس کا درخواست سے گمان ہوتا ہے چنانچہ
کسی وقتی پریشانی میں غالب فیروز پور سے دہلی واپس
آئے ہوں یا نہ آئے ہوں، وہ بالآخر فیروز پور سے اس
طرح دہلی واپس آئے کہ کلکتے جانے سے قبل پھر
فیروز پور نہیں گئے، اور اس لحاظ سے خاتمۂ گل رعنا کا
اظہار حقیقت پر مبنی ہے"۔

جناب اکبر علی ترمذی نے اس معاملے میں کسی بحث و استدلال سے سروکار نہ رکھتے ہوئے صرف یہ لکھنے پر اکتفا کیا ہے کہ جب پنشن کے معاملے میں نواب احمد بخش خاں کی ناانصافیاں غالب کی حد برداشت سے باہر ہوگئیں تو وہ بھیس بدل کر اور گھوڑے پر سوار ہو کر دو تین ملازمین کے ساتھ دہلی سے نکلے اور اپنی شکایات براہ راست نواب صاحب کے سامنے پیش کرنے کے لیے فیروز پور پہنچے اور بھرت پور کے سقوط (۱۶؍ جنوری ۱۸۲۶) تک وہیں ٹھہرے رہے۔ کافی دنوں کے انتظار کے باوجود جب انہیں نواب صاحب کی طرف سے کوئی اطمینان بخش جواب نہیں ملا اور قرض خواہوں کے خوف سے دہلی واپس جانے کی ہمت نہیں ہوئی تو وہ (کلکتے جانے کے ارادے سے) وہیں سے کان پور کی جانب روانہ ہو گئے[۱۰]۔ اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ ترمذی صاحب کے نزدیک بھی غالب صرف ایک بار فیروز پور گئے تھے۔ توقیت میں انہوں نے اس سفر کو ۱۸۲۵ء کے وسط کا واقعہ قرار دیا ہے[۱۱]۔

راقم السطور نے بھی اپنے مضمون ''غالبؔ کا سفرِ کلکتہ'' میں اس مسئلے سے بحث کی ہے اور مختلف شواہد کی روشنی میں پروفیسر محمود الٰہی کی طرح یہ موقف اختیار کیا ہے کہ غالب سفرِ کلکتہ کے لیے روانگی سے قبل ایک بار فیروز پور کا سفر کر چکے تھے لیکن مولانا فضل حق کے نام کے خط کے متعلق ''خاتمہ گلِ رعنا'' کی صراحت کے مقابلے میں مکتوب موسومہ مولوی محمد علی خاں کے اندراج کو ''زیادہ قرینِ صحت'' مانتے ہوئے یہ رائے قائم کی ہے کہ یہ خط سفرِ کلکتہ کے آغاز سے عین پہلے یعنی دوسرے سفر فیروز پور کے دوران لکھا گیا تھا[۱۲]۔

جناب کالی داس گپتا رضا نے اگرچہ اپنے کسی مضمون میں اس سفر کو موضوع بحث نہیں بنایا ہے تاہم اپنی دو تحریروں ''سفرِ کلکتہ کی توقیت'' اور ''توقیتِ غالب'' میں علیحدہ علیحدہ تاریخوں کے تحت فیروز پور کے دو سفروں کا ذکر کیا ہے۔ پہلے

سفر کا زمانہ انہوں نے تقریباً جون ۱۸۲۵ء اور دوسرے سفر کے آغاز کی تاریخ ۲۸ر نومبر ۱۸۲۵ء متعین کی ہے[۲۱]۔

غالب کے سفروں سے متعلق یہ تمام تفصیل جس میں ہمارے اصل موضوع گفتگو یعنی مکتوب بہ نام مولانا فضل حق کا ذکر بہت کم آیا ہے، اس لحاظ سے ناگزیر تھی کہ جب تک یہ طے نہ ہو جائے کہ غالب صرف ایک بار یعنی سفرِ کلکتہ کے آغاز میں فیروز پور گئے تھے یا اس سے پہلے بھی کم از کم ایک بار وہاں جا چکے تھے، اس بحث کے لیے کوئی جواز پیدا نہ ہوگا کہ یہ خط کس زمانے میں لکھا گیا ہے، کیوں کہ جو حضرات صرف ایک سفر کے قائل ہیں، ان کے حساب سے اس خط کو لازماً سقوطِ بھرت پور ۱۸ر دسمبر ۱۸۲۵ء کے بعد کے قریبی زمانے کی تحریر ہونا چاہیے۔ غالب انہی ایام میں بھرت پور سے فیروز پور پہنچے تھے۔

جیسا کہ گذشتہ سطور میں عرض کیا جا چکا ہے، راقم السطور نے اپنے مضمون ''غالب کا سفرِ کلکتہ'' میں ان کے دو بار سفرِ فیروز پور کا حوالہ دینے کے بعد ''مبادیِ بسیچ سفرِ مشرق'' کی رعایت سے اس خط کو دوسرے سفر سے متعلق قرار دیا ہے۔ اس دعوے کی پہلی شق پروفیسر محمود الٰہی کی رائے کے عین مطابق ہے جب کہ دوسری شق پروفیسر ابو محمد سحر کے موقف کی تائید کرتی ہے۔ ۱۹۸۰ء میں جب یہ مضمون لکھا گیا تھا، اتفاق سے ان دونوں فاضلِ محققین کے مضامین پیشِ نظر نہ تھے۔ حال ہی میں ایک دوسرے کام کے سلسلے میں سحر صاحب کے مجموعۂ مضامین ''غالبیات اور ہم'' کو بالاستیعاب پڑھنے کا موقع ملا تو ان کے اس مضمون کے محتویات کا علم ہوا اور اس کے حوالے سے بعد میں پروفیسر محمود الٰہی صاحب کے مضمون تک رسائی حاصل ہوئی۔ ان مضامین کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ پروفیسر محمود الٰہی نے اس موضوع کے مختلف پہلوؤں کا انتہائی اختصار کے باوجود جس خوبی کے ساتھ احاطہ کیا ہے اور ہر پہلو پر جتنی پر مغز

اور نتیجہ خیز گفتگو کی ہے، اس کے اعتبار سے ان کی یہ تحریر اس سلسلے کی تمام تحریروں میں بالکل منفرد اور ممتاز ہے لیکن ایک نقص اس مضمون میں بھی موجود ہے کہ واقعات کی ترتیب منطقی طور پر پوری طرح درست ہونے کے باوجود فاضل محقق کے بیشتر بیانات تاریخ اور سنہ کے حوالوں سے عاری ہیں۔ اس کا سبب بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جن تاریخی مآخذ کی مدد سے یہ سقم دور کیا جا سکتا تھا، وہ ان کے علم یا دسترس میں نہ تھے۔ فی الوقت اسی سلسلے میں کچھ عرض کرنا مقصود ہے۔

عرضداشت موسومہ گورنر جنرل کے مطابق خواجہ حاجی کی وفات کے بعد مرزا غالب نواب احمد بخش خاں سے یہ درخواست کرنے کی غرض سے فیروز پور گئے تھے کہ اب انہیں اپنے وعدے کے مطابق خواجہ حاجی کو ملنے والی پنشن کی رقم ان کے اور ان کے بھائی کے نام منتقل کر دینا چاہیے۔ اسی زمانے میں خواجہ صاحب جن ذہنی و جسمانی کیفیات سے دوچار تھے، غالب کے الفاظ میں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

> ''اس سے تھوڑے دن پہلے نواب صاحب کو بہت زخم آئے تھے اور ان کے باعث وہ بہت بیمار تھے۔ انہی ایام میں وہ بسترِ علالت سے اٹھے تھے۔ مزید برآں ان کی الور کی مختاری بھی جاتی رہی تھی جس سے وہ بہت افسردہ اور غمگین تھے وہ میرے سامنے رونے بلکہ ہچکیاں لینے لگے (اور) فرمایا: تم میرے بچے اور نور نظر ہو۔ دیکھو مجھے کیسے زخم آئے ہیں اور کیسی مصیبت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ میرا حق مارا گیا ہے۔ سب سے بڑھ کر افسوس ناک امر یہ ہے کہ جرنیل اختر لونی کی اور میری دوستی ختم ہو گئی''۔[۱۲]

یہ سلسلۂ واقعات مکتوب موسومہ مولانا فضلِ حق کے اس بیان سے پوری طرح مربوط ہے کہ:

"عمِ کامگار دروہم وہراسِ مکر وحسدِ اعدا و دردِ عدم محاصلِ سرکار الور وملال درآمد دگر ہا سرگرم وسوگوار وگم کردہ آرام۔ اور امہر کو کہ کس رادل دہد وہمم در اصلاحِ حالِ کس گمارد"[۳۵]۔

ان دونوں بیانات کے یکجائی مطالعے سے تین اہم کلیدی نکتے سامنے آتے ہیں:

(۱) غالب کے فیروز پور پہنچنے سے پہلے نواب احمد بخش خاں پر قاتلانہ حملہ ہو چکا تھا۔

(۲) وہ دشمن جن کی سازش کے نتیجے میں نواب صاحب پر حملہ ہوا تھا، اب بھی ان کے خلاف سرگرم تھے۔

(۳) جنرل اختر لونی سے ان کے تعلقات خراب ہو چکے تھے۔

ان واقعات کا پس منظر یہ ہے کہ نواب احمد بخش خاں اور راؤ راجا بختاور سنگھ، والی الور کے درمیان بڑے دوستانہ ومخلصانہ روابط تھے۔ انگریزی حکومت میں نواب صاحب کے غیر معمولی اثر ورسوخ کی بنا پر مہاراجا نے مسند نشینی کے کچھ دنوں بعد ہی انہیں ریاست کا وکیل مقرر کر دیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے انگریز حکام سے ریاست کے تعلقات کی استواری میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ علاوہ بریں ان دونوں کے درمیان قربت و رفاقت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مہاراجا کی داشتہ موسی اور نواب صاحب کی مدخولہ مدی دونوں سگی بہنیں تھیں۔ یہ دونوں ہی صاحبِ اولاد تھیں اور مہاراجا اور نواب صاحب دونوں خاندانی روایات کے برخلاف ان کے بیٹوں کو اپنا جانشین بنانا

چاہتے تھے۔ اس خواہش کی تکمیل میں نواب صاحب مہاراجا سے زیادہ سرگرم اور پیش پیش تھے۔ چنانچہ ۱۵ر صفر ۱۲۳۰ھ مطابق ۱۷ر جنوری ۱۸۱۵ء کو جب راجا بختاور سنگھ کا انتقال ہوگیا اور خاندان کے بااثر لوگوں نے موسی کے بیٹے بلونت سنگھ کی بجائے ان کے بھتیجے بنے سنگھ کو جانشین بنانا چاہا تو نواب صاحب کی حکمتِ عملی کے نتیجے میں اس نزاع کے فیصلے کی صورت یہ قرار پائی کہ بنے سنگھ اور بلونت سنگھ دونوں ایک ساتھ مسند نشین ہوں اور حکومت میں مساوی طور پر شریک رہیں۔ اس زمانے میں یہ دونوں لڑکے نابالغ تھے۔ مسند نشینی کی اس رسم کے کچھ دنوں بعد نواب صاحب نے ریاست کے دو پرگنوں تجارہ اور ٹپوکڑا کا ٹھیکا حاصل کرلیا۔ ۱۲ر ربیع الاول ۱۲۳۲ھ مطابق ۳۰ر جنوری ۱۸۱۷ء کو وہاں ان کا باقاعدہ عمل دخل قائم ہوگیا۔ بنے سنگھ کے حامی اس صورت حال سے نہ صرف یہ کہ ناخوش تھے بلکہ بلونت سنگھ اور ان کے سرپرستوں کے خلاف مسلسل ریشہ دوانیوں میں مصروف تھے۔ تا آں کہ جب بلونت سنگھ اور بنے سنگھ دونوں سن بلوغ کو پہنچے تو ان مخالفین نے چھے ہزار روپے نقد اور ایک گانو بہ طور انعام دینے کا وعدہ کر کے ایک میو کو اس پر آمادہ کرلیا کہ وہ نواب صاحب کا کام تمام کردے۔ مسلسل آٹھ ماہ تک گھات میں رہنے کے بعد اس نے ۲۰ر شعبان ۱۲۳۸ھ مطابق ۲ر مئی ۱۸۲۳ء کی شب میں جب کہ نواب صاحب دہلی میں اپنی قیام گاہ میں آسودۂ خواب تھے، ان پر حملہ کردیا لیکن پہلے دو وار کارگر ثابت نہ ہوئے اور تیسرے وار میں تلوار ٹوٹ گئی، اس لیے قاتل اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکا۔ جب اس سازش کا راز کھلا تو بلونت سنگھ نے قاتل اور اس قتل کا منصوبہ بنانے والوں کو گرفتار کر کے قید کردیا لیکن اس گروہ کا سرغنہ راموں خواص کسی طرح بچ نکلا اور چھپتا چھپاتا دہلی پہنچ گیا۔ وہاں اس نے پہلے نواب صاحب سے مل کر معافی تلافی کی کوشش کی اور جب اس میں کامیاب نہ ہوا تو جنرل اختر لونی کے سررشتہ دار منشی کرم احمد کو کئی لاکھ

روپے بہ طورِ رشوت دینے کا وعدہ کر کے اپنا ہمنوا اور معاون بنالیا۔ اس طرح جنرل صاحب جو نواب صاحب کے دوست تھے اور ہر معاملے میں ان کے معین و مددگار رہتے تھے، ان کے مخالف ہو گئے۔ جنرل صاحب کی حمایت و سرپرستی حاصل ہو جانے کے بعد راموں کے اشارے پر بے سنگھ کے حامی راجپوتوں نے ۹ ر ذی الحجہ ۱۲۳۸ھ مطابق ۱۷ راگست ۱۸۲۳ء کو رات کے وقت بلونت سنگھ کے محل پر حملہ کر دیا۔ اس یورش میں ان کے دس محافظوں نے اپنی جان گنوائی اور باقی ہتھیار ڈال کر ان کی حمایت سے دستکش ہو گئے۔ بلونت سنگھ کو گزند پہنچانا اس سازش کے مقاصد میں شامل نہ تھا، اس لیے وہ محفوظ رہے اور ایک حویلی میں نظر بند کر دیے گئے۔ اس کے بعد بے سنگھ بلا شرکتِ غیرے پوری ریاست الور پر قابض و متصرف ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی نواب صاحب کی مختاری بھی جاتی رہی اور تجارہ اور ٹپوکڑا کی مستاجری کا بھی خاتمہ ہو گیا اور وہ سارے اختیارات سے محروم ہو کر فیروز پور چلے آئے۔ ۲۰ رمحرم ۱۲۳۹ھ مطابق ۲۶ ر ستمبر ۱۸۲۳ء کو راموں خواص کے نمائندے بھوانی سنگھ نے باقاعدہ طور پر ان دونوں پرگنوں کی عاملی کے اختیارات سنبھال لیے[۲۱]

ان تفصیلات کا ماحصل یہ ہے کہ نواب احمد بخش خاں ۲ ر مئی ۱۸۲۲ء کو بہ مقام دہلی ایک قاتلانہ حملے میں مجروح ہوئے۔ یہی حادثہ جنرل اختر لونی سے ان کے تعلقات کی کشیدگی کا سبب بنا۔ کچھ دنوں میں زخموں کے مندمل ہو جانے کے بعد وہ دہلی سے دوبارہ الور یا تجارہ چلے گئے۔ ۱۷ راگست ۱۸۲۳ء کو بلونت سنگھ کی نظر بندی کے ساتھ ریاست سے ان کے تمام سیاسی و اقتصادی روابط منقطع ہو گئے اور ۲۶ ر ستمبر ۱۸۲۳ء سے کچھ پہلے وہ وہاں سے ترکِ تعلق کر کے فیروز پور چلے آئے۔ ان حالات کی روشنی میں اب یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ غالب ۱۸۲۳ء کی آخری تماہی میں کسی وقت فیروز پور پہنچے ہوں گے اور اسی زمانے میں

انہوں نے مولوی فضل حق کے نام وہ خط لکھا ہوگا جس کا زمانۂ تحریر اب تک غلط قیاسات کی بنیاد پر متعین کیا جاتا رہا ہے۔ اس دریافت کے بعد ''خاتمۂ گلِ رعنا'' کے اس بیان کی صداقت میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ اس سفر فیروز پور میں ''روزگارے دراز'' گزر جانے کے بعد ہی غالب اپنی زندگی کے اس اہم ترین اور طویل ترین سفر پر روانہ ہوئے تھے، جس کی پہلی منزل بھرت پور اور آخری منزل کلکتہ تھی۔ ہمارے اندازے کے مطابق ان دونوں سفروں کے درمیان کم از کم دو سال کا فرق تھا۔ اس کے ساتھ ہی مولوی محمد علی خاں کے نام کے خط میں ان کا یہ بیان بھی کہ زیرِ بحث خط انہوں نے ''در مبادیٔ بسیچ سفرِ مشرق'' لکھا تھا، خلافِ واقعہ نہیں۔ عرضداشت موسومہ گورنر جنرل کے مطابق فیروز پور پہنچنے کے بعد غالب اور نواب صاحب کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی، اس میں یہ مکالمہ بھی موجود ہے کہ:

> ''آپ کو اپنا وعدہ پورا کرنا چاہیے اور جائز وارثوں کو ان کا حق دینا چاہیے یا پھر مجھے اجازت دیجیے کہ میں جا کر اپنا مطالبہ حکومتِ عالیہ کے سامنے پیش کروں''۔[۱۲]

اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ دہلی سے یہ ارادہ کر کے نکلے تھے کہ اگر فیروز پور میں ان کی بات نہ سنی گئی تو وہ کلکتے جا کر اپنا مطالبہ براہِ راست حکومتِ عالیہ کے سامنے پیش کریں گے۔

شرحِ صدر کے لیے یہاں الور کے واقعات کے سلسلے میں تھوڑی سی مزید تفصیل ضروری معلوم ہوتی ہے۔ ۱۷ راگست ۱۸۲۷ء کے فساد اور بلونت سنگھ کی نظربندی کے بعد نواب احمد بخش خاں اور جنرل اخترلونی دونوں نے اپنے اپنے طور پر تمام واقعات کی رپورٹ صدر کو بھیج دی تھی۔ اس پر جنرل صاحب کے نام یہ حکم صادر ہوا کہ ''بہ استرضائے نواب احمد بخش خاں کاربندی رہے اور (فریقین سے) راضی

نامہ لیا جاوے"[18]۔ اس فیصلے کے بعد جنرل اختر لونی کے لیے راموں خواص کی حمایت سے کنارہ کشی اور نواب صاحب کے ساتھ اتحاد و تعاون کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہا چنانچہ وہ راموں پر یہ الزام رکھ کر کہ اس نے ان سے صلاح و مشورہ کے بغیر فسادیوں کو رہا کر کے عہد شکنی کی ہے، اس کی سرپرستی سے دست بردار ہو گئے[19]۔ اندازہ یہ ہے کہ نواب صاحب اور جنرل اختر لونی کی رپورٹیں کلکتے پہنچنے اور وہاں سے ان پر احکام صادر ہونے میں دو تین ماہ سے زیادہ کا عرصہ نہ لگا ہوگا۔ ان رپورٹوں کے جواب میں وہاں سے جو حکم جاری ہوا تھا، وہ نواب صاحب کے لیے فتح و کامرانی کی نوید اور جنرل اختر لونی سے تعلقات کی بہتری کی بشارت لے کر آیا تھا۔ یہ صورتِ حال اس کیفیت سے بڑی حد تک مختلف تھی جس کا مولانا فضلِ حق کے نام کے خط اور عرضداشت موسومہ گورنر جنرل پیش کردہ اقتباسات میں تذکرہ ہے۔ اس سے بھی ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ مولانا فضلِ حق کے نام یہ خط ستمبر ۱۸۲۳ء میں نواب صاحب کے الور سے قطعِ تعلق اور فیروز پور میں ورود کے کچھ دنوں بعد ہی لکھا گیا ہوگا۔

غالب کے پہلے سفر فیروز پور سے متعلق تاریخی شواہد پر مبنی اس تازہ معلومات کی روشنی میں ماہرینِ غالبیات کے کم از کم دو بیانوں کی تصحیح ضروری معلوم ہوتی ہے۔ پہلے بیان کے مطابق غالب اور نواب احمد بخش خاں کے درمیان پنشن کے معاملے میں نزاع کی باقاعدہ ابتدا نواب الٰہی بخش خاں معروف کی وفات (۱۲۴۲ھ / ۱۸۲۶ء) اور نواب شمس الدین احمد خاں کے حق میں نواب احمد بخش خاں کی حکومت سے دست برداری (۱۳/ اکتوبر ۱۸۲۶ء) کے بعد ہوئی تھی[20]۔ یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ مرزا غالب ۱۸۲۳ء کی آخری تماہی میں فیروز پور پہنچ کر اپنا مقدمہ نواب صاحب کی خدمت میں پیش کر چکے تھے، یہ اظہار بے معنی ہو جاتا ہے۔

دوسرا بیان خواجہ حاجی کے سالِ وفات سے متعلق ہے۔ تمام محققین غالب جنہوں نے اس واقعے کا ذکر کیا ہے، اس پر متفق ہیں کہ وہ ۱۸۲۵ء میں فوت ہوئے۔ اس کی بنیاد عرضداشت موسومہ گورنر جنرل کا یہ اندراج ہے کہ "نصر اللہ بیگ خاں کے متعلقین میں ایک شخص خواجہ حاجی نام تھا، تین برس ہوئے اس کا جذام کے مرض سے انتقال ہو گیا"[۵]۔ چوں کہ یہ عرضداشت ۲۸ر اپریل ۱۸۲۸ء کو لکھی گئی تھی، اس لیے بہ ظاہر یہ قیاس کچھ غلط نہیں معلوم ہوتا کہ خواجہ حاجی اس سے تین برس پہلے ۱۸۲۵ء میں فوت ہوئے ہوں گے لیکن اسی عرضداشت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مرزا غالب خواجہ حاجی کے انتقال کے بعد ان کے حصے کی رقم حسب وعدہ نصر اللہ بیگ خاں کے جائز ورثاء کے نام منتقل نہ کیے جانے کی شکایت لے کر نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، اس لیے یہ معاملہ اتنا آسان نہیں رہ جاتا۔ چوں کہ غالب تفاوتِ زمانی کے بیان میں بہ قدرِ ضرورت احتیاط اور ذمہ داری سے کام لینے کے عادی نہیں۔ اس لیے ان کے ان دونوں بیانات میں سے یہ بیان کہ وہ خواجہ حاجی کی وفات کے بعد دہلی سے فیروز پور گئے تھے، قابلِ ترجیح معلوم ہوتا ہے۔ اس صورت میں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ خواجہ حاجی ۱۸۲۳ء کے اوائل میں یا اس سے کچھ پہلے وفات پا چکے تھے۔

حواشی:

۱۔ گلِ رعنا، مرتبہ مالک رام، شائع کردہ علمی مجلس دلی، مئی ۱۹۷۰ء، ص ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۱

۲۔ نامہ ہائے فارسی غالب، مرتبہ سید اکبر علی ترمذی، شائع کردہ غالب اکیڈمی، نئی دہلی، ۱۹۶۹ء، ص ۱۰

۳۔ غالب نامہ، از شیخ محمد اکرام، مطبوعہ بمبئی، ص ۶۶ تا ۶۸

۴۔ ذکرِ غالب، از مالک رام، شائع کردہ مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۷۵ء، ص ۵۵

۵۔ ذکرِ غالب، کچھ نئے حالات، مضمون مشمولہ ماہنامہ "افکار" کراچی، غالب نمبر، ۱۹۶۹ء، حاشیہ ص ۷۱۔ بہ حوالہ "غالبیات اور ہم"، از ابو محمد سحر، ص ۶۵

٦۔ غالب کا سفر کلکتہ۔ ایک غلط فہمی کا ازالہ، سہ ماہی "اردو" کراچی، شمارہ خصوصی بہ یاد غالب، حصہ دوم، ۱۹۶۹ء، ص ۸۴

۷۔ فسانۂ غالب، از مالک رام، شائع کردہ مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۷۷ء، ص ۱۴

۸۔ غالبیات اور ہم، از پروفیسر ابو محمد سحر، شائع کردہ تخلیق کار پبلشرز، نئی دہلی، ۱۹۹۴ء، ص ۶۵، ۶۶

۹۔ ایضاً، ص ۶۷

۱۰۔ نامہ ہائے فارسی غالب، مقدمۂ انگریزی، ص ۱۹، ۲۰

۱۱۔ ایضاً، مقدمہ ص ۵۵

۱۲۔ غالب: احوال و آثار، از حنیف نقوی، شائع کردہ نصرت پبلشرز، لکھنؤ، ۱۹۹۰ء، ص ۸۳

۱۳۔ غالب، درونِ خانہ، از کالی داس گپتا رضا، شائع کردہ ساکار پبلشرز، بمبئی، ۱۹۸۹ء، ص ۸۶، ۸۷، ۷۸

۱۴۔ فسانۂ غالب، ص ۱۱۰

۱۵۔ نامہ ہائے فارسی غالب، ص ۱۱

۱۶۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ارژنگ تجارہ، از محمد مخدوم تھانوی، مطبوعہ ۱۲۹۰ھ، ص ۷۰ تا ۷۵

۱۷۔ فسانۂ غالب، ص ۱۱۰

۱۸۔ ارژنگ تجارہ، ص ۷۵

۱۹۔ ایضاً، ص ۷۶

۲۰۔ غالب نامہ، ص ۶۵، ۶۶ و ذکر غالب، ص ۵۱، ۵۲

۲۱۔ فسانۂ غالب، ص ۱۱۳

غالبؔ کے خطوط

مرتبہ: ڈاکٹر خلیق انجم

جدید اردو نثر کا گنجِ گراں مایہ، اردو ادب کا سدابہار سرمایہ، عہدِ غالبؔ کی ادبی تہذیبی اور تاریخی دستاویز، ذہین غالبؔ کا بے مثال عکس ریز جس میں عود ''ہندی'' اردوئے معلی، خطوطِ غالب، مکاتیب غالب اور نادرات غالب کے علاوہ مرزا غالب کے اب تک دریافت شدہ ۸۷۰ خطوط شامل ہیں جو اس عہد آفریں عظیم شاعر کی شاعری کا مکمل اشاریہ قرار دیے جا سکتے ہیں۔

جدید اصول تدوین کی روشنی میں خطوط غالب کے صحیح متن کے ماخذات کی نشان دہی، اختلاف نسخ، زمانۂ تحریر کا تعین، ضروری اور مفید حواشی کے ساتھ، غالب انسٹی ٹیوٹ کی فخریہ پیشکش ۲۲۰ صفحات پر مشتمل مبسوط مقدمہ۔

اردو کے معروف و ممتاز محقق ڈاکٹر خلیق انجم کے مرتبہ اس مکمل مجموعے کو چار جلدوں میں شائع کیا گیا ہے۔

چار جلدوں کی قیمت: ۴۳۵ روپے

غالب کے مُہر ساز : بدرالدّین علی خان

[خطوطِ غالب کی روشنی میں]

مرزا غالب کی جن چھ (۶) مہروں کا ہمیں علم ہے، وہ یہ ہیں:

(۱) اسد اللہ خان عرف میرزا نوشہ ۱۲۳۱ھ (۲) محمد اسد اللہ خان ۱۲۳۸ھ

(۳) نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ ۱۲۶۷ھ (۴) غالب ۱۲۷۸ھ

(۵) اسد اللہ الغالب ۱۲۳۱ھ

(۶) اسد اللہ غالب

اور ان میں آخری مہر کو چھوڑ کر کم از کم چار مہریں یقیناً بدرالدین مہر کن کی بنائی ہوئی تھیں۔ ان کے بارے میں عرصہ ہوا جناب مالک رام کا ایک مضمون غالباً ادبی دنیا [لاہور] میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بارے میں پروفیسر مختار الدین احمد نے بھی ایک مضمون "غالب کی ایک نئی مہر" لکھا تھا [آج کل فروری ۱۹۵۲ء]، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ مہر مرزا غالب کی نہیں اُن

کے ہم نام کسی دوسرے اسد اللہ غالب کی مہر تھی۔

غالب کے متعدد خطوط میں بدر الدین کا حوالہ ملتا ہے۔ نواب انور الدولہ سعد الدین خاں بہادر شفق کو لکھتے ہیں:

''خلاصہ عرض کا یہ ہے کہ

آج شہر میں بدر الدّین علی خاں کا نظیر نہیں، پس مہر اور کون کھود سکے گا؟ ناچار میں نے آپ کا نوازش نامہ، جو میرے نام تھا، وہ اُن کے پاس بھیج دیا، اُنھوں نے رقعہ میرے نام آج بھیجا، سو وہ رقعہ حضرت کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ میں نہیں سمجھا کہ قسم دوم پکھراج کی کیا ہے؟ آپ اس کو سمجھ لیں اور نگین بہ احتیاط ارسال فرمادیں۔ روپے کے بھیجنے کی ابھی ضرورت نہیں ہے، جب میں عرض کروں گا تب بھیجیے گا۔

[یکشنبہ ۲۹۔ جون ۱۸۵۶ء] (خطوط غالب ۳/۹۸۴]

منشی شیونراین آرام کو لکھتے ہیں:

''سیّد حفیظ الدین احمد کی مہر کے کھودے جانے کو تم نے لکھا تھا ملتوی رہے۔ پھر اس کا بھی کچھ بیورا نہ لکھا۔ میں اس کو ابھی کچھ نہیں سمجھا، اس کو یکسو کرو، ہاں ناں لکھ بھیجو۔ تمھاری مہر بدر الدین علی خان کو دی گئی ہے، یقین تو یہ ہے کہ اس دسمبر مہینے میں تمھارے پاس پہنچ جائے، اور ۱۸۵۸ء میں کھدے۔ شاید کچھ دیر ہو تو

جنوری ۱۸۵۹ء میں کھدے، اِس سے زیادہ درنگ نہ
ہوگی۔ تم کو روپیہ حرف ہے، آٹھ آنے حرف ہے، کیا
علاقہ؟ تم کو اپنی مہر سے کام۔

[۱۵۔دسمبر ۱۸۵۸ء] (خطوط ۳/ ۱۰۶۵۔۱۰۶۶)

ایک اور خط میں منشی شیونراین آرام کو لکھا ہے:

مہر تمھاری کھدنی شروع ہوگئی ہے، اِس اگست
کے مہینے میں تمھارے پاس پہنچ جائے گی۔

[چارشنبہ، ۱۷۔اگست ۱۸۵۹ء] (خطوط ۳/ ۱۰۷۶۔۱۰۷۷)

ایک خط میں مولوی عزیزالدین کو لکھتے ہیں:

"میں نے آپ کی مہر کردی۔ حکیم احسن اللہ خاں اور
میاں غلام نجف اور بہادر بیگ اور نبی بخش خاں ساکن
دریبہ، ان کی مہریں ہوگئی ہیں، محضر آپ کے پاس بھیجتا
ہوں۔"

[نوشتہ ۱۸۵۸ء] (اردوے معلّیٰ طبع ۱۸۹۹ء صفحہ ۱۶۴)

نواب انورالدولہ سعدالدین خاں شفق کے نام دو خطوں میں بدرالدین علی
خاں کا حوالہ ملتا ہے:

۱۱۔اگست ۱۸۶۲ء کے خط میں انورالدولہ شفق کو لکھا ہے: ایک حکایت
سنو، امجد علی شاہ کی سلطنت کے آغاز میں ایک صاحب میرے نیم آشنا، یعنی خدا
جانے کہاں کے رہنے والے، کسی زمانے میں وارِدِ اکبرآباد ہوئے تھے۔ کبھی کہیں کے
تحصیلدار بھی ہوگئے تھے۔ زبان آور اور چالاک۔ اکبرآباد مین نوکری کی جستجو کی، کہیں
کچھ نہ ہوا۔ میرے ہاں دو ایک بار آئے تھے، پھر وہ خدا جانے کہاں گئے۔ میں دلی

آ رہا، کم وبیش بیس برس ہوئے ہوں گے۔ امجد علی شاہ کے عہد میں اُن کا خط ناگاہ مجھ کو بہ سبیل ڈاک آیا۔ چونکہ اُن دنوں میں دماغ درست اور حافظہ برقرار تھا، میں نے جانا کہ یہ وہی بزرگ ہیں۔ خط میں مجھ کو پہلے یہ مصرعہ لکھا: ''از بخت شکر دارم و از روزگار ہم'' آپ سے جدا ہو کر بیس برس آوارہ پھرا۔ جے پور میں نوکر ہو گیا، وہاں سے دو برس کے بعد کہاں گیا اور کیا کیا۔ اب لکھنؤ آیا ہوں، وزیر سے ملا ہوں، بہت عنایت کرتے ہیں۔ بادشاہ کی ملازمت اُنھی کے ذریعے سے حاصل ہوئی ہے۔ بادشاہ نے خانی اور بہادری کا خطاب دیا ہے، مصاحبوں میں نام لکھا ہے، مشاہرہ ابھی قرار نہیں پایا۔ وزیر کو میں نے آپ کا بہت مشتاق کیا ہے۔ اگر آپ کوئی قصیدہ حضور کی مدح میں اور عرضی یا خط، جو مناسب جانیے، وزیر کے نام لکھ کر میرے پاس بھیج دیجیے گا، تو بے شک بادشاہ آپ کو بلائیں گے، اور وزیر کا خط مشعر فرمان طلب آپ کو پہنچے گا۔ میں نے اُسی عرصے میں ایک قصیدہ لکھا تھا جس کی بیتِ اسم یہ ہے:

امجد علی شہ آن کہ بہ ذوق دعاے اُو
صد رہ نمازِ صبح قضا کرد روزگار

متردّد تھا کہ کس کی معرفت بھیجوں۔ توکلت علی اللہ بھیج دیا۔ رسید آ گئی صرف۔ پھر دو ہفتے کے بعد ایک خط آیا کہ قصیدہ وزیر تک پہنچا، وزیر پڑھ کر بہت خوش ہوا، بہ آئین شایستہ پیش کرنے کا وعدہ کیا۔ میں متوقع ہوں کہ میاں بدرالدین مہر کن سے میری مہر خطابی کھدوا کر بھیج دیجیے۔ چاندی کا نگینہ مربع اور قلم جلی۔ فقیر نے سرانجام کر کے بھیج دیا۔ رسید آئی اور قصیدے کے بادشاہ تک گذرنے کی نوید، بس۔ پھر دو مہینے تک اُدھر سے کوئی خط نہ آیا۔ میں نے جو خط بھیجا اُلٹا پھر آیا۔ ڈاک کا یہ توقیع کہ مکتوب الیہ یہاں نہیں۔ ایک مدت کے بعد حال معلوم ہوا کہ اُس بزرگ

کا وزیر تک پہنچنا، اور حاضر رہنا سچ، بادشاہ کی ملازمت، اور خطاب، ملنا، غلط۔ بہادری کی مہرتم سے بہ فریب حاصل کر کے مرشدآباد کو چلا گیا۔ چلتے وقت وزیر نے دو سو روپے دیے تھے۔

''[صبح دوشنبہ ۱۳۔ صفر ۱۲۷۹ھ/۱۱ ماہ اگست ۱۸۶۲ء] (خطوط ۳/ ۹۹۸۔۱۰۰۰)

اس شخص نے یہ سب ڈھونگ اپنا مطلب نکالنے کے لیے رچا تھا۔ دوسرے ۱۸۶۴ء کے خط میں لکھتے ہیں:

''مہر کا حال معلوم ہوا۔ پہلے آپ لکھ بھیجیے کہ کیا کھودا جائے گا؟ مہدی حسن خاں، مہدی حسین خاں بہادر لکھ رہا ہوں، صرف یاد پر لکھ رہا ہوں ورنہ خط لڑکوں نے کھودیا۔ یاد پڑتا ہے کہ نگینہ وہاں سے بھیجنے کو آپ نے لکھا ہے، سو اب میں مکرر خواہاں ہوں کہ یہ معلوم ہو جائے کہ نگینہ بھیجے گا یا یہاں خریدا جائے گا، اور نقش نگین کیا ہوگا؟ تا کہ شمار حروف کا مجھ کو معلوم رہے۔ اب (۳) جب آپ مجھ کو لکھیں گے تب میں اس کا جواب لکھوں گا۔''

[۳۔فروری ۱۸۶۴ء] (خطوط ۳/ ۱۰۰۲۔۱۰۰۳)

بدرالدین علی خان شاہی خوشنویس تھے۔ فن خطاطی میں نستعلیق اور نسخ دونوں کے ماہر تھے، اُنھوں نے خوشنویسی اس عہد کے مشہور خطاط سید امیر رضوی معروف بہ میر پنجہ کش سے سیکھی تھی، اس کے علاوہ اپنے نانا محمد یار خاں سے جو اپنے عہد کے ممتاز و منفرد حکاک تھے، یعنی نگینوں پر مہر سازی کرتے تھے، مہر کنی اور کرسی بندی کی تربیت حاصل کی تھی۔ اُنھیں بہادر شاہ ظفر کے دربار سے ''وحید العصر مرصع رقم'' خطاب ملا تھا۔ وہ ہندی اور انگریزی زبانوں سے بھی واقف تھے، اور اِن زبانوں میں بھی مہریں تیار کرتے تھے۔ وہ اپنے نانا شیخ محمد یار کے شاگرد تھے۔ اُنھوں نے آغا عبدالرشید دیلمی کی وصلیوں کا بڑا ذخیرہ جمع کر رکھا تھا

، اور دیلمی کے اسلوبِ خط کی تقلید کرتے تھے۔ سلطنتِ مغلیہ کے خاتمے کے بعد حکومتِ برطانیہ نے بھی اُن کے خطاب کو جاری رکھا۔ جو بھی وائسرائے ہندوستان میں آتا تھا اُس کی سرکاری مہر بدرالدین علی خاں ہی بناتے تھے۔ انھیں اس کے لیے خلعت اور نقد انعام گورنمنٹ سے ملتا تھا۔

میر پنجہ کش کے استاد غلام علی ہفت قلم نے اپنے تذکرۂ خوشنویسان میں لکھا ہے:

"در علمِ مہر کنی و حکاکی بے نظیر و بے عدیل، و در عقلِ معاش یگانہ، و مہر کنی در خط نستعلیق و نسخ و شاستری و انگریزی وغیرہ بآئین شایست بہ جلوۂ ظہور می آرد، آن قدر قوتِ دست و دقتِ طبع در ایجاد و تراکیب و اسلوب و کرسی بندی دارد کہ عقل ہم پیش کارِ این فن بدان نمی رسد بلکہ بدیدن حسن اختراع و ابداع و ایجاد و احداث دیدۂ حاسدان حیران می ماند، این ہم لطف خداداد است۔"

[تذکرۂ خوشنویسان طبع ایشیاٹک کلکتہ ۱۹۱۰ء]

[ترجمہ]: "مہریں کھودنے اور ہیرا تراشنے کے فن میں بے نظیر و بے مثل، اور عقلِ معاش میں یگانہ ہیں۔ خطِ نستعلیق، خطِ نسخ، سنسکرت اور انگریزی میں مہر کنی بہت ہی سلیقے سے کرتے ہیں۔ مرکب الفاظ کے بٹھانے میں، اُن کے اسلوب اور کرسی بندی میں ایسی ہاتھ کی قوت اور طبیعت کی نفاست کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ اس فن میں عقل اُس سے آگے نہیں سوچ سکتی بلکہ ان کی جدت، حسنِ اختراع اور نئے انداز کے دیکھنے سے حاسد بھی حیران رہ جاتے ہیں۔ یہ بھی الطاف الٰہی میں سے ہے۔"

بدرالدین علی خان کے بارے میں سر سید احمد خان نے آثار الصنادید [طبع ۱۸۴۷ء] میں لکھا تھا:

''بدرالدین علی خان مہر کن، خط نستعلیق لکھنے میں شاگرد ہیں سید امیر صاحب ممدوح کے، اور مہر کنی کے فن میں تمام ہندوستان میں اِس سر کردۂ اہل کمال کا نظیر نہیں۔ مہر حکام وقت کی، علی الخصوص نواب گورنر جنرل بہادر کی، اِسی یگانۂ روزگار کے ہاتھ سے کھدا کرتی ہے۔ جو دائرہ کہ اُن کے قلم سے نکلتا ہے، ہزار حرف اُن کی یگانگی پر اپنے دہن سے ادا کرتا ہے۔''

سر سید کا یہ بیان آثار الصنادید کے پہلے ایڈیشن میں ہے، جو ۱۸۴۷ء میں شائع ہوا تھا، اس کا مطلب یہ ہے کہ مغل سلطنت کے خاتمے سے پہلے بھی وہ گورنر جنرل اور دوسرے فرنگی حکام کی مہریں بنا کر کلکتے کو بھیجتے تھے۔

اُنھوں نے ۱۹۔ دسمبر ۱۸۴۵ء کو ایک زمرد پر گورنر جنرل کا نام کندہ کر کے بھیجا تھا۔ اس کے لیے اُنھیں برطانوی حکومت سے خلعت پنج پارچہ ملا تھا۔

مرزا غالب نے ۲۳۔ اکتوبر ۱۸۴۷ء کے ایک فارسی خط میں جواہر سنگھ جوہر کو لکھا ہے: ''۔۔۔ پس از پژوہش پدید آمد کہ قریب صد کس از ہوسناکان دہلی نگین فرستادہ در کشمیر کندادند و ہمہ شرمسار و پشیمان شدہ اند۔ حالیا آن سعادت نشان را باید کہ در دسر نکشند و مُہر دیگر بکندن ندہند۔ امروز درین فن نظیر بدرالدین بگیتی نیست، چون او بدنوشت پندارم کہ شومی سرنوشت من است۔''

[ترجمہ] ''تحقیق کے بعد ظاہر ہوا کہ دہلی کے تقریباً سو (۱۰۰) اہلِ ہوس نے کشمیر میں نگینے بھیج کر

کھدوائے اور سب پچھتائے، شرمندہ ہوئے۔ آپ کو
چاہیے کہ یہ دردِ سر مول نہ لیں اور دوسری مہر
کھدنے کے لیے [وہاں] نہ بھیجیں۔ آج اس فن میں
بدرالدین کی نظیر پوری دنیا میں نہیں ہے، اگر اُنھوں
نے ٹھیک نہ لکھا تو میں اسے اپنی بدقسمتی ہی کہہ سکتا
ہوں۔'' [باغ دو در مرتبہ وزیر الحسن عابدی۔ طبع
لاہور ۱۹۷۰ء]

آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کی شاہی مہریں بھی وہی کھودتے تھے۔
اُنھوں نے ملکہ وکٹوریہ اور اُن کے شوہر پرنس البرٹ کے نام کی مہریں بھی بنا کر بھیجی
تھیں جس کا حوالہ [۹۔ دسمبر ۱۸۵۰ء کے] اسعد الاخبار اور صادق الاخبار وغیرہ میں
ملتا ہے۔ ملکہ وکٹوریہ کی مہر پر یہ عبارت تھی:

'' شہنشاہ سلیمان جاہ، کیوان بارگاہ، خاقان الدہر،
سلطان البحر، موردِ الطافِ ایزدِ رحمان بادشاہ انگلستان
و ایرلنڈ، فرمانروائے ملک ہند، ناصر دین مسیحا، ملکۂ
معظمہ وکٹوریہ۔''

اور پرنس البرٹ کی مہر میں یہ عبارت تھی:
'' المؤید بتائید الہی، فخر کاندان شہنشاہ برنسوک، انیس معزز ملکہ معظمہ، رفیع القدر والا
شان، سرآمد بارگاہِ انگلستان البرٹ فرانس اگستس چارلس ایمان ول۔''

[بحوالہ محمد مشتاق تجاروی۔ غالب نامہ جنوری ۱۸۹۶ء]
جناب محمد مشتاق تجاروی نے اُن کو نسلاً پٹھان بتایا ہے، مگر اس کی کوئی
سند نہیں دی ہے۔ بدرالدین علی خان کا مکان دریبہ کے کوچہ بلاقی بیگم میں تھا۔

یہاں ایک بالا خانے پر وہ رہتے تھے [سنگی بیگ: سیر المنازل صفحہ ۳۰] اور وہیں سے مہریں بنانے کا کام کرتے تھے۔ وہاں اُن کی بنوائی ہوئی ایک مسجد بھی اب تک موجود ہے جو "سورج والی مسجد" کہلاتی ہے۔ اُس میں پہلے ایک منظوم کتبہ سنگِ باسی پر کندہ کیا ہوا تھا:

برائے حضرتِ سبحان و رحمان شد این مسجد بنا، صد شکر و احسان
تمامی مِلکِ خود، زرعی و سکنی نمودم وقف آن را، از دل و جان
ازان نصفی برائے وارثان است دگر بہرِ مساکین مستحقان
برین تقسیم اگر حجت کند کس ز حاکم منع کردندش مسلمان
الٰہی تا بہ حشر این را نگہدار زبیع و رہن و غصب و جملہ نقصان
بگو سال از سر للہ نقشی مساکین جائے بدر الدین علی خان

اس کتبے سے، جو ایک طرح سے وقف نامہ ہی ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسجد ۱۲۸۷ھ/۷۱-۱۸۷۰ء میں تعمیر ہوئی تھی۔ اور بدر الدین علی خاں نے اپنی کل جایداد زرعی اور سکنی وقف کر دی تھی، جس کا آدھا حصہ وارثوں کے لیے رکھا تھا، اور آدھا مساکین اور مستحق لوگوں کے لیے تھا۔ اُنھوں نے کہا تھا کہ اگر جایداد موقوفہ کی اس تقسیم پر کوئی اعتراض کرے، تو مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ حاکم سے کہہ کر اُس کو روک دیں۔ بدر الدین علی خان بہت بڑی جایداد کے مالک تھے، دریبہ کا ایک بڑا حصہ اُن کی ملکیت تھا۔ اس کے علاوہ چاندنی چوک کا کٹرہ اشرفی بھی اُن کا ہی تھا۔ مسجد فتح پوری کے دائیں بائیں جو عمارتیں ہیں، یعنی جہاں کارونیشن ہوٹل تھا اور اُس کے بالمقابل وہ جایداد جس میں اب باٹا کی دکان اور اُس کی اوپر کی منزل میں مرکنٹائل بنک ہے، یہ سب بدر الدین علی خان کی ملکیت رہ چکی ہیں۔ اس تمام جایداد کے محلِ وقوع کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں کہ

موجودہ زمانے میں اس کی قیمت کروڑوں میں آنکی جائے گی۔ مذکورۂ بالا کتبے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بدرالدین خان کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے، اُن کا تخلص نقشی تھا۔ اُن کا تذکرہ صرف قطب الدین باطن کے تذکرہ "گلستان سخن" میں ملتا ہے، اس میں اُن کے چار فارسی اشعار بطور نمونہ دیے گئے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جایداد کے لالچ میں کسی نے یہ کتبہ غائب کر دیا۔ جس کی رو سے یہ سب جایداد موقوفہ قرار پاتی ہے، اور مسجد کی مغربی دیوار کی پشت پر، جو سڑک سے بھی نظر آتی تھی، ایک سورج کا نقشہ بنا کر اُس کے ساتھ ایک گوشے میں یہ دو قطعے لکھ کر لگا دیے:

چون آفتاب روشن توحید ذوالجلال بنمود رخ ز مطلع این غرۂ کمال

اے عابدان دہر چو این سجدہ گاہِ نور بینید در رکوع درآیید، چون ہلال

بندہ مسکین بدرالدین علی خان از نیاز [کذا] کرد این تعمیر بہر خالق رب العلا

از سر برکات ہاتف سال تاریخش بگفت مہبط فیض الٰہی مسجدے نیکو بنا

پہلا کتبہ جو غائب ہو چکا ہے۔ اُس کے الفاظ اگر صحیح پڑھے گئے ہیں تو، اُس سے تاریخ ۱۲۸۷ھ/۷۱-۱۸۷۰ء برآمد ہوتی ہے اور اس مذکورۂ بالا قطعے سے ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۵-۱۸۳۴ء نکلتے ہیں۔ اگر مسجدے کو بغیر یائے توصیفی کے پڑھا جائے تو ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۵-۱۸۲۴ء ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان دو تاریخوں میں اتنا زمانی فاصلہ کیوں ہے؟ اس گتھی کو حل کرنا ابھی باقی ہے۔

غلام محمد ہفت قلم نے اپنے تذکرۂ خوشنویسان [سال تالیف ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء] میں بدرالدین خان کا ذکر کیا ہے، اور انھیں "جوانے خردمند و دانشمند سلیم الطبع" لکھا ہے اور یہ بتایا ہے کہ شروع میں یہ دہلی میں مہر کنی کی دکان کرتے تھے، اُس سے بہت تموّل حاصل کیا، اور بڑی جایداد پیدا کر لی تھی۔ مگر اُن میں عجب و غرور مطلق

نہ تھا۔ خوشنویسوں کے خطوں کے نمونے جمع کرنے میں بہت مال خرچ کرتے تھے۔ [احوال وآثار خوشنویسان، بخش اول ۱۳۶۵ھ/صفحہ ۹۷]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بدرالدین خان نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے وقت بھی قلعہ معلی سے تعلق باقی رکھا تھا۔ سقوط دہلی کے بعد وہ بھی گرفتار ہوئے اور مرزا غالب کے ساتھ ہی کرنل برن کے سامنے پیش ہوئے تھے۔ اُنھوں نے گورنر جنرل وغیرہ کے فرمان اور سندیں دکھائیں تو چھوٹ گئے تھے، مگر اُن کی خانہ تلاشی میں وصلیوں کا بیش بہا ذخیرہ بھی ضبط کرلیا گیا تھا جسے بعد میں لال قلعے کے میوزیم میں رکھا گیا پھر کچھ حصہ واپس بھی ہوا اور بعد میں ضائع ہوگیا۔ اس میں بڑی نادر چیزیں رہی ہوں گی۔ یقین ہے کہ مرزا غالب کے بعض خطوط و رقعات بھی ہوں گے بلکہ ہندوستان کی بیشتر اہم شخصیات کی ہزاروں مہریں اُنھوں نے بنائی تھیں اُن سب کی تحریریں رہی ہوں گی۔ ۷۔ اگست ۱۸۵۷ء کو بہادر شاہ ظفر نے اُنھیں لکھا کہ بہترین مہر تیار کرکے ہمارے حضور میں پیش کریں اور اُس میں مابدولت کے خادم ''مشیر سلطنت وقار الملک محمد بخت خان لارڈ گورنر بہادر'' کا نام مع جملہ القاب درج کیا جائے اس میں سال جلوس سنہ ۲۱ لکھا جائے گا۔ عبداللطیف کے روزنامچے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱/ ذی الحجہ ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۳۔ اگست ۱۸۵۷ء کو راجا ناہر سنگھ والی بلبھ گڑھ کی جانب سے مولوی احمد علی نے بہادر شاہ ظفر کو نذر پیش کی تھی اور اُس وقت بدرالدین خاں نے ایک نگینہ نذر کیا تھا جس پر نصرٌ مِنَ اللہِ و فتحٌ قریبٌ کندہ کیا ہوا تھا۔ [بحوالہ محمد مشتاق تجاروی: غالب نامہ ۹۶/۱] ذکاء اللہ دہلوی کا بیان ہے کہ ۱۸۵۷ء کی داروگیر سے چھوٹنے کے بعد بدرالدین کان نے تقریباً ۲۰ سال اپنے گھر میں گوشہ نشینی میں بسر کیے۔

مطلعُ العلُوم و الفُنون کے نام سے ایک ضخیم مخطوطہ مغل آرٹ

گیلری کے مالک جناب فیروز آرٹسٹ کی مہربانی سے ہمیں دیکھنے کو ملا، اُس کی چھبیسویں فصل "مہر کنی" کے موضوع پر ہے، اُس میں مہر کنی کے فن کے علاوہ بدر الدین خاں کا بھی قدرے تفصیل سے تعارف کرایا گیا ہے:

"مہر کنی فنِ شریف است، و مہر کن راضرور و ناگزیر است کہ از اُصول وقواعدِ انواع و اقسام خطوط، مثلِ خطِ نسخ، وثلث، ونستعلیق وطغرا، واقف باشد، کہ بغیر واقفیت ازینہا درفنِ خود کامل نیست بلکہ ناقص است، و اگر از غیر این خطوطِ مذکورہ مثلِ خطِ سنسکرت و انگریزی و فرانسیسی وغیر آن نیز واقف باشد، چنین کس درین فن اکمل بود۔ و مہر کنان بر فلزات مثل مس و نقرہ و طلا از قلم آہنی کندہ کنند، واجرت آن خفیف وسہل تر باشد، اما بر جواہرات کندہ کردن بقدرِ تفاوتِ درجات جواہر کار بزرگ وپُر صنعت است۔ طریقِ نقش آنست کہ اول از قلمی کہ بہ نوکِ آن ریزۂ الماس تعبیہ کردہ باشد بر جواہرات حروف را نقش کنند وبعد ازان از قلمی کہ ریزۂ مس مدوّر برنوکِ قلم آہن تعبیہ باشد آن حروفہا را کہ از الماس نشان کردہ اند بہ طول وعرض وعمق درست و ہموار نمایند۔ وسنگی است معروف کہ آن را اہل ہند کھرنڈ گویند، این سنگ را باریک سائیدہ قدرے آب دران اندازند و از نوکِ قلم آن آب سنگ آلودہ را اندکے در عمق حروف (کردہ؟) قلم را بہ عمق حرف نہادہ فسان را بکشند بسببِ حرکت فسان قلم در عمق حروف غائر شود وآبِ سنگ کھرنڈ در عمق حروف ریزند کہ آن جرم جواہر (؟) از میدان حروف زود حک میشود، تا وقتیکہ حروف مع دیگر گل وبرگ ونقش ونگار کہ منظور است درست ونمودار شوند پس ازان نگین کندہ کردہ را خلا کنند وصنعت و ہنرمندی ہر کس آن است کہ در میدان

قلیل جواہر عبارات طویل نام و القاب و خطاب را بہ چنان تقسیم شایستہ کندہ کنند کہ ہمہ عبارت دران جای پزیرد و حروف واضح و آشکار نمودار باشد و بین السطور حروف پر از نقش و نگار بود۔ درین زمان در مملکت ہندستان خان صاحب جلیل القدر بدرالدین خان دہلوی درین فن یکتاے زمان و بے مثل خود اند۔ اگرچہ کارنامہ ہاے ایشان فزون تر ازان است کہ بہ حیطہ تحریر درآید، اما ہمدرین جزو زمان نام و خطاب مہاراجا والا جاہ بلند پایگاہ والی بھرت پور را بر زمرد کہ بہ عرض و طول زیادہ از ناخن انگشت سبابہ مرد جوان نخواہد بود، نام و خطاب مہاراجا بہادر را کہ است مہاراج اندر سوائی بلونت سنگھ بہادر بہ حروف فارسی و انگلیسی بہ صنعتی کندہ کردند کہ یک یک حرف آن واضح و نمودار است و باعث شگفت و تحیر بینندگان گردیدہ۔ مہاراجا بہادر بہ جلدوی این صنعت نمایان اسپ و فیل و خلعت شایان و گران بہ خان صاحب موصوف انعام فرمودند۔

و اجرت علی العموم مہر کنان کہ بر عقیق و یشب و دیگر جواہر کم قیمت کندہ کنند کمتر از یک آنہ و زیادہ از یک روپیہ فی حرف نباشد، پس ہیں۔ در نام ہر قدر حروف باشند بہ حساب آن از یک آنہ تا یک روپیہ فی حرف می باشد۔"

ترجمہ: مہریں کھودنا ایک فن شریف ہے، مہر کن کے لیے نہایت ضروری اور لازمی ہے کہ وہ طرح طرح کے خطوط مثلاً خط نسخ و ثلث و نستعلیق و طغرا کے اصول و قواعد سے واقف ہو، کیونکہ ان سے واقفیت کے بغیر وہ اپنے فن میں کامل نہیں بلکہ ناقص ہے، اگر ان کے علاوہ دوسرے خطوط مثلاً سنسکرت، انگریزی اور فرانسیسی سے بھی واقف ہو تو ایسا شخص اس فن میں اکمل ہوگا۔ مہر کھودنے والے تانبا، چاندی، سونا وغیرہ دھاتوں پر لوہے کے قلم سے کھودتے ہیں، اُس کی اجرت کم اور معمولی ہوتی ہے مگر جواہرات پر

کھودنا اُن کے درجات کے اعتبار سے بڑا اور پُر صنعت کام ہے۔ اس کا
طریقہ یہ ہے کہ پہلے ایک قلم سے جس کی نوک پر ہیرے کی کنی جڑی ہوتی ہے،
جواہرات پر حروف کے نقش بناتے ہیں پھر ایک قلم سے جس کی تانبے کی نوک پر
لوہے کا ایک گول دانا ہوتا ہے ان حروف کی لمبائی، چوڑائی اور گہرائی کو ٹھیک
کرتے ہیں۔ اور ایک جانا پہچانا پتھر جسے اہلِ ہند کھرنڈ کہتے ہیں، اس پتھر کو
باریک پیس کر اُس میں تھوڑا پانی ملاتے ہیں اور قلم کی نوک سے اُس کو حروف کی
گہرائی میں ڈال کر ریتی چلاتے ہیں۔ ریتی کی وجہ سے قلم حروف کی گہرائی تک چلا
جاتا ہے، کھرنڈ پتھر کا پانی حروف کی گہرائی میں ڈالتے ہیں تو حروف کا کھردرا پن جلد
دور ہو جاتا ہے۔ جب سارے حروف مع نقش و نگار اور پھول پتیوں کے، جو بنانے
مقصود ہیں، درست اور نمودار نہ ہو جائیں تب اُس کھدے ہوئے نگین کو نکالتے
ہیں۔ ہر شخص کی صنعت اور ہنر مندی اس میں ہے کہ نگین کے تھوڑے سے میدان میں
طویل عبارت، نام اور خطاب والقاب کو ایسی تقسیم کے ساتھ کھپا دے کہ ہر عبارت
اپنی جگہ پر آجائے اور سب حروف نمایاں ہوں۔ بین السطور نقش و نگار سے پُر ہو۔
اس زمانے میں ہندوستان میں خان صاحب جلیل القدر بدرالدین خان دہلوی اس فن
میں بے مثل اور یگانۂ روزگار ہیں۔ اگر چہ اُن کے کارنامے اس سے کہیں زیادہ ہیں
کہ لکھے جا سکیں مگر ابھی اسی زمانے میں انھوں نے مہاراجا بھرت پور کے نام و
خطاب کو زمرد کے ایک نگین پر جو لمبائی چوڑائی میں ایک جوان آدمی کی انگشت
شہادت کے ناخن کی برابر تھا، مہاراجا بہادر کے نام والقاب کو جو مہاراجا اندر سوائی
بلونت سنگھ بہادر ہے، فارسی اور انگریزی میں ایسی مہارت کے ساتھ کندہ کیا کہ ایک
ایک حرف واضح تھا اور دیکھنے والوں کو حیرت میں ڈال دیتا تھا۔ مہاراجا بہادر نے اس
کے انعام میں اُنھیں ہاتھی، گھوڑا اور شاندار خلعت دیا۔ مہر کنوں کی اجرت جو علی العموم

عقیق، یشب یا دوسرے کم قیمت پتھروں پر کھودتے ہیں عموماً ایک آنہ فی حرف سے ایک روپیہ فی حرف تک ہوتی ہے۔ کسی کے نام میں جتنے حروف ہوں اُسی حساب سے ایک آنہ یا ایک روپیہ فی حرف اُجرت دی جاتی ہے۔

ایک منظوم رسالہ محمد حسین بن حسن بن سعید علوی نے ۵۔ جمادی الثانی ۱۳۰۵ھ / ۱۷۔ فروری ۱۸۸۸ء کو نقل کیا تھا، معلوم نہیں یہ اُن کی تصنیف تھا یا وہ اس کے محض ناقل ہیں۔ اس کے آخر میں آغا میرزا کے شاگرد رحیم اللہ اور بدر الدین مہر کن کا بھی تذکرہ ہے:

ز بدر الدین علی خانِ ہنر مند چہ گویم مدح او کان ہست صد چند
مثال بدر شکلش نازنینے فراخور از کرشمہ پاک طینے
بہ نستعلیق خطش لا جوابش مرصع با رقم از شہ خطابش
بہ نسخ و ہم بہ طغرا قدرتش بود چہ قدرت بلکہ رعنا ندرتش بود
بہر خطش کہ کندے ہر نگین را شکستے سر بسر ارژنگِ چین را
حروف کندہ اش بس نازک اندام سوائے حرفہا گلکاریش تام
حروف جاندارش مثل ذی ہوش تو گوئی از ادب مانند خاموش

یہاں غالب کی مہروں کے ساتھ ہم بدر الدین علی خان کی کندہ کی ہوئی دو اور مہروں کے عکس دے رہے ہیں ان میں ایک مہر احمد علی خان ۱۳۰۱ھ / ۱۸۸۴ء کی ہے، یہ گلی گڑھیا جامع مسجد دہلی کے باشندے اور بدر الدین علی خاں کے بھائی بتائے جاتے ہیں۔ مگر ۱۳۰۱ھ / ۱۸۸۴ء سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ یہ بدر الدین مہر کن کی بنائی ہوئی نہ ہوگی کیونکہ اس میں اور دوسری مہر کی تاریخ میں جو غلام مرتضیٰ خان نادر الزمان بہزاد رقم ۱۲۲۷ھ / ۱۸۱۲ء کی ہے ۶۸ سال کا فصل ہے اور ۱۳۰۱ھ تک بدر الدین کے حیات ہونے کی کوئی شہادت ہمارے پاس

نہیں ہے۔ غلام مرتضیٰ خان بہادر شاہ کے درباری مصور اور شاہی ملازم تھے۔ کوچہ رائے مان میں رہتے تھے (جواب کوچہ رحمان کہلاتا ہے)۔ مرزا سنگی بیگ نے انھیں ''برادران منصور'' میں سے بتایا ہے۔ [سیر المنازل مرتبہ شریف حسین قاسمی صفحہ ۴۱]

بدرالدین علی خاں آخر عمر میں مفلوج ہو گئے تھے انھوں نے ۹۵ سال کی عمر پا کر بروز ہفتہ ۱۹۔ ذی قعدہ ۱۲۹۲ھ/ ۱۸۔ دسمبر ۱۸۷۵ء دہلی میں انتقال کیا، اور قدم شریف میں اپنے خاندانی حظیرے میں دفن ہوئے جس کا اب نام و نشان مٹ چکا ہے۔

نواب ضیاء الدین احمد خان نیر رخشان نے قطعہ تاریخ وفات کہا، تاریخ اس شعر سے برآمد ہوتی ہے:

نامِ بدرالدین علیخان باقلق ہر گہر زند پے بسال فوتِ آن مرحوم حق گہ بزند

یعنی بدرالدین علی خان کے اعداد [۱۰۶۲] میں قلق کے عدد [۲۳۰] جوڑے جائیں تو حاصل ۱۲۹۲ھ ہو گا۔ اور یہی تاریخ صحیح ہے اس لیے کہ یہ ۱۸ دسمبر ۱۸۷۵ء کے مطابق بھی ہے۔

اُن کے دو بیٹوں سعادت اللہ خان اور رشید الدین خان کے نام ہمیں معلوم ہیں۔ موخر الذکر کے فرزند ظہیر الدین علی خاں تھے جو تقریباً ۲۰ برس تک دہلی میونسپل کمیٹی کے کمشنر رہے۔ ان کا ایک فرزند ۱۹۴۷ء کے فسادات میں شہید ہو گیا تھا دوسرے بیٹے کے ساتھ یہ پاکستان کو ہجرت کر گئے تھے۔ وہاں سے ایک بار دہلی آئے تو ایک ناگہانی حادثے میں اُن کا انتقال ہو گیا۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ وہ شاعری کا مذاق رکھتے تھے اور شیخ محمد ابراہیم ذوق کے شاگرد تھے، یہ درست نہیں ہو سکتا۔ ذوق کی وفات کے وقت شاید وہ پیدا بھی نہ ہوئے ہوں۔ غالباً ظہیر دہلوی [مصنف داستان غدر] سے التباس اسی کی بنا پر یہ مغالطہ ہوا ہے۔ سعادت اللہ خاں کے نواسے خلیل الرحمٰن اور اُن کے فرزند عبدالرحیم شاہ تھے۔ ان کی رشتہ داری مطیع

مجتبائی والوں کے خاندان سے بھی تھی۔اس مضمون کی تیاری میں ہمیں دہلی کے نامور اورخاندانی مصور فیروز آرٹسٹ صاحب سے مدد ملی ہے جو عہد جہانگیر کے مشہور مصور نادر الزمان منصور کی اولاد میں ہیں اور اپنے بزرگوں کی وراثت کو آج تک سنبھالے ہوئے ہیں۔بعض اہم معلومات جناب محمد مشتاق تجاروی کے مضمون سے ملی ہیں ان دونوں حضرات کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

بہادر شاہ ظفؔر

ایک مطالعہ

ترتیب: شاہد ماہلی

یہ کتاب بہادر شاہ ظفؔر پر غالب انسٹی ٹیوٹ کے ذریعے منعقد کیے گئے ایک روزہ سمینار کے مقالات پر مشتمل ہے جس میں ہندوستان کے مختلف علاقوں سے دانشوروں نے شرکت کی اور بہادر شاہ ظفؔر کی زندگی اور ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر گرانقدر مقالات پیش کیے۔ اس کتاب میں چند مضامین ایسے بھی ہیں جو بہادر شاہ ظفؔر کی زندگی اور کارناموں کے کسی نہ کسی اہم پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں اور ان کی شخصی و ادبی زندگی کے خدوخال کو واضح کرنے میں راہنما کی حیثیت رکھتے ہیں۔

خوب صورت طباعت، عمدہ گٹ اپ۔

صفحات : ۱۴۱

قیمت : ۶۰ روپے

غالب کے جعلی خطوط

ہر زمانے میں کچھ پڑھے لکھے لوگوں کو مخطوطات اور نایاب کتابیں جمع کرنے کا شوق رہا ہے اور آج بھی ہے۔ اس لیے قلمی اور نایاب کتابوں کی ہمیشہ سے بہت زیادہ مانگ رہی ہے۔ اہل علم کے اس شوق سے فائدہ اُٹھا کر پرانی کتابوں کا کاروبار کرنے والے طرح طرح کی جعلسازیاں کرتے ہیں۔ صرف کتب فروش ہی نہیں بلکہ ہر زمانے میں اس کارِ خیر میں بعض اہم ادیب اور محقق بھی شامل رہے ہیں۔ یہ حضرات مختلف مقاصد کے لیے جعلسازیاں کرتے ہیں۔ ایک اہم اور بنیادی مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ اپنی جعلی تحریر کو نئی دریافت ثابت کر کے ادب میں ممتاز مقام حاصل کیا جائے۔ کبھی کبھی ذاتی اختلافات یا مذہبی عقائد کی بنا پر بھی جعلسازیاں کی جاتی ہیں۔

میں نے اپنی کتاب 'متنی تنقید' میں ایسی بہت سی جعلی تحریروں اور کتابوں کا خاصی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ مثلاً میں نے اُن نو (۹) کتابوں کی نشان دہی کی ہے جو چشتیہ سلسلے

کے بزرگوں کے نام سے لکھی گئیں۔ اس کے علاوہ میں نے ۱۹۳۲ء میں لندن کے دو نوجوان جان کارٹر اور گراہم پولرڈ کا ذکر کیا ہے، جو پرانی کتابوں کا کاروبار کرتے تھے۔ یہ دونوں پڑھے لکھے تھے اور جدید اور قدیم ادب پر اُن کی گہری نظر تھی۔ اُنھوں نے دریافت کیا کہ عہدِ وکٹوریہ کے بعض مشہور مصنفین کے نام سے تقریباً پچاس کتابچے ایسے شائع ہوئے ہیں جو جعلی ہیں اور اصل مصنف سے اُن کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ کتابچے فرسٹ اڈیشن کے طور پر بڑی بڑی قیمتوں پر فروخت کیے گئے تھے۔ میں نے ان کتابچوں کا 'متنی تنقید' میں قدرے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

غالب کے جعلی خطوط کے بارے میں کچھ عرض کرنے سے پہلے ایک دل چسپ واقعہ بیان کر دوں۔

علامہ اقبال کی وفات کے بعد جب پروفیسر شیخ عطاء اللہ نے علامہ کے خطوط مرتب کرنے کا پروگرام بنایا تو وہ حیدرآباد بھی گئے جہاں عباس علی خاں لمعہ نے انھیں اپنے نام علامہ اقبال کے ساٹھ خطوں کی نقلیں فراہم کیں۔ شیخ عطاء اللہ نے ان میں سے انتیس خطوط اپنی مرتبہ کتاب 'اقبال نامہ' جلد اوّل میں شامل کر لیے۔ عطاء اللہ صاحب سے غلطی یہ ہوئی کہ انھوں نے ان خطوط کو اصل سمجھ لیا۔ اقبال نامہ شائع ہونے کے بعد ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے مدلّل بحث کے ساتھ ان خطوط کو جعلی قرار دیا۔

اقبال ریویو جنوری ۱۹۷۴ء میں عبدالواحد معینی اور فضل حق قریشی نے بھی 'اقبال کا فکر و فن' میں ان خطوط کو جعلی ثابت کیا۔ اس مسئلے پر ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے 'ہماری زبان' میں بہت اہم مضمون لکھا ہے، جس میں اُنھوں نے ان خطوط کو جعلی ثابت کیا ہے۔

اکبر رحمانی مرحوم کا کہنا تھا کہ اُن کے پاس لمعہ حیدرآبادی کے نام علامہ اقبال کے خطوط خاصی تعداد میں ہیں۔ انھوں نے لمعہ کے نام علامہ اقبال کا خط 'ہماری زبان' میں اشاعت کے لیے بھیجا۔ 'ہماری زبان' میں لمعہ حیدرآبادی کے نام اقبال کے ایک

خط کا عکس شائع ہوا تو بھوپال کے ماسٹر اختر نے اسے اصل خط ماننے سے انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ خط کسی اور کے نام ہے۔ اس کی تاریخ اور القاب میں زیراکس کے ذریعے تبدیلی کی گئی ہے یعنی تاریخ اور القاب مٹا کر ایک اور خط تیار کیا گیا ہے اور پھر اس خط کی زیراکس کاپی نکالی گئی ہے۔ اس خط پر ادبی حلقوں میں کافی بحث ہوئی۔ اکثر لوگ اکبر رحمانی صاحب کے حامی تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ زیراکس کے ذریعے اتنا بڑا جعل ممکن نہیں ہے۔ اس پر ماسٹر اختر نے ایک بہت دلچسپ کام کیا۔ کام کیا تھا میں تو اسے کارنامہ کہتا ہوں۔ انھوں نے ''ہماری زبان'' میں اشاعت کے لیے ایک مقالہ بھیجا، جس میں علامہ اقبال کے نام غالب کے ایک خط کا عکس پیش کیا گیا تھا۔ میں نے غالب کے خطوط پر برسوں کام کیا ہے، اس لیے غالب کی تحریر کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ یہ خط دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ ایک ایک لفظ غالب کے ہاتھ سے لکھا ہوا تھا۔ میں نے ماسٹر اختر صاحب کا پورا مقالہ پڑھا تو اس دلچسپ حقیقت کا انکشاف ہوا کہ انھوں نے پہلے تو علامہ اقبال کے نام غالب کا ایک خط لکھا اور پھر میرے مرتبہ ''خطوط غالب'' میں شامل غالب کے اصل خطوط کے عکس نکال کر اس کے الفاظ کاٹ کاٹ کے اپنے لکھے ہوئے خط کے مطابق ترتیب دے دیے۔ مثلاً غالب کے خطوط میں ایک لفظ اقبال ہے اور ایک جگہ سلمہ ہے۔ ماسٹر اختر نے ان دونوں لفظوں کو کاٹ کر ایک ساتھ چپکا دیا اور اس طرح پورا خط ترتیب دے دیا۔ اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ فیکس کے ذریعے بہت بڑے پیمانے پر جعل سازی ممکن ہے۔

یہ بات نومبر ۱۹۷۵ء کی ہے۔ الہٰ آباد کے ایک صاحب جلال الدین اُردو گھر تشریف لائے۔ انھوں نے بتایا کہ انھیں امان اللہ صاحب مالک، ایوان کمپنی، الہٰ آباد کے قدیم ذخیرے سے اڑتالیس صفحات پر مشتمل مخطوطہ ملا ہے۔ اس کے ترقیمے میں کاتب کا نام نہیں ہے۔ اس مجموعے میں سولہ فارسی اور پانچ اُردو خط شامل ہیں۔ یہ

سارے خطوط بقول جلال صاحب غیر مطبوعہ ہیں اور اسی مخطوطے میں غالب کا ایک غیر مطبوعہ قطعہ بھی شامل ہے۔

جلال صاحب نے قدیم ترین خطوطِ ''غالب کی دریافت'' کے عنوان سے ایک چھوٹا سا مضمون لکھا تھا جو ''ہماری زبان'' کے ۱۵ رنومبر ۱۹۷۵ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ ان خطوط میں ایک خط تو نواب تجمل حسین خاں صاحب کے نام ہے اور باقی خطوط باندے کے دوسرے لوگوں کے نام۔ ایک خط زین العابدین خاں عارف کا علی حسین خاں ناظم کے نام ہے۔

میں نے جلال الدین صاحب کی موجودگی میں یہ پورا مضمون پڑھا تو عرض کیا کہ چوں کہ یہ خط ایک مخطوطے میں نقل کیے ہوئے ہیں اس لیے سو فیصدی یقین نہیں کیا جاسکتا کہ اصل خطوط ہیں اور یہ خطوط جن لوگوں کے نام ہیں ان میں سے کسی ایک کے نام بھی غالب کا ایک خط بھی کہیں اور نہیں ملتا۔ اس لیے عین ممکن ہے کہ یہ خطوط جعلی ہوں۔

اکبر علی خاں عرشی زادہ مرحوم نے بھی ان خطوط پر ایک چھوٹا سا نوٹ لکھا جو ''ہماری زبان'' میں شائع ہوا۔ اُن کا کہنا تھا کہ یہ سارے خطوط اصل ہیں اور غالب ہی کے لکھے ہوئے ہیں، عرشی زادے نے نوٹ کے آخر میں لکھا تھا:

> ''غرض یہ کہ ہر اعتبار سے یہ خطوط غالب میں ۱۹۷۵ء کا اہم ترین اضافہ ہے اور غالب کے طرفدار ہوں یا نہ ہوں تمام ادب دوست حضرات کی دلچسپی کا باعث ہیں۔ جلال الدین صاحب اس دریافت کے لیے لائق صد مبارک باد ہیں''۔

''ہماری زبان'' کے ۱۵ رنومبر ۱۹۷۵ء کے شمارے میں ان خطوط پر کاظم علی خاں

صاحب کا ایک مضمون چھپا۔ انھوں نے ان خطوط کے دریافت پر خوشی کا اظہار کیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ

> "اگر یہ خطوط حقیقتاً غالب ہی کے ثابت ہوئے تو اس گراں قدر ادبی اور تحقیقی خدمت کے لیے مسٹر جلال الدین نہ صرف مبارک باد بلکہ شکریے کے مستحق ہوں گے۔"

اس کا مطلب ہے کہ کاظم علی خاں صاحب نے سو فیصدی یقین نہیں کیا کہ یہ خطوط غالب کے ہیں۔

کچھ دن بعد میں مالک رام صاحب سے ملنے گیا، معلوم ہوا کہ جلال صاحب مالک رام سے بھی ملے تھے۔ اُنھوں نے جو مضمون بعد میں "ہماری زبان" میں چھپوایا تھا وہ مالک رام صاحب کو دکھا چکے تھے۔

مالک رام صاحب ذرا اکھڑ قسم کے آدمی تھے۔ کسی معاملے میں لاگ لپیٹ نہیں رکھتے تھے۔ انھوں نے جلال صاحب سے کہا کہ آپ کا مضمون پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سب خطوط جعلی ہیں۔ میرے لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ جعل آپ نے کیا ہے یا کسی اور نے۔ ہاں اگر آپ یہ خطوط شائع کر دیں اور ماہرینِ غالب ان کو اصل خطوط تسلیم کر لیں تو اردو ادب پر آپ کا بہت بڑا احسان مانا جائے گا۔

میں نے بھی جلال صاحب سے کہا تھا چوں کہ یہ خطوط خود غالب کی اپنی لکھائی میں نہیں ہیں اور کسی نے انھیں نقل کیا ہے تو فی الحال ان کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

ہاں جب یہ خط چھپیں گے تو ان پر ماہرین غالب جو رائے دیں گے اس کی روشنی میں کوئی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

کاظم علی خاں صاحب نے اپنے مضمون میں لکھا تھا:

''خطوط کے مندرجات منظر عام پر آئیں تو امید ہے کہ ماہرین غالبیات داخلی شواہد کی بنیاد پر اس امر کا فیصلہ کر سکیں کہ خطوط اصلی ہیں یا جعلی۔''

جلال صاحب یہ مخطوطہ فروخت کرنا چاہتے تھے۔ چوں کہ ان کے بیان کے مطابق یہ غالب کے اصلی خطوط تھے اس لیے وہ اس کی بہت زیادہ قیمت طلب کر رہے تھے۔

میں نے ان سے کہا کہ آپ صرف ایک خط کسی رسالے میں چھپوا دیجیے اسی کی بنا پر ماہرین غالب اصلی یا جعلی کا فیصلہ کر لیں گے۔ مالک رام صاحب اور کاظم علی خاں صاحب نے بھی یہی کچھ کہا تھا۔

اس واقعے کو تقریباً تیس سال گزر چکے ہیں، لیکن ابھی تک یہ خطوط منظرِ عام پر نہیں آئے۔ بظاہر اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ جلال صاحب نے غالب کے خطوط کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا لیکن ماہرینِ غالب کے تیور دیکھ کر وہ خائف ہو گئے۔ اُنھوں نے خطوط کا جو مخطوطہ تیار کیا تھا اُسے یا تو ضائع کر دیا یا پھر ہمیشہ کے لیے چھپا لیا۔

میں خطوطِ غالب کی چوتھی جلد کا تنقیدی اڈیشن تیار کر چکا تھا۔ ابھی یہ کتاب پریس جانے والی تھی کہ پاکستان کے سید قدرت نقوی مرحوم کا خط ملا جس کے ساتھ غالب کے ایک خط کی نقل منسلک تھی۔ نقوی صاحب نے خط میں لکھا تھا کہ اُنھیں یہ خط کسی مخطوطے میں ملا تھا۔ میں نے اس خط کو بہت غور سے پڑھا۔ اس خط کے متن میں دو ایسے نام آئے تھے جو غالب کے کم سے کم دو مطبوعہ خطوط میں موجود تھے۔ ایک نام تھا نوروز علی خاں۔ غالب نے ان صاحب کا ذکر اپنے ایک شاگرد غلام حسین قدر بلگرامی

کے ۱۴ر فروری ۱۸۶۴ء کے خط میں کیا تھا اور دوسرا نام ہے احسان خاں کا۔ غالب نے ان صاحب کا ذکر منشی سیل چند کے نام (مورخہ ۱۱ر جون ۱۸۶۷ء) میں کیا ہے۔ ان شواہد سے تو یہ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ خط اصلی ہیں۔ لیکن جن لوگوں کی غالب کے خطوط پر گہری نظر ہے وہی جانتے ہیں کہ اس خط میں متن کا اسلوب غالب کا نہیں ہے۔ خط کا پہلا فقرہ ہے:

ہائے ہائے! میرا دوست نوروز علی خاں خدا بخشے اوس کو، کیسا لطیف اور خلیق اور دانا آدمی تھا۔ غالب کے کسی خط میں لطیف کا لفظ اس مفہوم میں نہیں آیا ہے۔

اس کے علاوہ بھی متن میں کئی مقامات ایسے ہیں جو غالب کا انداز نہیں ہے۔ میں نے اس خیال سے کہ اس خط کے بارے میں کوئی یقینی بات نہیں کہی جاسکتی اسے اپنے مرتبہ خطوطِ غالب کی چوتھی جلد میں شامل کردیا اور حواشی میں خط کی تفصیل بیان کرتے ہوئے میں نے آخری فقرہ لکھا ہے:

> ''میرا خیال ہے کہ جب تک کچھ اور شواہد نہ ملیں اس خط کو اصلی نہیں سمجھنا چاہیے۔''

کم سے کم دو ماہرین غالب ایسے ہیں جنھوں نے اس خط کو اصلی خط ماننے سے انکار کیا ہے۔ ایک تو پروفیسر نذیر احمد۔ جن کا مقالہ ''غالب نامہ'' (نئی دہلی ۱۹۹۱ء) میں شائع ہوا ہے اور دوسرے ڈاکٹر کمال احمد صدیقی۔ جنھوں نے اس خط کے بارے میں صرف ایک فقرہ لکھا ہے وہ یہ کہ خط جعلی ہے۔ اگر اپنے اس بیان کی وضاحت انھوں نے کہیں اور کی ہے تو وہ میرے علم میں نہیں ہے۔ اس خط میں ایک فقرہ ہے:

> ''اتنی طاقت کہاں کہ یہاں سے علی گڑھ جاؤں گا اور وہاں سے آگرے تک اور کانپور تک ریل اور پھر کانپور سے لکھنؤ تک ڈاک

میں پہنچوں"۔

یہاں ڈاک آدمیوں کے سفر کے مفہوم میں آیا ہے۔ غالب نے اپنے خطوں میں ڈاک، ڈاک گھر، ڈاک منشی اور ڈاک کا ہرکارہ وغیرہ جیسے الفاظ تو لکھے ہیں لیکن اس مفہوم میں ڈاک کا استعمال نہیں کیا۔ غالب جب بھی سفر کے معنوں میں ڈاک کا استعمال کرتے ہیں تو ہمیشہ بہ بیل ڈاک لکھتے ہیں۔ پروفیسر نذیر نے غالب کے خطوط سے اس طرح کی کئی مثالیں دی ہیں۔ ان تمام شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط غالب کا نہیں ہے۔ ہمیں اسے اصلی خط ثابت کرنے کے لیے اور بہت سے شواہد کی ضرورت ہوگی، جن کا ملنا فی الحال ممکن نظر نہیں آتا ہے۔

ندیم گیا 'بہار نمبر' (۱۹۳۵ء) میں صفیر بلگرامی کے پوتے سید وصی احمد بلگرامی کا ایک مقالہ شائع ہوا تھا۔ اس مقالے میں اُنھوں نے دو خطوں کی نقلیں درج کی ہیں۔ ایک خط تو غالب کے نام صفیر بلگرامی کا ہے اور دوسرا اُن کے بیان کے مطابق غالب کا ہے جو اُنھوں نے صفیر بلگرامی کے خط کے جواب میں لکھا تھا۔ اس خط میں صفیر کی طرف سے جو کچھ لکھا گیا تھا، اس کے اہم نکات ہیں:

۱- فخرالدین سخن صفیر بلگرامی کے شاگرد تھے۔

۲- سخن کے نام سے چھپنے والی داستان 'سروشِ سخن' کے بارے میں اس خط میں لکھا گیا ہے کہ

"سروش سخن، جس میں اُن (سخن) کی رائے سے درست کرنے کا اتفاق ہوا، سب حال آپ سے بیان کیا جائے۔ چوں کہ اس قصّے کو چھپنا چاہیے اور لکھنؤ بھیجنا منظور نہیں۔ اس کے سوا حضور سے بڑھ کر کون ہے؟ اس لیے وہ قصہ بھیجتا ہوں۔ حضور۔ اس کو میری تصنیف سمجھ کر تصحیح فرمائیے۔

۳- خط میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ سخن کی طبیعت اچھی ہے۔ آج ہی ان کی ایک غزل

میرے پاس پٹنہ سے اصلاح کے لیے آئی ہے۔ اس کا ایک شعر میرے دل میں کُھب گیا۔ وہ یہ ہے:

سنبھالا ہوش تو مرنے لگے حسینوں پر
ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

اس خط میں صفیر کی طرف سے یہ بیان دیا گیا ہے کہ سخن اُن کے شاگرد ہیں۔ 'سروشِ سخن' کی تصنیف کو اس طرح گھما پھرا کر کہا گیا ہے کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ صفیر کی تصنیف ہے یا اس میں صفیر کی اصلاح اتنی ہے کہ وہ ان کی تصنیف بن گئی ہے۔ صفیر کی طرف سے یہ بھی لکھا گیا ہے کہ

"سخن نے پٹنہ سے اپنی غزل اصلاح کے لیے صفیر کو بھیجی ہے"

اب غالب کے خط کے متن کے چند اہم نکات ملاحظہ فرمایئے۔
اس خط کے جواب میں غالب کی طرف سے صفیر کو لکھا گیا ہے:

"سروشِ سخن (قصہ) دیکھا۔ آپ کے جوہرِ طبع کی لمعانی اور نیز فکر کی درخشانی بہت جگہ پر پسند آئی"۔

گویا غالب 'سروشِ سخن' کو صفیر بلگرامی کی تصنیف مانتے ہیں۔
دونوں خطوں میں جو باتیں کہی گئی ہیں وہ سب غلط ہیں۔ سخن کا لطیفہ یہ ہے کہ اُنھوں نے غالب کی زندگی ہی میں خود کو اُن کا نواسہ اور شاگرد بتایا تھا، جس کا کوئی ثبوت ابھی تک نہیں ملا۔ 'قاطع برہان' کے قضیے میں فخرالدین سخن نے غالب کی حمایت میں تین قطعے کہے تھے۔ لیکن غالب کو ان قطعوں کا علم نہیں تھا۔ کیوں کہ غالب کے خطوط میں سخن اور ان قطعات کا ایک بار بھی کہیں ذکر نہیں آیا، میں نے اس پر بہت طویل مقالہ بہت پہلے لکھا تھا جو لاہور کے "صحیفہ" میں شائع ہوا تھا۔ اس وقت میرے پیش نظر وہ رسالہ نہیں ہے جو میں اس کا پورا حوالہ دے سکوں۔

صفیر بلگرامی نے اپنے تذکرہ "جلوۂ خضر" میں لکھا ہے کہ

"جب میں دہلی میں تھا تو غالب نے 'سروشِ سخن' دیکھا۔ بہت تعریف کی اور تقریظ لکھ کر دی"۔

اس سے دو باتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہاں بھی صفیر بلگرامی کہنا چاہتے ہیں کہ 'سروشِ سخن' اُن کی تصنیف ہے اور دوسرے وہ یہ کہتے ہیں کہ جب وہ دہلی میں تھے تو غالب نے اُن کی تصنیف 'سروشِ سخن' پر تقریظ لکھی۔

صفیر بلگرامی دہلی میں ۱۲۸۲ھ کے اوائل میں تھے اور بقول اُن کے دہلی میں اُن کے قیام کے دوران غالب نے 'سروشِ سخن' پر دیباچہ یا تقریظ لکھ کر دی۔ لیکن تقریباً ایک سال کے بعد ربیع الثانی ۱۲۸۳ھ کے خط میں غالب لکھتے ہیں کہ:

"دیباچے کا عظیم آباد روانہ ہونا معلوم ہوا لیکن یہ نہیں معلوم ہوا کہ لختِ جگر و نور بصر مولوی فرزند احمد (صفیر بلگرامی) کو وہ پسند آیا یا نہیں"۔

یہ خط ربیع الثانی ۱۲۸۳ء میں لکھا گیا۔ جب کہ جعلی خط سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیباچہ ۱۲۸۲ھ میں لکھا گیا۔ گویا تقریباً ایک سال پہلے لکھا گیا۔ ظاہر ہے کہ غالب کو دروغ گوئی سے کام لینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

دو دل چسپ حقائق اور ملاحظہ ہوں۔ سخن کا اردو دیوان مطبع نول کشور سے ۱۸۸۶ء میں شائع ہوا تھا۔ گویا غالب کی وفات کے سترہ سال بعد۔ اس پر غالب کا لکھا ہوا دیباچہ شامل ہے جو ظاہر ہے کہ جعلی ہے اور خود سخن کا لکھا ہوا ہے۔

ایک دل چسپ لطیفہ یہ ہے کہ صفیر بلگرامی سخن کو اپنا شاگرد کہتے تھے اور سخن صفیر کو اپنا شاگرد بتاتے تھے۔

غالب کے جعلی خطوط کا دل چسپ ترین معاملہ 'نادر خطوط غالب' ہے۔ غالب کے اس

مجموعے کے مرتب سید محمد اسماعیل رسا ہمدانی گیاوی ہیں۔ باسٹھ صفحات پر مشتمل خطوط کا یہ مجموعہ ۱۹۳۹ء میں 'کاشانۂ ادب' لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ اس میں رسا ہمدانی کا لکھا ہوا ایک دیباچہ اور غالب کے ستائیس خطوط ہیں۔ ان میں تئیس خطوط بقول رسا ہمدانی اُن کے دادا سید شاہ کرامت حسین کرامت ہمدانی بہاری کے نام ہیں۔ تین صفیر بلگرامی کے نام اور ایک صوفی منیری کے نام۔ دیباچے میں رسا ہمدانی نے لکھا ہے:

''میرے دادا سید شاہ علی حسین ہمدانی آتی المتخلص بہ عالی ہمدانی نے ۱۹۱۲ء میں غالب کے چند غیر مطبوعہ خطوط جو اُن کے والد سید شاہ کرامت حسین کرامت ہمدانی بہاری کے نام سے آئے تھے، ایک خوشخط کاتب سے صاف کرا کے کتابی صورت میں ایک جا جمع کیے تھے اور ان کا تاریخی نام ''نادر خطوطِ غالب'' رکھا تھا۔ افسوس یہ ہے کہ چند مجبوریوں کی وجہ سے وہ خطوط کتابی صورت میں اب تک شائع نہ ہو سکے''۔

رسا ہمدانی نے لکھا ہے کہ:

''کرامت حسین کرامت ہمدانی غالب کے مشہور شاگردوں میں تھے''۔

حقیقت یہ ہے کہ کرامت صاحب کا غالب سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ مالک رام صاحب کی مرتبہ کتاب ''تلامذۂ غالب'' میں ان کا کوئی ذکر نہیں ہے اور نہ ہی کسی اور تذکرہ نگار نے اُن کا ذکر کیا ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ یہ غالب کے شاگرد ہونا تو دور کی بات ہے، شاعر بھی نہیں تھے اور اگر تھے بھی تو انتہائی معمولی اور مقامی قسم کے۔ کیوں کہ اس عہد کے کسی بھی تذکرے میں ان کا ذکر میری نظر سے نہیں گزرا۔ بقول رسا

ہمدانی:

''غالب نے اپنے شاگرد کرامت ہمدانی کے نام خطوط لکھے تھے۔ کرامت صاحب کے بیٹے عالی مرحوم نے ان خطوط کو ایک کاتب سے خوشخط لکھوا کر ایک مسودہ تیار کیا تھا، جس کا تاریخی نام 'نادر خطوطِ غالب' رکھا تھا''۔

۱۹۳۱ء میں رسا ہمدانی نے دو چار خطوط کچھ رسالوں میں شائع کرائے اور پھر بقول رسا ہمدانی ''۱۹۳۹ء میں شاکر میرٹھی نے ان سے اصرار کیا کہ وہ ان خطوط کو شائع کریں''۔ یہ خطوط بقول رسا ۱۹۱۲ء میں مرتب ہوئے تھے اور ان کی اشاعت کا خیال ۱۹۳۹ء یعنی ستائیس سال بعد آیا تھا۔ اس لیے اُنھوں نے غالب کے ستائیس خطوط منتخب کر کے کتابی صورت میں شائع کر دیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خطوط کی تعداد زیادہ تھی لیکن صرف ستائیس خطوط مرتب کیے گئے۔ میرے خیال سے یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ کیوں کہ غالبؔ کے اشعار ہوں یا خطوط دونوں کی بہت قدر رہی ہے اور یہ ممکن نہیں ہے کہ رسا صاحب کے پاس بڑی تعداد میں خطوط ہوں اور ان میں سے صرف ستائیس خطوط منتخب کر کے چھاپے جائیں اور وہ بھی ۲۷ سال بعد۔

جب خطوط کا یہ مجموعہ شائع ہوا تو اس کتاب پر مالک رام صاحب کا تبصرہ جامعہ دہلی، مارچ ۱۹۴۲ء میں اور قاضی عبدالودود کا تبصرہ 'معیار، پٹنہ (جنوری ۱۹۴۳ء) میں شائع ہوا۔ دونوں نے اس مجموعے کے تمام خطوط کو غالباً ایک کے علاوہ جعلی قرار دیا۔

ان خطوط کے جعلی ہونے کے ثبوت میں کچھ شواہد ملاحظہ ہوں۔

رسا نے مرزا ہرگوپال تفتہؔ کے نام غالب کا ایک خط نقل کیا ہے، جس پر ۴ رجنوری ۱۸۵۲ء کی تاریخ درج کی گئی ہے۔ خط میں لکھا ہے:

''عمدہ اور میٹھے آموں کا پارسل اگر آئے گا تو میں خوش ضرور

ہوں گا اور اگر نہیں آئے گا تو میں طلب بھی نہیں کروں گا''۔

جنوری کے مہینے میں آموں کی بہار بہت دل چسپ بات ہے اور پھر بقول قاضی عبدالودود اس زمانے میں پٹنہ سے دہلی تک ریلوے لائن نہیں تھی تو پھر یہ پارسل آنے کا کیا ذریعہ تھا۔ خط نمبر ۵ مورخہ ۲۵ را کتوبر ۱۸۵۹ء میں عبارت ملتی ہے۔

> ''یہ دن مجھ پر بُرے گزرتے ہیں۔ میری حالت بعینہٖ وہی ہوتی ہے جیسے زبان سے پانی پینے والے جانوروں کی خصوصاً اس تموز میں''۔

یہ پوری عبارت شفق کے نام غالب کے خط مورخہ ۱۹ ر جولائی ۱۸۶۰ء سے لی گئی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ غالب کے اصل خط میں 'میرا حال' کی جگہ 'گرمی میں میرا حال ہے'۔

اور دوسرے یہ کہ اکتوبر کے مہینے میں ایسی گرمی نہیں ہوتی جیسی کرامت ہمدانی کے نام خط میں بیان کی گئی ہے۔

'نادر خطوط غالب' میں ایک اور خط ہے جس پر ہفتم اکتوبر ۱۸۶۳ء کی تاریخ درج ہے اور اس کی عبارت یہ ہے:

> ''برسات کا حال کیا پوچھتے ہو۔ خدا کا قہر ہے۔ قاسم جان کی گلی سعادت خاں کی نہر ہے۔ میں جس مکان میں رہتا ہوں۔ عالم بیگ کے کٹڑے کی طرف کا دروازہ گر گیا۔ مسجد کی طرف کے دالان کو جاتے ہوئے جو دروازہ تھا، گر گیا۔ سیڑھیاں گرا جاتی ہیں۔ صبح کے بیٹھنے کا حجرہ جھک رہا ہے اور چھتیں چھلنی ہیں۔ مینھ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے۔ کتابیں، قلمدان، کتابیں سب توشہ خانے میں، فرش پر کہیں لگن رکھا ہوا ہے، کہیں

چلمچی دھری ہوئی ہے۔ خط کہاں بیٹھ کر لکھوں"۔

یہ عبارت رسا ہمدانی نے غالب کے اُس خط سے لی ہے جو غالب نے میر مہدی مجروح کے نام ۲۶ رستمبر ۱۸۶۲ء کو لکھا تھا۔

اصل خط سے موازنہ کر کے دیکھا تو صرف چار پانچ الفاظ کا فرق ہے۔ باقی پوری عبارت وہی ہے جو میر مہدی مجروح کے خط میں ہے۔ مجروح کے نام ایک خط کی عبارت ہے:

"جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا۔
دکانیں، حویلیاں ڈھا دی جائیں گی۔ دارالبقا فنا ہو جائے گا۔
رہے نام اللہ کا۔ خان چند کے کوچہ، شاہ بولا کا بڑ ڈھے گا۔
چاروں طرف پھاوڑا اچل رہا ہے۔ باقی خیر و عافیت ہے"۔

یہ عبارت میر مہدی مجروح کے نام غالب کے ایک خط ۸ رنومبر ۱۸۵۹ء سے لی گئی ہے۔

میں نے یہاں چند مثالیں دی ہیں ورنہ اگر پورے مجموعے کا غالب کے اصل خطوط سے موازنہ کیا جائے تو ایک کتابچہ بن جائے گا۔

غرض یہ ہے کہ غالب کے ایسے خطوط کی تعداد خاصی ہے، جو جعلی ہیں اور جنہیں صرف شہرت حاصل کرنے کے لیے تصنیف کیا گیا ہے۔

قمر رئیس

مکاتیبِ غالب اور عہدِ غالب کی معاشرت

اس موضوع سے کسی حد تک انصاف کرنے کے لیے میں نے گزشتہ دنوں غالب کے مکاتیب کا مطالعہ خاص محنت سے کیا اور اس امید کے ساتھ کیا کہ ان کی نثری تحریروں میں، گردوپیش کی زندگی اور بدلتے ہوئے معاشرہ کا بیان کم از کم ان کی شاعری کے مقابلہ میں زیادہ مبسوط اور معتبر ہوگا لیکن یہ امید بر نہ آئی بلکہ یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ غالب کا مشاہدہ محدود تھا۔ خارجی زندگی اور اس کے عام مظاہر سے ان کے ذہنی اور جذباتی رابطے کمزور تھے۔ اور صرف ایسے ہی واقعات اور مناظر ان کی دلچسپی کا باعث ہوتے تھے جو ان کے وجود میں کسی طرح کا ہیجان، غم و غصہ یا کشمکش پیدا کرسکیں۔ جو انہیں سوچنے پر اکساسکیں یا پھر جو ان کے ذاتی مفادات سے براہ راست یا بالواسطہ تعلق رکھتے ہوں۔

پروفیسر یوسف سرمست کا ایک مضمون میں نے پڑھا تھا۔ ''غالب اور اردو ناول''۔ جس میں انہوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ غالب کے خطوط میں ناول کا

انداز ملتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''غالب کے خطوط میں ناول کا ڈسکورس نمایاں ہوتا ہے..... خطوط میں ناول کی طرح داخلی اور خارجی زندگی کے ہر پہلو کا بیان ملتا ہے[1]۔''

کاش یہ سچ ہوتا۔ خطوط پڑھ کر اندازہ ہوا کہ پروفیسر موصوف کا یہ دعویٰ بڑی حد تک خیالی اور شواہد سے خالی ہے۔ ناول کے بیانیہ میں جس طرح کی جزئیات نگاری، ماحول کشی اور جیتے جاگتے کردار ہوتے ہیں غالب کے خطوں میں اس کا شائبہ بھی نہیں ہے۔ بے شک ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد سماجی تبدیلی کا جو عمل ہر سطح پر شروع ہوا اور ابتدا میں قتل و غارتگری، دار و گیر اور تباہ کاری کے جو واقعات رونما ہوئے، انہوں نے غالب کو شدت سے متاثر کیا۔ اس کا اظہار ان کے خطوں اور دستنبو میں تفصیل سے ہوا۔ لیکن ۱۳-۱۸۱۲ء میں دلّی میں سکونت شروع کرنے کے بعد مغلیہ جاہ و جلال کی بساط کے سمٹنے اور انگریزی عمل داری کے مستحکم ہونے کا جو عبوری عہد انہوں نے دیکھا اور ان معاشرتی تبدیلیوں کو بھی دیکھا جو دبے پاؤں آرہی تھیں، ان کا ذکر ان کی شاعری اور نثر دونوں میں نظر نہیں آتا۔ اہل نظر جانتے ہیں کہ ملک میں جہاں جہاں برطانوی کمپنی کا اقتدار و اثر بڑھ رہا تھا وہاں جاگیردارانہ نظام ٹوٹ رہا تھا۔ نئے تہذیبی اور تعلیمی ادارے نمودار ہو کر آہستہ آہستہ اپنی جگہ بنا رہے تھے۔ قدیم دلی کالج، دلّی سوسائٹی، ڈاک و تار کا نظام، کتابوں کی اشاعت، اخبارات کی مقبولیت صرف چند مثالیں ہیں۔ ان کے نتیجہ میں نئی طرح کے سماجی رشتے اور رویے بھی وجود میں آرہے تھے لیکن جہاں تک غالب کے مکاتیب کا تعلق ہے وہ اس صورت حال سے بے نیاز نظر آتے ہیں۔ صرف یہی نہیں دلّی کے میلوں، ٹھیلوں، بازاروں اور کوچوں کی رونق کا حال بھی ان کی تحریروں میں نہیں ملتا۔ البتہ مشاعروں کا کچھ حال ان کے خطوں میں

مل جاتا ہے۔ تاہم یہاں بھی لگتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے ان سخنوروں سے جو صرف ریختہ میں شعر کہتے تھے، خوش نہیں تھے۔ ان کی طرف غالب کا رویہ اگر بیزاری کا نہیں تو دوستانہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ نواب مصطفےٰ خاں بہادر اور میر مہدی مجروح کے نام اپنے فارسی خطوط میں کچھ مشاعروں کا احوال لکھا ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"نواب صاحب مشاعرے میں تشریف نہیں لے گئے۔ مجھے جانے کی رخصت دی۔ میں نے ریختہ گویوں کی انجمن میں بہت سے شاعروں کا مجمع دیکھا۔ لمبی لمبی غزلیں ان لوگوں نے پڑھیں۔ یہاں تک کہ جب میں گھر واپس آیا اور بستر پر لیٹا تو آدھی رات گزر چکی تھی۔

غزل خوانی کے سلسلے میں جب مجھ تک نوبت پہنچی تو میں نے "ملک نخواست فلک نخواست" زمین میں کہی ہوئی اپنی غزل سنائی۔ اس کے بعد طرح پر انشا کی ہوئی غزل پڑھی۔

چہ عیش از وعدہ، چوں باور ز عنوانم نمی آید
بنوع گفت می آیم، کہ می دانم نمی آید"

غالب کے بیانات سے انداز ہوتا ہے کہ اکثر مشاعرے لال قلعہ کے شہزادگان کے ایوان خانوں میں ہوتے تھے۔ اور طرحی ہوتے تھے۔ طرح فارسی یا ریختہ دونوں میں ہوتی تھی۔ لیکن اساتذہ کو غیر طرحی کلام پڑھنے کی بھی اجازت تھی۔ اکثر شہزادگان صاحب ذوق تھے۔ کبھی کبھی مشاعروں کی محفل ساری رات چلتی تھی۔ اور کئی دن تک شعرا کے کلام کے چرچے ہوتے رہتے تھے۔

میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں غالب نے بادشاہ سپہر پناہ کے فرمان سے منعقد ہونے والے ایک ایسے ہی مشاعرہ کا حال اپنے مخصوص انداز میں سپرد قلم کیا ہے۔

"یہ بات، نزدیکوں کے واسطے، باعث مسرت اور دور والوں کے لیے، یک گونہ بشارت ہے کہ بادشاہ سپہر پناہ نے فرمان جاری کیا اور ناظر بارگاہ نے سخن وروں کو ایوان نظارت میں، اس امر کی اطلاع دی کہ جمعے کے دن ماہ فروری ۲۵ تاریخ کو، اس فجستہ نشیمن میں آئیں اور جام سخن سے ایک دوسرے کے ساتھ بادہ پیمائی کریں۔ شہزادگان بابریہ کی ایک جماعت اور آزادگان شہر میں سے کچھ اشخاص جمع ہوئے۔ لوگوں کا کچھ ایسا اژدہام ہوا کہ جگہ تنگ ہوگئی اور لوگ ٹھسا ٹھس بھر گئے۔

سب سے پہلے 'سلطان الشعرا شیخ ابراہیم ذوق نے حضرت والا کی غزل اس خوش آوازی کے ساتھ پڑھی کہ زہرا جو مغنیۂ فلک ہے، آسمان سے نیچے اتر آئی۔ بعد ازاں شہزادۂ یوسف دیدار، ہمایوں آثار، مرزا خضر سلطان بہادر نے اس طرح تازہ میں اپنی غزل پیش کی، گویا اپنے اشعارِ گوہر نثار کی صورت میں، بساط بزم پر ستاروں کی بارش کردی؛ اس کے بعد مرزا حیدر شکوہ مرزا انور الدین اور مرزا عالی بخت نے کہ

عالی تخلص کرتے ہیں، سازِ سخن چھیڑا اور نغماتِ شعر کو بلند آہنگ کیا۔

غالب آشفتہ نوا نے کہ مرزا عالی بخت کیساتھ بیٹھا ہوا تھا، اپنی طرف سے دس شعر اس بزمِ سخن میں پیش کیے، محوی نام ایک امرد نے کہ خم کدۂ صہبائی کے مے نوشوں میں ہے اپنی صدائے طفلانہ کے ساتھ اہل محفل کو متوجہ کیا۔ مرزا حاجی شہرت نے کم وبیش ۷ شعروں پر مشتمل، اپنی غزل، طرح میں پڑھی اور سامعِ اہلِ انجمن کو، اپنا یہ شاعرانہ تحفہ پیش کیا، میں آب گزاری کا بہانہ کرکے، محفل سخن سے باہر آیا، اور اپنے غم کدہ کی راہ لی۔

دکانوں کے درِ کھلے ہوئے تھے اور چراغ روشن تھے، ابھی یہ کہیے نصف شب کا وقت گزرا نہیں تھا میں نے بوریائے بے ریائی پر اپنی محفل سجالی، دو چار جام پئے اور بادۂ ناب کی جرعہ چشی کی[۲۰]۔

غالب کے وہ اردو خطوط جن میں ان کی تہ داری شخصیت والہانہ اور بے ساختہ انداز سے منکشف ہوئی ۱۸۵۷ء کے بعد ہی لکھے گئے۔ لیکن یہ سوچنا بھی غلط ہوگا کہ اس سے پہلے معاشرہ میں جو تبدیلیاں راہ پا رہی تھیں اس سے غالب کی شخصیت متاثر نہیں ہو رہی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ تبدیلیاں Accumolative طور پر یا تواتر کے ساتھ ان کی باطنی زندگی اور طرزِ فکر پر اثر انداز ہو رہی تھیں۔ غالب کے ذہن کی بافت ایک طرح سے تار حریر دو رنگ سے ہو رہی تھی۔ ایک طرف وہ زوال پذیر جاگیردارانہ

اقدار سے جڑے تھے تو دوسری طرف مہربان اور مہذب انگریزوں اور پرتگالی شراب کے عاشق۔ بقول سید احتشام حسین زندگی کے نئے تجربات غالب کے ایسے ذہن پر اپنا نقش چھوڑ رہے تھے جو چیزوں کی حقیقت جاننے، مشاہدہ سے کام لینے اور نئے تصورات کا خیر مقدم کرنے میں بیباک تھا۔

یوں تو غالب سولہ سال کی عمر میں آگرہ سے دلّی آ گئے تھے اور انہوں نے یہاں برطانوی عمل داری کی گرفت کو مضبوط ہوتے ہوئے دیکھا اور محسوس کیا تھا لیکن برطانوی حکومت کی سرپرستی نے تمدّنی ترقی کے کیا مدارج طے کیے تھے؟ انسان کو آسایشوں اور سہولتوں کی کتنی نعمتیں مہیا کی تھیں؟ اس کا تجزیہ انہیں کلکتے کے سفر اور وہاں کے تین سالہ قیام کے دوران ہوا۔

ایسا لگتا ہے کہ ۱۸۲۶ء میں دلّی سے نکلنے کے بعد ان کی چشم جہاں بیں زیادہ حساس اور کشادہ ہو گئی تھی۔ رائے چھج مل کھتری اور دوسرے احباب کے نام انہوں نے دوران سفر ہی جو خط لکھے ان میں ایک تنقیدی زاویہ صاف نظر آتا ہے۔ مثلاً ایک خط میں لکھنؤ کے وزیر، آغا میر کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "ابتدائے کار میں جس شخص کو اپنی مقصد براری کے لیے اُس نے کارگزار تصور کیا اُس سے چپک گیا۔ لاجرم ایک دو آدمی اس سے متمتع ہوئے اور اب کہ اپنی دولت کے استحکام کی طرف سے اس کی خاطر جمع ہے، وہ روپیہ بٹوانے میں لگا ہوا ہے۔ لکھنؤ کے تمام قدیم خاندان اس بے رحم کی بیداد کی وجہ سے سیلاب بلا کی نذر ہو گئے۔ اور اس شہر کے ناز پروردہ اب اِدھر اُدھر دوسرے شہروں میں دھکّے کھاتے پھر رہے ہیں اور وہ خود اپنی طبیعت

کے اسراف بے جا سے پشیمان اور شیوۂ پستی سے دل
تنگ اور برگشتہ خاطر ہے، بیدادگری کا بازار گرم ہے۔
مہاجن، ساہوکار اور تاجر خفیہ خفیہ یہاں سے اپنا
زرومال کانپور منتقل کر رہے ہیں کہ اس کے رویے سے
مطمئن نہیں ہیں۔ جو تھا وہ بھاگ گیا اور جو ہے وہ
بھاگنے کی فکر میں ہے''۔

ہوسکتا ہے اس بیان میں کچھ عصبیت اور مبالغہ ہو لیکن اُس عہد کے لکھنؤ میں نوابی دربار سے وابستہ امرا جس طرح کی بدکاریوں میں مبتلا تھے، یہ بیان اس کی طرف واضح اشارہ ضرور کرتا ہے۔

آج دلّی سے کلکتے کا سفر طیارہ میں دو گھنٹے میں طے ہو جاتا ہے لیکن عہدِ غالب میں یہ سفر جو مہینوں میں طے ہوتا تھا، مسافر کے لیے کتنی صعوبتوں اور اذیتوں کا باعث ہوتا تھا۔ اس کی کچھ جھلکیاں بھی غالب کے خطوط میں ملتی ہیں۔ مولوی محمد امین کے نام لکھتے ہیں:

''غرض کہ میں مودھا سے نکلا اور ایک بیل تانگہ جس کو
یہاں ''سڑھیا'' کہتے ہیں بارکشی کے لیے کرایہ پر لیا۔
چونکہ وہ مجھ سے بھی زیادہ ضعیف الخلقت تھا، آہستہ خرام
بلکہ مخرام، دس بارہ کوس بھی راہ طے نہ کرسکا، اور
مودھا سے چلہ تارہ تک اس کا پہنچنا مشکل ہوگیا۔ چار
رات تک ایک گاؤں میں رکنا پڑا سہ شنبہ آخر شب میں
روانہ ہوا اور میں خود دوپہر دن چڑھے چلہ تارہ کی ایک
کارواں سرائے میں پہنچا۔ اور یہ ہیچ مخرام جب تک

ایک پہر رات نہ گزر گئی مجھ تک نہ پہنچ سکا"[۵]۔

اُس زمانے کی کارواں سرائے جہاں غالب قیام کرتے تھے، بے حد گندی تھیں، وہاں کی گندگی، عفونت، بدانتظامی، تھانیداروں کی مداخلت بیجا، کشتی کے سفر کی پریشانیاں، ناخداؤں کی بدمعاملگی، راستے کی بیماریاں، ان سب کا بیان غالب کے خطوں میں ملتا ہے۔ رائے چھجمل کھتری کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"وطن سے دوری، عزم سفر اور عالم غربت کا آرام ایک خواب ہے کہ خدا نہ کرے کسی تنفس کے حصے میں آئے اس شخص کے بخت رمیدہ اور طلب واژگوں پر افسوس ہے کہ وہ جن چیزوں کا طلب گار ہو اور انہیں کو نہ پا سکے"۔

دیارِ مشرق کے سفر کو مرزا غالب نے 'زمانۂ دشت نوردی' سے تعبیر کیا ہے۔ کلکتے پہنچ کر مرزا علی بخش بہادر کو لکھتے ہیں:

"شہر کلکتہ ایک ایسا دیار ہے جہاں ہر نوع کے ساز و سامان کی فراوانی ہے۔ جس کے ہنرمندوں کے لیے، چارۂ مرگ کے سوا، ہر طرح کے دکھ درد کا مداوا آسان ہے اور خوش نصیبی کے علاوہ اس کے بازاروں میں ہر شے بہ افراط ملتی ہے۔ میری فرودگاہ شملہ بازار میں واقع ایک کاشانہ ہے۔ جس روز میں یہاں پہنچا اسی دن یہ مکان بغیر کسی زحمت اور تردد کے کرایہ پر مل گیا"[۶]۔

سفر کی سختیوں کے بعد کلکتہ پہنچ کر اچانک اور شاید غیر متوقع طور پر زندگی کی ایسی آسایشوں اور آسانیوں کا میسر آنا یقیناً غالب کے لیے حیرت اور مسرت کا باعث

تھا اور یہی وہ پہلا تاثر تھا جس نے انہیں برطانوی عمل داری کی نئی اور نادیدہ نعمتوں کی والہانہ تحسین پر آمادہ کیا۔

اگرچہ یہ سچ ہے کہ کلکتے کے زمانۂ قیام میں بھی مرزا غالب اپنی ذاتی الجھنوں، پنشن کے مقدمہ کی پیروی اور دوسرے علمی مناقشوں میں گرفتار رہے، جس کا ثبوت ان کے خطوں سے ملتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کلکتے کے تمدنی اور تہذیبی حالات کا بیان جو میرا موضوع ہے ان کے خطوں میں بہت کم جگہ پاسکا۔ بعض خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کلکتے میں ایک ادبی انجمن تھی جس نے غالب کی آمد پر انہیں اعزاز بخشا۔ مولوی محمد علی خاں کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

> ''یہاں کے طُرفہ واقعات میں سے یہ واقعہ بھی ہے کہ اس شہر کے نکتہ رس اور سخن ور افراد نے اس خاکسار کے ورود سے پہلے ہی ایک انجمن بنا رکھی ہے۔ ہر ماہ انگریزی شمسی کے پہلے یک شنبہ یہ اہل قلم اور مدرسۂ کمپنی بہادر کے ادبا اور اہلِ علم یہاں جمع ہوتے اور ہندی وفارسی غزلیں پڑھتے ہیں۔ اچانک ایک بلند پایہ شخص جو ہرات سے بعہدۂ سفارت یہاں وارد ہوئے، میرے اشعار کو سن کر بڑی بلند آہنگی کے ساتھ انہوں نے میری ستایش کی اور اس قلمرو کے نادرہ گویوں کے کلام پر زیرلب مسکراتے رہے۔
>
> چونکہ طبیعتیں بالذات خودنمائی پر فریفتہ ہوتی ہیں اس لیے انہوں نے میرے کلام پر اس داد و تحسین کو سن کر حسد کو کام فرمایا۔ اس انجمن کے سربرآوردہ افراد اور

اس بزم سخن کے فرزانوں کی طرف سے میرے دو
شعروں پر ناروا اعتراضات وارد کیے گئے اور اب انہیں
شہرت دی جا رہی ہے؎۔"

دور افتادہ دیار کلکتہ میں غالب کی زندگی کا تین سالہ دور بڑی مصروفیت میں گزرا۔ ایک طرف وہ اپنی پنشن کے مقدمے کی تگ و دو میں رہے تو دوسری طرف علمی نوعیت کے تنازعات میں الجھ گئے۔ اس سے اہم بات یہ کہ ان کی چشم تماشہ بیں نے انگریزوں کی بنائی ہوئی ایک نئی دنیا دریافت کی۔ مغرب سے لائی ہوئی ایک نئی معاشرت کا نظارہ کیا۔ دُخانی جہاز، ٹیلی فون، بجلی، گیس کے ہنڈے، ریل، ماچس اور بتان خود آرا جن کا ذکر ان کی فارسی اور اردو منظومات میں ملتا ہے، ایک نئے ڈھنگ سے غالب کے شعور کی تربیت کر رہے تھے۔ بلاشبہ وہ مغرب کے ابھرتے ہوئے صنعتی نظام کی مادی اور سائنسی ترقیوں سے مرعوب تھے۔ کلکتے کے مشاہدات اور تجربات نے ان کے وجود میں، کم از کم مغلیہ تہذیب و معاشرت کی معنویت کے حوالہ سے ایک سوالیہ نشان ضرور بنا دیا تھا، جس کی وجہ سے ۱۸۵۷ء کے واقعات کے بارے میں وہ ایک حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔

مئی ۱۸۵۷ء سے کم و بیش ۱۸۶۲ء تک مرزا غالب نے اپنے احباب اور قدر شناسوں کو جو بے شمار خطوط لکھے ان کا موضوع اور مرکز ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی ہمہ جہت تباہ کاریاں، قتل و غارتگری اور جان و مال کا اتلاف تھا۔ وہ خود اس قلزم خوں کے شناور رہے تھے۔ اس لیے ان کے اکثر خطوں میں اس المیہ پر نوحہ خوانی کا انداز غالب نظر آتا ہے۔ اگرچہ بعد کے خطوں میں کہیں کہیں یہ احساس بھی جھلکتا ہے کہ اس مادی، تہذیبی اور انسانی تباہ کاری کے پہلو سے ایک نیا نظام حیات جنم لے رہا ہے جو زیادہ جمہوری اور منصفانہ ہے۔

غالب شناسوں اور اہل علم حضرات نے اس عہد کے خطوط پر اظہار خیال کرتے ہوئے غالب پر کئی طرح کے الزامات عائد کیے ہیں اور مختلف خطوں میں ان کے متناقص رویے کو نشانہ بنایا ہے۔ اس صورت حال کا جائزہ یا افہام و تفہیم میرا موضوع نہیں ہے۔ البتہ یہ اعتراف ضروری ہے کہ مرزا غالب نے ''دستنبو'' اور بعض خطوں میں ارادی طور پر اس عہد کے کچھ واقعات پر یا تو پردہ ڈالا ہے یا پھر انہیں کچھ مسخ کرکے بیان کیا ہے۔ اس لیے قدیم تاریخی کتب کی طرح غالب کے خطوط کو بھی مستند تاریخی دستاویز کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ اس کے باوجود ان خطوط کی اہمیت اس میں ہے کہ انہیں اس عہد کے ایک قدآور دانشور، مفکر اور فنکار کی خودآگاہ شخصیت کی ذہنی اور جذباتی واردات کا مطالعہ کہا جاسکتا ہے اور اس کے واسطے سے اُس عبوری عہد کی نہایت دشوار اور پیچیدہ زندگی کی جھلکیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔

مئی ۱۸۵۷ء کے بعد لکھے ہوئے غالب کے مکاتیب کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ ذاتی نوعیت کے مکتوب، جن میں باغیوں کے حملے اور پھر انگریزی فوج کے حملے اور قبضے کے بعد مرزا غالب اور ان کے افراد خاندان پر جو کچھ بیتی اس کا بیان ہے۔ بہادر شاہ ظفر کے دربار سے سابقہ وابستگی اور شاہ کا سکہ کہنے کے الزام پر خوف و ہراس، بے گناہی ثابت کرنے کی تگ و دو۔ روزی روٹی کی فکر۔ گھر کی قیمتی اشیا فروخت کرکے گزر بسر کرنا۔ کمشنر کے یہاں حاضریاں، پنشن کے لیے جدوجہد، پارچے اور خلعت کی فکر وغیرہ۔

۲۔ ان گنت شاگردوں کے نام خطوں میں اصلاح کا سلسلہ جاری

رکھنا۔ مناسب مشورے دینا۔ زبان اور شعر و سخن کے نکات پر بحث کرنا۔

۳۔ دلّی کی تباہی، بے دریغ قتل و غارتگری، مسجدوں اور املاک کی ضبطی، عبرت ناک سزائیں، بڑے پیمانے پر عمارتوں کا انہدام، دلی کا آبادی سے خالی کرایا جانا۔ بابر و اکبر کے ورثا، اشرافیہ اور عام لوگوں کا جنگلوں میں گزر بسر کرنا۔ آخر آخر املاک کی واگزاری اور دلّی کی نوآبادکاری، شہر کی تعمیر نو کے منصوبے۔ انتظامیہ اور عدلیہ کا نیا نظام لکھنؤ اور بعض دوسرے شہروں کی تباہی اور تعمیر نو کا حال۔

اس تیسرے حصّے کے مکاتیب میں ایسی تحریریں ملتی ہیں جو عہد غالب کی بدلتی ہوئی معاشرت پر روشنی ڈالتی ہیں۔ یہاں غالب اس زندگی اور دلّی کے اُس بارونق معاشرہ کو بھی یاد کرتے ہیں جس کے نشانات اس ہنگامہ کے نتیجہ میں مٹ گئے تھے۔

تفتہ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''صاحب! تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا؟ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے۔ اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات بر و محبت در پیش آئے۔ شعر کہے۔ دیوان جمع کیے..... ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا نہ وہ اشخاص، نہ وہ معاملات نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط، بعد چند مدّت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہ مثل پہلے جنم کے ہے...

یعنی میں جس شہر میں ہوں اس کا نام بھی دلّی اور اس محلّہ
کا نام بھی بلّی ماروں کا محلّہ ہے لیکن ایک دوست اُس جنم
کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا''[۷]

ظاہر ہے کہ اس ناگہانی انقلاب کے نتیجے میں غالب شدید تنہائی کے عذاب سے گزر رہے تھے۔ بالکل اسی طرح کا خط جو محرومی اور اذیت کے احساس سے معمور ہے، وہ اپنے دوست علائی کو لکھتے ہیں۔

''اے میری جان! یہ وہ دلّی نہیں ہے جس میں تم پیدا
ہوئے ہو، وہ دلّی نہیں ہے جس میں تم نے علم تحصیل کیا۔
وہ دلّی نہیں ہے جس میں تم مجھ سے پڑھنے آیا کرتے
تھے۔ وہ دلی نہیں ہے کہ جس میں میں سات برس کی عمر
سے آتا جاتا ہوں۔ وہ دلّی نہیں ہے جس میں اکیاون
برس سے مقیم ہوں۔ ایک کیمپ ہے''[۸]۔

غالب کے ممتاز مقربوں اور دوستوں میں صدرالدین آزردہ، مصطفےٰ خاں شیفتہ، مولانا فضل حق خیرآبادی، حکیم احسن اللہ خان، حامد علی خاں، نواب تفضل حسین خاں، غلام فخرالدین خاں اور لال قلعے کے کئی شہزادگان جوان کے سرپرست تھے، کم وبیش سبھی داروگیر کا شکار ہوئے۔ کچھ کی سزائیں کم یا موقوف ہوگئیں اور کچھ ناکردہ گناہ سزائیں جھیلتے رہے۔ مرزا غالب نے ان سب کے آشوب وابتلا کا ذکر نہایت پُردرد لہجے میں کیا ہے۔

تاج برطانیہ کی نئی حکومت کے باوجود شہر میں غلّے کی ہوشربا گرانی جاری تھی۔ غالب کئی خطوں میں اس کا حوالہ دیتے ہیں:

''غلا گراں ہے۔ موت ارزاں ہے۔ میوے کے مول

اناج بکتا ہے۔ ماش کی دال آٹھ سیر، باجرہ سولہ سیر،
گیہوں تیرہ سیر، چنے سولہ سیر، گھی ڈیڑھ سیر ترکاری
مہنگی''[۳۳]۔

غالب کے خطوں کے مطابق ۱۸۵۸ء میں بھی اخبارات کی اشاعت جاری تھی لیکن خریدار نہ ہونے کے برابر تھے۔ شیونرائن آرام کے نام لکھتے ہیں:

''یہاں آدمی کہاں ہے کہ اخبار کا خریدار ہو؟ مہاجن
لوگ جو یہاں بستے ہیں وہ یہ ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ
گیہوں کہاں سستے ہیں۔ بہت سخی ہونگے تو جنس پوری
تول دیں گے۔ کاغذ (یعنی اخبار) روپے مہینے کا کیوں
مول لیں گے''[۳۴]۔

غالب کے بعض خطوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ دلّی میں دوسرے صناعوں کے ساتھ ساتھ مصور بھی خاصی تعداد میں آباد تھے۔ اپنے فن کے تئیں ان کا رویہ پیشہ ورانہ تھا۔ دوسرے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں نے ان کو دوبارہ شہر میں آباد کرانے میں کچھ ترجیحی سلوک روا رکھا۔ اس کا ثبوت بھی ملتا ہے کہ معزول ہونے کے بعد بھی بہادر شاہ ظفر آخری مغل حکمراں اور شاعر کی حیثیت سے نہ صرف مسلمان فرقے میں بلکہ غیر مسلموں میں بھی مقبول ومحبوب تھے۔

شیونرائن آرام نے کسی مصور کی بنائی ہوئی بہادر شاہ ظفر کی تصویر بھیجنے کی فرمائش، غالب سے کی۔ جواب میں لکھتے ہیں:

''بادشاہ کی تصویر کی یہ صورت ہے کہ اجڑا ہوا شہر، نہ
آدمی نہ آدم زاد۔ مگر ہاں دو ایک مصوروں کو آبادی کا حکم
ہوگیا وہ رہتے ہیں۔ سو وہ بھی بعد اپنے گھروں کے

لٹنے کے آباد ہوئے ہیں۔ تصویریں بھی ان کے گھروں سے لٹ گئیں۔ جو کچھ رہیں وہ صاحبان انگریز نے بڑی خواہش سے خرید لیں۔ ایک مصور کے پاس ایک تصویر ہے۔ وہ تیس روپے سے کم کو نہیں دیتا۔ کہتا ہے کہ تین تین اشرفیوں کو میں نے صاحب لوگوں کے ہاتھ بیچی ہیں تم کو دو اشرفی کو دونگا۔ ہاتھی دانت کی تختی پر وہ تصویر ہے۔ میں نے چاہا کہ اس کی نقل کاغذ پر اتار دے۔ اس کے بھی بیس روپے مانگتا ہے۔''[۱۱]

مرزا کے خطوں میں نئے انتظامِ حکومت اور عدلیہ کی کڑی نکتہ چینی ملتی ہے۔ کہیں کہیں مذاق بھی اڑاتے ہیں۔ اس سلسلے میں حافظ مموں والا واقعہ جو غالب نے لطیفہ کی شکل میں بیان کیا ہے، اکثر لوگوں کو یاد ہوگا۔ ایک خط میں یوسف مرزا کو لکھتے ہیں:

''نہ کوئی قانون ہے نہ قاعدہ ہے۔ نہ نظیر کام آئے نہ تقریر پیش جائے۔ ارتضیٰ خاں.... کی پوری دو سو روپے کی پنشن کی منظوری کی رپورٹ آگئی۔ اور ان کی دو بہنیں سو سو روپے پانے والیوں کو حکم ہوا کہ چونکہ تمہارے بھائی مجرم تھے تمہارا پنشن ضبط۔ بہ طریق ترحم دس دس روپے مہینہ تم کو ملے گا۔ ترحم یہ ہے تو تغافل کیا قہر ہوگا؟ میں خود موجود ہوں اور حکام صدر کا روشناس، پشم نہیں اکھیڑ سکتا''۔[۱۲]

اس خط کی تاریخ تحریر کے ٹھیک ایک سال بعد جولائی ۱۸۶۰ء میں جب مرزا غالب کی پنشن واگزاشت ہوئی تو یہ کوفت اور لہجہ کی تلخی بھی کم ہوگئی۔

دلی کے علاوہ دوسرے شہروں مثلاً لکھنؤ میں جو فتنہ وفساد ہوا وہ جلدی رفع ہو گیا۔ عمارتوں کا جو انہدام ہوا ان کی جگہ نئی تعمیرات شروع ہو گئیں۔ لیکن دلی میں یہ صورت حال نہیں تھی۔ غالب کو اس کا دکھ تھا۔ لیکن اگر تباہی کے بعد تعمیر کی بھی صورت نکلتی، اگر فساد کے بعد دلی میں ایسا امن بحال ہو جاتا کہ لوگ عزت اور عافیت کو محفوظ سمجھ کر چین سے رہتے تو غالب تباہی کا صدمہ بھی برداشت کر لیتے۔ یہ حقیقت پسندانہ احساس وشعور ان کے کئی خطوں میں نظر آتا ہے۔ میر مہدی مجروح کو ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''بھائی لکھنؤ میں وہ امن وامان ہے کہ نہ ہندوستانی عمل داری میں ایسا امن واماں ہوگا۔ نہ اس فتنہ وفساد سے پہلے انگریزی عمل داری میں یہ چین ہوگا۔ امرا اور شرفا کی حکام سے ملاقاتیں۔ بہ قدر رتبہ تعظیم وتوقیر۔ پنشن کی تقسیم علی العموم، آبادی کا حکم عام۔ لوگوں کو کمال لطف اور نرمی سے آباد کرتے جاتے ہیں''[۱۲]

جون ۱۸۶۰ء کے ایک خط میں میاں داد خاں سیاح کو لکھتے ہیں:

''لکھنؤ کی ویرانی پر دل جلتا ہے۔ مگر تم کو یاد رہے کہ وہاں بعد اس فساد کے ایک سکون ہوگا (بگاڑ کے بعد بناؤ) یعنی راہیں وسیع ہو جائیں گی۔ بازار اچھے نکل آئیں گے۔ جو دیکھے گا وہ داد دے گا۔

ان اقتباسات سے ظاہر ہے کہ غالب تباہی کے بعد شہر لکھنؤ کی تعمیر نو کے خیال اور امید سے خوش ہیں۔ وہ ناسٹیلجیا یا سہانے ماضی کی یادوں میں ڈوبے رہنا نہیں چاہتے۔ ایک ایسے نئے نظام، نئے معاشرے کا استقبال کرتے ہیں جو امن، عافیت

اور انسانی وقار کے تحفظ کی ضمانت دے سکے۔

تبدیلیاں تو دہلی میں بھی آرہی تھیں اور غالب انہیں دیکھ رہے تھے لیکن معاشی خستہ حالی، احباب واعزا کی جدائی اور تذلیل کا دکھ اور پنشن کی عدم بحالی کے سبب سے ان کے دل و دماغ پر مایوسی اور محزونی کی ایسی دھند چھائی تھی کہ وہ ان تبدیلیوں کے مفید اثرات کا ادراک و اظہار نہیں کر پا رہے تھے۔

ایک خط میں مرزا غالب دِلّی کے انہدام کے بعد شہر کی تعمیر نو کا ذکر بڑے جوش سے کرتے ہیں لیکن آخر تک پہنچ کر دِلّی والوں کی بربادی اور دوستوں کی جدائی کا احساس، ایک طنزیہ پیرایہ اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ خط یوسف مرزا کے نام ۱۸۵۹ء کا ہے:

> "یہاں دو سڑکیں دوڑتی پھرتی ہیں۔ ایک ٹھنڈی سڑک ایک آہنی سڑک (ریلوے لائن) محل ان کا الگ الگ۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ گوروں کا بارک بھی شہر میں بنے گا۔ اور قلعے کے آگے جہاں لال ڈگی ہے، ایک میدان نکالا جائے گا۔ جنوب کی دکانیں، بھیلیوں کے گھر، فیل خانہ، بلاقی بیگم کے کوچے کے دروازے سے قلعے کی خندق تک سوائے لال ڈگی اور دو چار کنوؤں کے آثار عمارت باقی نہ رہیں گے۔ مکان ڈھنے شروع ہو گئے ہیں۔ آج جاں نثار خاں کے چھتے کے مکان ڈھنے شروع ہو گئے ہیں۔ کیوں میں دِلّی کی ویرانی سے خوش نہ ہوں۔ جب اہل شہر نہ رہے شہر کو لے کر کیا چولھے میں ڈالوں۔؟"[۱۷]

مکاتیب غالب کے حوالے سے اُس عہد کی زندگی اور معاشرت کے جن پہلوؤں کا ذکر کیا گیا ان کے علاوہ بھی تہذیب وتمدن علوم وادب، فرد کی آزادی اور سماجی احتساب، عائلی زندگی، امرا اور عوام کے مشغلے، تفریح وتفنن کے ادارے، نظم حکومت اور اس کے شعبوں کی کارکردگی اور معاشرت کے بعض دوسرے پہلوؤں کے بارے میں مرزا غالب کے خطوں میں اشارے ملتے ہیں۔ لیکن صرف اشارے۔ ان کے حوالے سے گفتگو اندیشہ ہے کہ نتیجہ خیز نہیں ہوسکے گی۔

دانش وفکر اور علم وادب کے میدان میں عظیم کارنامے انجام دینے والی اور وقت سے کچھ پہلے پیدا ہونے والی اکثر ہستیاں تنہائی کے کرب کا شکار ہوتی ہیں۔ انہیں شدید احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنے اطراف وماحول میں اجنبی ہیں۔ کوئی انہیں سمجھ نہیں پارہا ہے۔ غالب کی ذاتی محرومیوں نے بھی ان کی تنہائی اور اداسی کو کچھ سوا کردیا تھا۔ اس کے مداوے کے لیے انہوں نے شراب اور مراسلہ نگاری کا سہارا لیا۔ ان کے خطوط کی جو تعداد ہے ان کے معاصرین میں کسی کے اتنے تو کیا اس کا دسواں حصہ بھی خطوط دستیاب نہیں ہوتے۔ مرزا غالب کے تلامذہ، احباب اور قدرشناس سارے ملک میں بکھرے ہوئے تھے۔ وہ انتہائی شوق اور لگن کے ساتھ ان سے مکاتبہ اور مکالمہ کرتے رہے۔ اور اس موثر وسیلے سے وہ اپنے باطنی اضطراب، اپنے اختراعی افکار، اپنی محرومیوں اور نارسائیوں اور اپنی روحانی واردات میں ان کو شریک کرتے رہے۔ اس طرح انہوں نے مذہب ونسل کی کسی تفریق کے بغیر خاص لوگوں سے دوستی اور یگانگت کا ایک مفید رشتہ قائم رکھا۔ سچ تو یہ ہے کہ نظر ہمیشہ خارجی زندگی کے شوروشر سے زیادہ داخلی زندگی کے آشوب پر مرکوز رہی، شاید ان کے مکاتیب کی معنویت اسی سچائی میں پوشیدہ ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ تحقیق و تنقید۔ یوسف سرمست ۱۹۹۹ء، حیدر آباد، ص ۸۷

۲۔ اوراق معانی، تنویر احمد علوی اردو اکیڈمی دہلی، ۱۹۹۲ء، ص ۱۶۶

۳۔ ایضاً ص ۲۲۳،

۴۔ ایضاً ص ۴۷۔

۵۔ ایضاً ص ۷۳

۶۔ ایضاً ص ۶۴

۷۔ غالب اور انقلاب ۱۸۵۷ء، سید معین الرحمٰن، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی، ۱۹۸۸ء ص ۲۹۱۔۲۹۰

۸۔ ایضاً ص ۲۶۷

۹۔ ایضاً ص ۲۸۲

۱۰۔ ایضاً ص ۲۸۳

۱۱۔ ایضاً ص ۲۸۳

۱۲۔ ایضاً ص ۲۶

۱۳۔ ایضاً، ۲۸۱

۱۴۔ ایضاً ص ۲۸۰

غزلیاتِ غالبؔ

(اردو)

مترجم: ڈاکٹر یوسف حسین خاں

غالبؔ کی اردو غزلوں کے انتخاب کے کئی انگریزی ترجمے شائع ہو چکے ہیں، لیکن یہ ترجمہ ایک اسکالر کا ہے، جو غالبؔ کا مزاج شناس ہے۔ اس لیے ہمارا یقین ہے کہ اب تک کے تمام انگریزی ترجموں میں یہ ترجمہ سب سے زیادہ بہتر اور مستند ہے۔ ترجمے کے ساتھ اصل غزلیں بھی شامل کی گئی ہیں۔

صفحات : ۴۴۰

قیمت : ۹۵ روپے

شریف حسین قاسمی

خطوط غالب میں قاطع برہان کا قضیہ

غالب کو اپنی زندگی میں تین ایسے امور سے سابقہ پڑا جنہیں وہ مرتے دم تک بھلا نہ سکے اور جن کی وجہ سے وہ پیہم مضطرب رہے۔ مزید برآں، ان امور کی وجہ سے ان کے قلم سے بعض ایسے جملے بھی نکلے، علمی، ادبی اور اخلاقی بنیادوں پر جن کا دفاع ناممکن ہے۔ ان امور میں ایک ان کی پنشن کا مسئلہ تھا۔ دوسرا کلکتے کا معرکہ اور تیسرا قاطع برہان کا قضیہ۔ غور کیجیے تو پتا چلتا ہے کہ تینوں واقعات ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ نہ پنشن کا معاملہ درپیش ہوتا، نہ غالب کلکتے جاتے اور وہاں ادبی معرکہ رونما ہوتا جس میں مرزا محمد حسن قتیل (م ۱۲۳۲ھ/۱۸۱۷ء) اور نورالعین واقف (م ۱۱۹۵ھ/۸۰-۱۷ء) کے کلام کی سند پر ان کے کلام میں چند الفاظ کے استعمال کو ہدف تنقید بنایا گیا اور نہ غالب قاطع برہان لکھ کر خسرو کے سوا، دیگر تمام ہندستانی فارسی شعرا و فضلاء کی 'بہ زعم خود' علمی بے اعتباری دکھا کر اپنی جھلاہٹ دور کرتے اور غصہ ٹھنڈہ کرتے۔

اس وقت صرف قاطع برہان سے متعلق مکاتیب غالب کی روشنی میں گفتگو

منظور ہے۔ یہاں اس امر کا ذکر ضروری ہے کہ غالب کے فارسی اردو خطوط میں قاطع برہان اور اس کے دفاع و مخالفت میں لکھی جانے والی کتابوں کا متعدد بار ذکر آیا ہے۔ یہ ذکر فارسی خطوط میں کم اور اردو خطوط میں زیادہ اور مفصل تر ہے۔

قاضی عبدالودود صاحب نے ''قاطع برہان ملقب بہ درفشِ کاویانی و رسائل متعلقہ''[۵۴] میں اپنے ایک صفحے کی پیشگفتار میں لکھا ہے کہ ''دوسری جلد میں غالب کے وہ حواشی ہوں گے جو انہوں نے قاطع برہان وغیرہ پر لکھے تھے اور بعض خط بھی جن کا تعلق قاطع برہان سے ہے'' یہ دوسری جلد شائع نہ ہو سکی۔ غلام رسول مہر صاحب نے اپنی اہم تالیف ''غالب'' میں تصانیف کے عنوان سے چودھویں باب میں قاطع برہان کے تعارف کے ضمن میں اس کتاب اور اس کی وجہ سے پیش آنے والے ان واقعات کا تفصیل سے ذکر نہیں کیا جن کا بیان خطوط غالب میں محفوظ ہے۔

غالب نے اپنے خطوط میں کئی بار لکھا ہے کہ وہ انگریزوں کے خلاف ہندستانیوں کی جدوجہد کے دوران خانہ نشین ہو گئے تھے۔ ہندستانیوں کی شکست کے بعد انگریزوں نے دہلی والوں پر جو مظالم ڈھائے، اس کا دردناک حال بھی دستنبو اور خطوط غالب میں موجود ہے۔ غالب کے دل و دماغ پر انگریزوں کی درندگی کا جو اثر پڑا، اس کے بارے میں ان کا بیان ہے:

> ''میرا حال سوائے میرے خدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا، آدمی کثرتِ غم سے سودائی ہو جاتے ہیں۔ عقل جاتی رہتی ہے۔ اگر اس ہجوم غم میں میری قوت متفکرہ میں فرق آ گیا ہے تو کیا عجب ہے! بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے''[۵۵]۔

ذہن و فکر کی ایسی پسپائی اور پھر تنہائی کے عالم میں غالب کے پاس صرف دو

کتابیں تھیں۔ ایک برہان قاطع اور دوسری دساتیر جسے انہوں نے اپنا ''ایمان وحرز جاں''[۳] بنا رکھا تھا۔ ان دونوں کتابوں کی مدد اور راہنمائی میں غالب نے دستنبو مکمل کی[۴]۔ اس کے بعد انہوں نے برہان قاطع کا بالاستیعاب مطالعہ شروع کیا۔ برہان قاطع ایک مطلوب لغت ہے۔ اور بہ قول غالب: اس کا مصنف قسمت کا اچھا ہے[۵]۔ مسلمان اِس کے قول کو آیت اور حدیث جانتے ہیں اور ہندو اس کے بیان کو مطالب مندرجۂ بید کے برابر جانتے ہیں[۶]۔

عبدالغفور سرور کے نام مارچ ۱۸۵۹ کے اپنے ایک خط میں غالب نے اطلاع دی ہے کہ:

> جن لوگوں کے محقق ہونے پر اتفاق ہے۔ جمہور کو، ان کا حال کیا گزارش کروں، ایک ان میں صاحبِ برہانِ قاطع ہے۔ اب اِن دنوں، میں برہانِ قاطع کو دیکھ رہا ہوں اور اس کے فہم کی غلطیاں نکال رہا ہوں۔ اگر زیست باقی ہے تو ان نکات کو جمع کر کے، اس نسخے کا نام ''قاطع برہان'' رکھوں گا[۷]۔

برہان قاطع کے مطالعے کے بعد وہ اپنے تاثرات ایک دوسرے خط میں سرور ہی کو لکھتے ہیں:

> ''اس واماندگی کے دنوں میں چھاپے کی برہان قاطع میرے پاس تھی[۸]۔ اس کو میں دیکھا کرتا تھا، ہزار ہا لغت غلط، ہزار ہا بیان لغو، عبارت پوچ، اشارات پادر ہوا۔ میں نے سودوسو لغت کے اغلاط لکھ کر ایک مجموعہ بنایا ہے اور قاطع برہان اس کا نام رکھا ہے''[۹]

غالب نے اپنے خطوط میں برہان قاطع میں املا و معنی کی غلطیوں کا مذاق اڑایا ہے اور مزید لکھا ہے کہ "برہان قاطع والا تصحیف میں مبتلا ہے"[۳۳]

برہان قاطع میں غالب کو جو اشکال اور اشتباہات نظر آئے، ان کے بارے میں وہ مزید وضاحت سے لکھتے ہیں کہ:

جامع لغات نہ بہ حسنِ معنی سری دارد و نہ بر جوہر لفظ نظری۔ رعایتِ لفظ سومین و چارمین از ہر لغت و افزودنِ شمارۂ لغات بہ ہر صورت، پیشنہاد و ہمتِ والای اوست، نہ دران روش از برہم خوردنِ قاعدۂ استخراج پروا دارد و نہ درین خواہش از اندراج یافتن مہملات ننگ۔ ہر مصدر لغتی است۔ و ہر کلمہ مشتق لغتی، صدرہ آن بینی کہ مصدری را از مشتقات جلوہ داد و بہ افزودن ہای موحدۂ زایدہ سرتاسر دگر بارہ نوردِ از ہم گشاد۔ چون بدین مایہ پرگویی نیز دلش از غصہ خالی نشد، نقد روی دستِ ہای عربی و کافِ تازی را دوبارہ در مشہدِ ہای پہلوی و کاف فارسی بر طبقِ اظہار نہاد، از قلب و امالہ و مدّ و قصر و سکون و حرکت و تخفیف و تصحیف و پارسی و عربی و مفتوح و مکسور قطع نظر است، ہر لفظ بہ اندک تبدل و تغیر لغتی دیگر و ہر لغت را بیانی دیگر است۔ کاش کوشش ہمین باشد و آفریدن لفظ نہ آئین باشد۔ بیشتر الفاظ غریب می آرد و آن چہ نگاشتہ اند، می نگارد۔ چنانکہ کمال اسمٰعیل را خلّاق المعانی لقب است اگر این بزرگوار را خلّاق

الالفاظ خوانند، چہ عجب است؟ جز لغتی چند کہ از دساتیر
آوردہ یا دیگر لغاتِ اندک کہ دران تصرف بہ کار نبردہ،
ہمہ آشوب چشم است و آزار دل[۱۶]۔

غالب نے برہان قاطع میں وارد جن اشتباہات کا ذکر کیا ہے، حالی بھی اس کا خلاصہ یادگارِ غالب میں ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں، حالی اپنے استاد غالب کی مدافعت میں ایک ایرانی فرہنگ نگار صاحب برہان جامع کی برہان قاطع پر تنقید بھی نقل کرتے ہیں اور لکھتے ہیں:

(فرہنگ ناصری، میں ایک جگہ صاحب برہان جامع 'جو
کہ ایرانی ہے') کا قول برہان قاطع کے باب میں نقل
کرتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ "برہان قاطع میں
لغات بغیر سند اور شواہد کے ذکر کیے گئے ہیں، ان پر
اعتبار نہ کرنا چاہیے۔ اس میں کنایات کو بھی علیحدہ لغت
قرار دیتا ہے اور سریانی، عبرانی وترکی وژند وپاژند کے
غیر مستعمل لغات کے بیان میں اور ایک ایک لغت کو بار
بار مختلف صورتوں سے ذکر کرنے میں، طویل تطویل
لاطائل کرتا ہے[۱۷]

غالب نے قاطع برہان کے مسودے پر کئی بار نظر ثانی کی۔ وہ جب بھی اس پر نگاہ ڈالتے تھے، اس میں ترمیم کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ اس طرح اس کے کئی مسودے تیار ہو گئے تھے اور ہر بار نظر ثانی کے بعد مسودے کی صورت بدل جاتی تھی جس کی وجہ سے مسودہ کی تحریر مغشوش ہو جاتی تھی، جب نواب صاحب نے اس کی ایسی نقل تیار کر لی جس میں کوئی غلطی نہیں تھی تو غالب نے یہ تمام مسودے پھاڑ

ڈالے[۸۱]۔ اور اس طرح ان کے بقول انہوں نے بہت خون جگر کھا کر فارسی تحقیق کو اس پائے پر پہنچایا ہے کہ اس سے بڑھ کر متصور نہیں''[۸۲]

قاطع برہان ۱۲۷۶/۱۸۶۰ میں مکمل ہوئی[۸۳]۔ غالب نے خود محمد حسین تبریزی صاحب برہانِ قاطع کی اس گوشمالی کے مکمل ہونے کی تاریخ کہی:

یافت چون گوشمال زین تحریر　　آن کہ برہانِ قاطعش نام است
شد مسمّٰی بہ قاطعِ برہان　　درسِ الفاظ سالِ اتمام است

غالب نے برہانِ قاطع کی غلطیوں کی نشاندہی کیوں کی؟ اس کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ:

> وہ ایک استاد بھی ہیں، اپنے شاگردوں اور پیروکاروں کی راہنمائی کرتے ہیں۔ انہیں ترس آیا کہ ان کے شاگرد اس لغت میں اشتباہات سے کہیں ٹھوکر نہ کھائیں، اس لیے انہوں نے یہ وضاحت ضروری سمجھی[۸۴]۔

تقریباً یہی بات انہوں نے قاطع برہان میں بھی لکھی ہے کہ:

> چون آن سفینہ (برہان ساطع) گفتار ہای نادرست داشت و مردم را از راہ می برد و من آیین آموزگاری داشتم، بر پیروان خودم دل سوخت، جادہ نمایان ساختم تا بی راہہ نپویند[۸۵]

برہانِ قاطع میں درج بالا نوعیت کی غلطیاں پکڑنے اور اس میں بے ربطیاں ظاہر کرنے کے بعد غالب اس کے مؤلف کے بارے میں طنزیہ انداز میں پوچھتے ہیں:

خدا پرستان! از بہر خدا این عربی مُغبم فارسی مدان نمی پرسم کہ کیست؟ می پرسم کہ چیست؟[۲۲]

ایک دوسری جگہ پھر صاحب برہانِ قاطع پر برستے ہیں اور بذلہ سنجی کے ساتھ ظریفانہ انداز میں لکھتے ہیں:

چون شناسائی حقیقت جوہرِ لفظ ندارد، فرہنگ چرا می نگارد؟ بوریا می بافت، رسن می تافت، ہیزم می فروخت، گلخن می افروخت۔[۲۳]

اور اس طرح انہوں نے قاطع برہان میں وارد غلطیوں کی نشاندہی کی اور اپنی ''تکمیل'' کے بعد اپنے ''تلامذہ کی تہذیب'' کا فریضہ انجام دیا[۲۴]۔
لیکن برہان قاطع میں وہ ایک دوسرا ہی جواب دیتے ہیں کہ:

عزیزی بہ من گفت کہ ترا از تخطیۂ جامعِ برہان قاطع غرض چیست؟ گفتم اعلانِ حق، قلب از جید و جعل از اصل جدا می کنم، چنانچہ مرشدِ کامل تفرقۂ وساوسِ شیطانی از خطراتِ رحمانی خاطر نشانِ طالبانِ راہ حق می کند، اگر طبق سلیم داری، بپذیر و اگر تردید کلام می کنی، ناسزا مگوی و دشنام مدہ و حرفہای سود مند خرد پذیر در ضمیر فراہم آر وعبارتی ترکیب دہ کہ اگر فصیح نبود، باری سوالِ دیگر جوابِ دیگر نباشد، من دادِ سخن دادم، از دروغ می رنجم، از آن راہ جامع برہانِ قاطع را زشت می گویم، آن ہم ظریفانہ و حریفانہ بہ بذلہ ولطیفہ، نہ مخنثانہ و سفیہانہ بہ فحش و دشنام[۲۵]

(ایک عزیز نے مجھ سے سوال کیا کہ تجھ کو برہان قاطع کے مصنف کی غلطیوں کی نشاندہی سے کیا غرض ہے؟ میں نے کہا کہ اعلانِ حق، کھوٹے کو کھرے سے اور جعل کو اصل سے الگ کرتا ہوں۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک مرشدِ کامل شیطانی وسوسے اور رحمانی خیالات کے فرق کو راہِ حق کے سالکوں کے دلوں میں راسخ کرتا ہے۔ اگر طبع سلیم ہو تو یہ بات قبول کرو اور اگر تردید کلام مقصود ہو تو برا بھلا نہ کہو اور گالی پر نہ اترو۔ ایسی مفید باتیں جو عقل قبول کرے، دل میں بٹھاؤ اور ایسے انداز میں پیش کرو کہ سوال دیگر، جواب دیگر کا مصداق نہ ہو۔ مجھے سخن کا بڑا پاس ہے جھوٹ سے چڑتا ہوں، اسی بنا پر جامع برہان کو برا کہتا ہوں، لیکن میرا انداز ظریفانہ اور حریفانہ ہے، بذلہ گوئی اور لطیفہ سنجی سے کام لیتا ہوں، نامردوں اور کمینوں کی طرح گالی اور فحش کلامی پر نہیں اتر آتا)

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے، قاطع برہان ۱۲۷۶ھ میں مکمل ہوئی لیکن تقریباً دو برس بعد ۱۲۷۸/۱۸۶۲ میں اس کی اشاعت کی نوبت آئی۔ نواب یوسف علی خان والی ریاست رام پور نے اس کی طباعت کے لیے ۲۰۰ روپے دیے تھے تب پہلا مسودہ صاف ہو کر شائع کرایا گیا تھا۔ اس کے برخلاف، غالب کے ایک بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسے نولکشور نے شائع کیا ورنہ خود غالب کے بہ قول: اگر وہ اسے شائع کرنے کا بیڑہ نہ اٹھاتے تو قاطع برہان کا مسودہ یا تو ردی والا لے جاتا اور یا پھر کوئی سرمہ فروش ان کی پڑیاں بناتا۔

غالب نے قاطع برہان کی اشاعت کے بعد اس میں بعض مضامین و فوائد کا اضافہ کیا، بعض اشتباہات رفع کیے، ایک نیا دیباچہ لکھا، اور اسے ایک بار پھر درفش کاویانی کے نام سے شائع کرایا[۹]۔

اپنی قاطع برہان کے بارے میں غالب کا خیال تھا کہ: کئی باتیں جس شخص

میں جمع ہوں گی، وہ اس کو مانے گا۔ پہلے تو عالم ہو، دوسرے فن لغت کو جانتا ہو، تیسرے فارسی کا علم ہو اور اس زبان سے اس کو لگاؤ ہو۔ اساتذہ سلف کا کلام بہت کچھ دیکھا ہو اور کچھ یاد بھی ہو، چوتھے منصف ہو، ہٹ دھرم نہ ہو، پانچویں طبع سلیم و ذہن مستقیم رکھتا ہو، معوج الذہن اور کج فہم نہ ہو، نہ یہ پانچ باتیں کسی میں جمع ہوں گی اور نہ کوئی میری محنت کی داد دے گا[۲۹]۔

بہرحال غالب کی یہ پانچ شرائط بہت سے فضلا پوری نہیں کر سکے اور قاطع برہان جو غالب کی نظر میں گنج اسرار حکمت تھی[۳۰] جیسے ہی شائع ہوئی تو بہ قول غالب: ''گویا باسی کڑھی میں ابال آیا۔ لکھنا کیا تھا کہ سہامِ ملامت کا ہدف ہوا۔ ہے ہے، یہ تنک مایہ، معارضِ اکابر سلف ہوا''[۳۱]۔

اور بہ قول حالی: اس کتاب کا شائع ہونا تھا کہ ہر کس و ناکس مرزا کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گیا[۳۲]۔

کسی نے خود کتاب کے نام قاطع برہان کی ترکیب پر اعتراض کیا جس کا جواب غالب نے یہ دیا کہ: حضرت برہانِ قاطع و قاطع برہان ایک نمط ہے۔ برہانِ قاطع نے کیا لٹھا، نینو میں سکھ قطع کیا ہے جو آپ نے اس کو قاطع لقب دیا ہے۔ برہان جب تک غیر کی کسی برہان کو قطع نہ کرے گی، کیوں کر برہانِ قاطع نام پائے گی۔ برہانِ قاطع کی صحت میں جتنی تقریر کیجیے گا، وہ قاطع برہان کی صحت کے ثبوت کے کام آئے گی[۳۳]۔

بہرحال قاطع برہان کے رد میں محرق قاطع، قاطع قاطع، مؤید برہان، ساطع برہان وغیرہ چند رسالے لکھے گئے[۳۴]۔ حالی کی نگاہ میں ان رسائل کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ:

جو رسالے قاطع برہان کے جواب میں لکھے گئے ہیں

جب ان کو سرسری نظر سے دیکھا جاتا ہے تو مرزا کے
اعتراضوں کے اکثر جواب بہت صحیح معلوم ہوتے ہیں۔
ہر ایک مجیب برہان کی تائید اس طرح کرتا ہے کہ جس
طرح صاحب برہان نے لغت کی تحقیق کی ہے، اسی
طرح فرہنگ جہانگیری، یا فرہنگ رشیدی، یا سراج
اللغات، یا مؤید الفضلاء، یا ھفت قلزم، یا کسی اور
فرہنگ میں لکھا ہے۔ اور اس سے بادی النظر میں
صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کا اعتراض غلط ہے۔ مگر
جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ فارسی لغات کی اکثر فرہنگیں
ہندوستاں میں لکھی گئی ہیں، اور جو فرہنگ سب سے پہلے
لکھی گئی تھی پچھلوں نے زیادہ تر اسی کا تتبع کیا ہے؛ تو
کسی مجیب کے جواب کی کچھ وقعت باقی نہیں رہتی[۲۲]۔

حالی نے اطلاع دی ہے کہ غالب نے قاطع برہان کے جواب میں لکھے جانے والے فارسی کے ایک رسالے کے مؤلف پر ازالۂ حیثیت عرفی کی نالش بھی کی تھی۔ اس مقدمے میں جب کامیابی کی امید نہیں رہی تو راضی نامہ داخل کر دیا اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ یہ فارسی رسالہ فحش و دشنام سے پُر تھا۔ عدالت نے دلّی کے بعض اہل علم کو اس کی وضاحت کے لیے بلایا تھا کہ جو فقرے مدعی نے اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کیے ہیں، آیا ان سے فی الواقع فحش و دشنام مفہوم ہوتا ہے یا نہیں؟ ان حضرات نے ملزم کو سزا سے بچانے کے لیے ان فقروں کے ایسے معنی بیان کیے جن سے ملزم پر الزام عائد نہیں ہوا[۲۳]۔ ظاہر ہے مقصد یہ رہا ہوگا کہ یہ معاملہ طول نہ پکڑے۔ حالی کے بقول جب غالب سے پوچھا گیا کہ ان لوگوں نے آپ کے

برخلاف شہادت کیوں دی تو غالب نے اس کے جواب میں اپنا یہ شعر پڑھا:

بہ ہر چہ در نگری جز بہ جنس مائل نیست

عیار بی کسی من شرافت نسبی ست[۲۷]

(جس چیز پر بھی نگاہ ڈالوگے وہ اپنی ہم جنس کے علاوہ کسی دوسری طرف مائل نہیں، میری بے کسی کی قیمت میری نسبی شرافت ہے)

بہ ظاہر یہ معاملہ یہیں ختم ہوگیا، لیکن کچھ مدت بعد غالب کے ساتھ لوگوں نے نہایت نازیبا اور غیر شرافت مندانہ سلوک شروع کر دیا۔ انہیں گمنام خط لکھنے شروع کر دیے۔ جن میں غالب کی شراب نوشی اور بدمذہبی وغیرہ پر سخت نفرین و طعن وملامت کی جاتی۔ ان خطوط میں حتیٰ کہ فحش گالیاں تک لکھی ہوتی تھیں۔ اس غیر انسانی رویے کی وجہ سے "ان دنوں میں مرزا کی عجب حالت تھی، نہایت مکدّر اور بے لطف رہتے تھے اور جب چٹھی رساں ڈاک لے کر آتا تھا تو اس خیال سے کہ مبادا کوئی اسی قسم کا خط نہ آیا ہو، ان کا چہرہ متغیر ہو جاتا تھا۔ انہی دنوں میں حالی کا دہلی آنا ہوا۔ وہ غالب سے ملنے گئے۔ غالب کھانا کھا رہے تھے۔ حالی کو گمنام خطوں کے معاملے کی اطلاع نہیں تھی۔ ڈاکیا لفافہ دے کر چلا گیا۔ غالب نے لفافے کی بے ربطی اور کاتب کی اجنبیت سے اندازہ لگالیا کہ یہ کسی مخالف کا ویسا ہی گمنام خط ہے جیسے پہلے آتے رہے ہیں۔ انہوں نے لفافہ حالی کو دے دیا اور کہا کہ اسے کھول کر پڑھو۔ یہ خط فحش و دشنام سے بھرا ہوا تھا۔ غالب نے پوچھا: کس کا خط ہے اور کیا لکھا ہے؟ حالی کیا بتاتے، انہوں نے تامل کیا تو غالب نے یہ خط ان کے ہاتھ سے چھین لیا اور اسے اول سے آخر تک خود پڑھا۔ اس میں ایک جگہ ماں کی گالی بھی لکھی ہوئی تھی[۲۸]۔ غالب کی بذلہ سنج طبیعت جوش میں آئی اور اس نہایت نازک اور امتحان کی گھڑی میں وہ مسکرائے اور انسانی نفسیات کے ایک اہم پہلو کی اس طرح وضاحت کی: اس الو کو گالی

دینی بھی نہیں آتی۔ بڈھے یا ادھیڑ آدمی کو بیٹی کی گالی دیتے ہیں تا کہ اس کو غیرت آئے، جوان کو جورو کی گالی دیتے ہیں، کیوں کہ اس کو جورو سے زیادہ تعلق ہوتا ہے، بچے کو ماں کی گالی دیتے ہیں کہ وہ ماں کے برابر کسی سے مانوس نہیں ہوتا۔ یہ قرم ساق جو بہتر برس کے بڈھے کو ماں کی گالی دیتا ہے، اس سے زیادہ کون بے وقوف ہوگا؟"[۳]

جس زمانے میں گمنام اور نازیبا خطوط جن میں ان کے اعمال و افعال پر نفرین وملامت کی جارہی تھی، غالب کو بھیجے جارہے تھے، اس وقت ان کی ذہنی کیفیت کی غمازی اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ حالی نے انہیں یہ تحریری درخواست پیش کی کہ "وہ کھڑے ہوکر یا بیٹھ کر یا ایما و اشارے سے، غرض جس طرح ہو سکے نماز پنج گانہ کی پابندی اختیار کریں، اگر وضو نہ ہو سکے تو تیمم ہی سہی، مگر نماز ترک نہ ہو" یہ یاد رہے کہ ان خطوط میں "ان کے اعمال و افعال پر بہت نازیبا طریقے سے نفرین وملامت" کی جارہی تھی۔ اور بازاریوں کی طرح کھلم کھلا گالیاں" لکھی جارہی تھیں۔ اس صورت حال کے پیش نظر غالب کا حالی کو یہ جواب ان کے دکھی دل کی ایسی فریاد ہے جس سے حتی شقی القلب پڑھنے والا بھی لرز کر رہ جائے گا۔ وہ اپنی قابل رحم حالت کی ان الفاظ میں ترجمانی کرتے ہیں:

> "ساری عمر فسق و فجور میں گذری؛ نہ کبھی نماز پڑھی، نہ روزہ رکھا، نہ کوئی نیک کام کیا، زندگی کے چند انفاس باقی رہ گئے ہیں: اب اگر چند روز بیٹھ کر، یا ایما و اشارے سے نماز پڑھی؛ تو اس سے ساری عمر کے گناہوں کی تلافی کیوں کر ہو سکے گی؟ میں تو اس قابل ہوں کہ جب مروں میرے عزیز اور دوست میرا منھ کالا کریں، اور میرے پاؤں میں رسّی باندھ کر شہر کے

تمام گلی کوچوں اور بازاروں میں تشہیر کریں، اور پھر شہر
سے باہر لے جا کر کتوں، اور چیلوں، اور کووں کے
کھانے کو (اگر وہ ایسی چیز کھانا گوارا کریں) چھوڑ
آئیں۔ اگرچہ میرے گناہ ایسے ہیں کہ میرے ساتھ
اس سے بھی بدتر سلوک کیا جائے؛ لیکن اِس میں شک
نہیں کہ موحد ہوں۔ ہمیشہ تنہائی اور سکوت کے عالم میں
یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں "لا الہ الا اللہ"
لا موجود الا اللہ" "لا موثر فی الوجود الا اللہ"[۲۲]

غالب اس لے دے سے نہ صرف بوکھلا گئے، بلکہ جھنجھلا گئے۔ وہ لازمی طور پر جانتے تھے کہ ہندستان میں تالیف ہونے والی فارسی فرہنگیں اپنا ایک خاص اہم اور امتیازی مقام رکھتی ہیں۔ اسی وجہ سے یہ آج تک علما و فضلائے فارسی کا مرجع ہیں، لیکن انہوں نے محمد حسین تبریزی صاحب فرہنگ برہانِ قاطع کے ساتھ ساتھ دیگر تمام فرہنگ نویسوں کی بھی خبر لینی شروع کردی۔ انہوں نے منشی کیول رام ہشیار سے اپنے دل کی بھڑاس یوں نکالی:

جتنی فرہنگیں اب موجود ہیں، نام ان کے کہاں
تک لوں، مشہور و غیر مشہور، کچھ کم سو رسالے ہوں
گے۔ ان سب رسالوں کے جامع ہندی ہیں۔ کوئی اہل
زبان نہیں ہے۔ اشعارِ اساتذۂ ایران کو مأخذ ٹھہرا کر
جو لغات ان کی نظم میں دیکھے، بہ مناسبت مقام ان
لغات کے معنی لکھ دیے۔ استنباطِ معنی کا مدار قیاس پر، یہ
میں نہیں کہتا کہ قیاس ان کا سراسر غلط، میرا قول یہ ہے کہ

کمتر صحیح اور بیشتر غلط[۲۲]۔

اور پھر ضیاء الدین ضیا کو بتایا:

۸۰۰ یا ۹۰۰ ہجری میں ہوسناک لوگ فارسی کے فرہنگ لکھنے پر متوجہ ہوئے، نہ ایک نہ دو، بلکہ ہزار دو ہزار فرہنگیں فراہم ہو گئیں۔ یہاں تک کہ قتیل نو مسلم لکھنوی اور غیاث الدین ملاّئے مکتب دار رام پوری[۲۳] اور کوئی روشن علی جونپوری[۲۴] اور کہاں تک کہوں، کون کون، جس کے جی میں آئی وہ متصدیِ تحریر قواعد انشا ہو گیا[۲۵]۔

ضیاء الدین ضیا ہی کو ایک دوسرے خط میں دیگر ہندستانی فرہنگ نویسوں کے غیر عالمانہ رویّے کے بارے میں اطلاع دی، جو بہر حال حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ لکھتے ہیں:

اب جو میاں اُنجو[۲۶] اور عبدالرشید[۲۷] اور ٹیک چند[۲۸] اور آرزو[۲۹] رسائلِ قواعدِ فارسی تصنیف کر گئے ہیں، اس کے سوا کہ قواعدِ منضبطۂ عربی پر منطبق کر دیا ہے، اور کیا کمال کیا ہے؟[۳۰]

غالب ہندستانی فرہنگ نگاروں سے بے جا طور پر ناراض تھے۔ ان کے بارے میں اتنا کچھ برا بھلا لکھنے کے باوجود، ان کے دل کی کدورت ختم نہیں ہوئی، اور انہوں نے مرزا رحیم بیگ کے نام اپنے ایک خط میں فرہنگ نویسوں کا پھر خاکہ اڑایا:

فرہنگ لکھنے والے جتنے گذرے ہیں، سب ہندی نژاد ہیں۔ ہاں علم صرف ونحو عربی میں بہ قدر تحصیل

مسلّم اور استاد ہیں۔ علم صرف و نحو کی کتب درسی موجود ہیں، جس نے چاہا ہے اس نے استاد سے ان کتب کو پڑھ لیا ہے۔ فارسی کی جو فرہنگیں حضرات نے لکھی ہیں، مطالب مندرجہ کس اصول پر منضبط کیے ہیں اور اس کا علم کس استاد سے حاصل کیا ہے؟ آخر۔ مقاصد صرف و نحو عربی بھی تو صرف مطالعۂ کتب سے نہیں نکالے ہیں، پہلے تعلیم و تعلم ہے، پھر کتب قواعد کے جا بہ جا حوالے ہیں۔ قواعد فارسی کا رسالہ اہلِ زبان میں سے کس نے لکھا ہے اور ان ہوس پیشہ فرہنگ لکھنے والوں نے وہ رسالہ کس فاضل عجم سے پڑھا ہے؟.....[۳۵]

رحیم بیگ ہی کو اس ضمن میں پھر لکھتے ہیں:

رہے فرہنگ لکھنے والے، خدا ان کے پیچ سے نکالے، اشعار قدما آگے دھر لیے اور اپنے قیاس کے مطابق چل دیے، وہ بھی نہ کوئی ہم قدم، نہ کوئی ہمراہ بلکہ سو بہ سو پراگندہ و تباہ، رہنما ہو تو راہ بتائے، استاد ہو تو شعر کے معنی سمجھائے۔ نہ آپ شیرازی نہ استاد اصفہانی، زہے رگ گردن و خبط دعویٔ زبان دانی، میرا یہ قول خاص ہے، نہ عام ہے۔ مجموع فرہنگ نگاروں کے محقق ہونے میں کلام ہے۔ یہ کیا بات ہے کہ جامع برہان کا مآخذ فرہنگ رشیدی و جہانگیری ہے۔ عبدالرشید کی کیا شیخی اور میاں انجو میں کیا پیری ہے؟ قطب شاہ و جہانگیر کے

عہد میں ہونا اگر منشاءِ برتری ہے تو بے چارہ جعفر زٹلی
بھی فرخ سیری ہے۔
جتنی فرہنگ اور جتنے فرہنگ طراز ہیں، یہ سب
کتابیں اور یہ سب جامع مانندِ پیاز ہیں۔ تو یہ تو اور لباس
در لباس، وہم در وہم اور قیاس در قیاس، پیاز کے چھلکے
جس قدر اتارتے جاؤ گے چھلکوں کا ڈھیر لگ جائے گا۔
مغز نہ پاؤ گے۔ فرہنگ لکھنے والوں کے پردے کھولتے
چلے جاؤ، لباس ہی لباس دیکھو گے، شخص معدوم،
فرہنگوں کی ورق گردانی کرتے رہو، ورق ہی نظر آئیں
گے، معنی موہوم..... فرہنگ نویسوں کا قیاس معنی لغاتِ
فارسی میں نہ سراسر غلط ہے، البتہ کمتر صحیح اور بیشتر غلط
ہے۔[۲۱]

غالب برہانِ قاطع کے مصنف محمد حسین تبریزی کا مذاق اڑانے میں حد سے بڑھ گئے ہیں۔ اگر یہ صحیح بھی ہے کہ اس نے اپنی فرہنگ میں ٹھوکریں کھائی ہیں اور غالب اس کی غلطیاں پکڑنے میں حق بہ جانب ہیں، تب بھی جن الفاظ اور جس تیور سے غالب نے اس کا ذکر کیا ہے وہ نہ اخلاقاً درست ہے اور نہ علمی و ادبی دنیا میں جائز۔ مرزا رحیم بیگ کے نام ایک خط میں وہ صاحب برہان قاطع کے خلاف اس طرح دشنام طرازی کرتے ہیں:

خصوصاً دکنی تو عجب جانانہ ہے، لغو ہے، پوچ ہے، پاگل
ہے، دیوانہ ہے۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ ہائے اصلی
کیا ہے اور ہائے زائدہ کیا ہے۔[۲۲]

صاحب برہانِ قاطع کے خلاف غالب نے تقریباً اسی طرح کے نازیبا الفاظ منشی کیول رام ہشیار کو بھی لکھے تھے کہ:

ان سب فرہنگ لکھنے والوں میں یہ دکن کا آدمی یعنی جامع برہانِ قاطع، احمق اور غلط فہم اور مُعوج الذہن ہے [۵۳]۔

غالب کی اس سخت زبانی پر اس لیے اور بھی تعجب ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک جگہ یہ بڑی معقول بات کہی ہے کہ:

زبان سخن سرای آلہ گہر سفتن است
نہ سازِ آہنگ نا سزا گفتن [۵۴]

(ایک سخن سرا کی زبان موتی پرونے کا آلہ ہے، غیر مناسب راگ الاپنے کا ساز نہیں)

اور برہان قاطع کے مطالعے کے دوران انہوں نے صاحب برہان قاطع کا یہ اقرار نامہ ضرور پڑھا ہوگا کہ: بہ لفظی از الفاظ.... یا معانی نقیضہ و امثال انہا برخورند، زبانِ اعتراض را بہ کام خاموشی.... بکشند۔ چہ فقیر جامع لغات و تابع ارباب لغات است، نہ واضع [۵۵]۔

اب اس معاملے کے دوسرے پہلو پر غور فرمایے۔ برہان قاطع چار ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ غالب کے بقول انہوں نے اس مفصّل لغت میں سے سو دو سو اشتباہات کی نشاندہی کی ہے۔ خود غالب کی مختصر قاطع برہان میں حقایق سے انحراف و بے بنیاد توجیحات پر محترم پروفیسر نذیر احمد صاحب کی نقد قاطع برہان خود قاطع برہان سے زیادہ ضخیم کتاب ہے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر، غالب نے جو کچھ محمد حسین تبریزی کے بارے میں لکھا ہے، کیا وہ سب خود غالب پر منطبق نہیں ہوتا؟

برہان قاطع اور قاطع برہان کے علمی نزاع سے متعلق ایران کے معروف

فرہنگ نگار اور برہانِ قاطع کے مرتب ڈاکٹر محمد معین کا یہ محاکمہ قابلِ غور ہے:

در برخی موارد حق با غالب است و در برخی دیگر ایراد نابجاست و در مواضعِ بسیار نزاع لفظی است [۵۶]

فارسی کے معتبر و معروف عالم و محقق استاد محمود شیرانی نے بھی برہان قاطع اور قاطع برہان کے قضیے پر اپنی اس عالمانہ اور منصفانہ رائے کا اظہار کیا ہے:

غالب کو فن لغت اور اس کی روایات سے کوئی دلچسپی نہیں معلوم ہوتی ورنہ ایک ایسے شخص کو... جس کا دعویٰ ہے کہ میری حیثیت ایک مدوّن کی ہے نہ موجد کی، اپنی طباعی... کا نشانہ نہ بناتے۔ جو اغلاط مرزا نے صاحبِ برہان کے سر تھوپے ہیں، وہی غلطیاں تمام فرہنگ نگار جو صاحبِ برہان کے پیشرو ہیں، کر رہے ہیں اور یہ... دو درجن سے زیادہ ہیں جو دسویں، نویں اور آٹھویں ہجری میں گزرے ہیں.... ایک ناقل اور مرتب پر مرزا کا غصہ نکالنا محض بے کار معلوم ہوتا ہے [۵۷]۔

ایران کے ایک دوسرے فاضل اور ہندستان میں ایران کے سفیر علی اصغر حکمت کا اس علمی اختلاف کے بارے میں خیال ہے کہ:

آن فرہنگ، از بزرگترین فرہنگ ہای فارسی شمردہ می شود... نباید توقع داشت کہ... برہان قاطع فرہنگی باشد شبیہ بہ کتابہای لغت کہ امروزہ علمای فیلولوژی باسبک... جدید می نویسند... بلکہ آن را کتابی باید دانست کہ در سیصد سال قبل مردی ایرانی در یکی از بلاد اقصای

ہندوستان یاداشتن معلومات معمولی آن عصر وبا وسایل... محدود نگاشتہ است.... و کتاب وی از مرتبۂ معلومات وادب متداول عصر... او پایین تر نیست[۵۹]۔

ایرانی و ہندستانی فضلا کے ان بیانات کی روشنی میں، اس علمی نزاع کے بارے میں حالی کا یہ محاکمہ اور اپنے استاد غالب کا دفاع بے جا نہیں:

جس وقت مرزا نے قاطع برہان لکھی ہے نہ اُس وقت ان کے پاس ایک قلمی برہان کے سوا کوئی فرہنگ لغات تھی، اور نہ کوئی اور ایسا سامان موجود تھا جس پر تحقیقِ لغت کی بنیاد رکھی جاتی، پس جو کچھ انہوں نے لکھا یا محض اپنی یادداشت کے بھروسے پر اور یا ذوق و وجدان کی شہادت سے لکھا۔ باایں ہمہ چند مقامات کے سوا جہاں فی الواقع مرزا سے لغزش ہوئی ہے، اور بعض غلطیوں کا انہوں نے خود بھی اقرار کیا ہے ان کے تمام ایراد واجبی معلوم ہوتے ہیں[۶۰]۔

بلوک مان نے غالباً سب سے پہلے ہندستانی فارسی فرہنگوں پر تحقیقی کام کیا تھا۔ یہ ایک صاحبِ نظر محقق ہے۔ وہ موید برہان کے مؤلف احمد علی کی محققانہ صلاحیتوں کا اعتراف اور موید برہان پر غالب کے رد پر اظہار اختلاف کرتا ہے اور کہتا ہے:

احمد علی میں ناقدانہ چھان بین کا جو مادّہ اور علمی صداقت شعاری ہے، وہ ہند میں بہ طور شاذ ملتی ہے۔ برہان کے اغلاط محتاط مؤلف کی حیثیت سے اس کی شہرت کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ غالب نے موید برہان کا جواب دے

کر غلطی کی ہے۔ انہوں نے اس میں غیر متعلق امور
سے بحث کی ہے[۲]۔

حالی نے قاطع برہان کی مخالفت کو ایک دوسرے ہی زاویے سے دیکھا ہے۔ وہ یہ تو اقرار کرتے ہیں کہ غالب نے برہان قاطع پر جو اعتراضات کیے ہیں وہ سب صحیح نہیں، لیکن قاطع برہان کی مخالفت کے پیچھے جو جذبہ کارفرما ہے، وہ ان کی نظر میں محض علمی نہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ:

تقلید نہ صرف امورِ مذہبی میں بلکہ ہر چیز، ہر کام، ہر علم، اور ہر فن میں ایسی ضروری شے ہوگئی ہے کہ تحقیق کا خیال نہ خود کسی کے دل میں خطور کرتا ہے؛ اور نہ کسی دوسرے کو اس قابل سمجھا جاتا ہے کہ سلف کے خلاف کوئی بات زبان پر لائے۔ جو کتاب سو دو سو برس پہلے لکھی جا چکی ہے وہ وحیِ منزل کی طرح واجب التسلیم سمجھی جاتی ہے۔ پس مرزا کے اعتراضات برہانِ قاطع پر کیسے ہی صحیح اور واجبی ہوتے؛ ممکن نہ تھا کہ ان کی سختی کے ساتھ مخالفت نہ کی جاتی۔

بعض لوگوں کو یہ خیال ہے کہ مرزا نے جو ازراہ شوخی طبع کے صاحب برہان کا جا بجا خاکہ اڑایا ہے اور کہیں کہیں الفاظِ ناملائم بھی غیظ و غضب میں ان کے قلم سے ٹپک پڑے ہیں، زیادہ تر اس وجہ سے مخالفت ہوئی؛ مگر یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اگر مرزا، صاحب برہان کی نسبت ایسے الفاظ نہ لکھتے تو بھی مخالفت ضرور ہوتی۔

کیونکہ ہندوستان کے پرانے تعلیم یافتہ، جو آج کل ایک
نہایت کس مپرسی حالت میں ہیں، ان کے لیے کنجِ
خمول وگمنامی سے نکلنے کا کوئی موقع اس کے سوا باقی نہیں
رہا کہ کسی سربرآوردہ اور ممتاز آدمی کی کتاب کا رد لکھیں
اور لوگوں پر یہ ظاہر کریں کہ ہم بھی کوئی چیز ہیں[۲۱]۔

غالب کی مدافعت اور قاطع برہان پر تنقید کے سلسلے میں حالی یہ مزید توضیح کرتے ہیں کہ غالب کی وفات کے چار برس بعد رضا قلی خان ہدایت نے، جو فرہنگ ناصری تالیف کی ہے، اس کے شروع میں ایک باب فرہنگ جہانگیری، فرہنگ رشیدی اور برہان قاطع کی لغزشوں پر مشتمل ہے اور ایک جداگانہ باب میں صرف برہانِ قاطع کی غلطیوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ہدایت نے اپنی اس لغت میں برہانِ قاطع کا جا بجا تخطیہ کیا ہے اور طنزاً لکھا ہے کہ: ''فی الحقیقت تحقیقی دقیق فرمودہ است'' یا ''درین مقام این انشای بدیع، بیان بلیغ زادۂ طبع ایشان بودہ و برہانِ ذوقِ سلیم وسیلقۂ مستقیم صاحب برہان خود ضمین عبارات بس است، تا ازین سپس از وچہ آید'' صرف اتنا ہی نہیں بلکہ برہان قاطع پر غالب کے اعتراضات کی بھی فرہنگِ ناصری سے تائید ہوتی ہے اور مزید برآں بہت سے الفاظ کی تحقیق فرہنگِ ناصری میں مرزا کے خیال کے مطابق ہے[۲۲]۔

غالب اور ایرانی فرہنگ نویسوں اور محققین کا برہان قاطع کے بارے میں تشابہ نظر پیش کرنے کے بعد حالی قاطع برہان میں غالب کی سلامتی طبع اور ذوق صحیح کی تعریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ اپنے اس دعوے میں حق بجانب ہیں کہ: ''فارسی زبان کے قواعد وضوابط میرے ضمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں جیسے فولاد میں جوہر''[۲۳]۔

قاطع برہان کے رد میں لکھی جانے والی کتابوں میں حالی نے دو کتابوں کا خصوصی ذکر کیا ہے:

ایک "قاطع قاطع" تالیف مولوی امین الدین۔ غالب نے اس کا جواب نہیں دیا کیونکہ اس میں فحش اور ناشایستہ الفاظ کثرت سے تھے۔ کسی نے کہا: حضرت! آپ نے اس کا کچھ جواب نہیں لکھا؟ مرزا نے کہا: اگر کوئی گدھا تمہارے لات مارے تو کیا تم بھی اس کے لات مارو گے؟[۵۵]

حالی مویّد البرہان کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ایک شخص مرزا احمد علی بیگ متوطنِ کلکتہ ہیں: جنہوں نے مرزا کے خلاف ایک مبسوط کتاب مؤید البرہان لکھی ہے؛ جس کے لکھتے وقت تمام ایشیاٹک سوسائٹی کا کتب خانہ قاطع برہان کے چند اوراق کی تردید کے لیے چھان مارا ہے۔ اور مثل اور محبوں کے مرزا کے کسی اعتراض کو تسلیم نہیں کیا۔ اور جو سبک الفاظ مرزا نے صاحب برہان کی نسبت استعمال کیے تھے، ویسے ہی الفاظ مرزا کی نسبت استعمال کیے ہیں۔ اپنے تئیں اصفہانی الاصل قرار دیا ہے اور ٹیک چند بہار اور قتیل کی بہت تعریف کی ہے اور اپنی کتاب کی تعریف میں تقریظیں اور تاریخیں لکھوا کر کتاب کے آخر میں چھپوائی ہیں اس کے جواب میں مرزا نے ایک رسالہ موسوم بہ تیغِ تیز لکھا ہے؛ اور ایک فارسی قطعہ بھی ان کو لکھ کر بھیجا ہے"[۵۶]

یہ قطعہ بھی چونکہ مؤید البرہان، اس کے مصنف اور اس کے مطالب پر روشنی ڈالتا ہے، اور برہان قاطع کے بارے میں غالب کے نظریات کا حامل ہے، مزید برآن غالب کی ظرافت طبع کا ترجمان ہے، یہاں نقل کیا جاتا ہے:

خواجہ را از اصفہانی بودنِ آبا چہ سود — خالقش در کشورِ بنگالہ پیدا کردہ است
با قتیل و جامع برہان ولالہ ٹیک چند — لا بہ و سُوگیری و لطف و مدارا کردہ است
داوری گاہی بنا فرمود دور وی ہر سہ را — منصف و صدرامین و صدرِ اعلیٰ کردہ است
گر چنین باہندیان دارد تولّا درسخن — من ہم از ہندم چرا از من تبرّا کردہ است
مطلب از بد گفتن من چیست؟ گویا نیک مرد — مُزدِ این کار از حق آمرزش تمنا کردہ است
صاحب علم و ادب! وانگہ ز افراطِ غضب — چون سفیہان دفترِ نفرین و ذم وا کردہ است
در جدل دشنام کارِ سوقیان باشد بلی — ننگ دارد علم از کاری کہ آغا کردہ است
انتقامِ جامعِ برہانِ قاطع می کشد — آن چہ ما کردیم باوی خواجہ با ما کردہ است
من سپاہی زادہ ام گفتارِ من باید درشت — وای بروی گر بہ تقلیدِ من لہنہا کردہ است
زشت گفتم، لیک دادِ بذلہ سنجی دادہ ام — شوخیِ طبعی کہ دارم این تقاضا کردہ است
میکند تائیدِ برہان لیک برہان ناپدید — نیست جز تسلیم قولش ہر چہ انشا کردہ است
سستی طرزِ خرامِ خامۂ برہان نگار — یا نمی دانست یا دانستہ اخفا کردہ است
بہرِ من توہین و بہرِ خویش تحسین جابجا — ہم مرا، ہم خویش را، در دہر رسوا کردہ است
یافتم از دیدن تاریخہای آن کتاب — خود بدم گفت و بہ احبابِ خود ایما کردہ است
غازیان ہمراہِ خویش آورد از بہرِ جہاد — تا نہ پنداری کہ این پیکار تنہا کردہ است [۲۲]

غالب کو ہندستانی فارسی لکھنے والوں سے بیر تھا۔ وہ انہیں کوئی اہمیت و وقعت نہیں دیتے تھے، حالانکہ خود ہندستانی تھے اور قاطع برہان اور اس کے مصنف سے تو للّٰہی بغض تھا۔ وہ ان دونوں ناموں سے بد کتے تھے۔ کھول جاتے تھے۔ کتنا غیر علمی

رویہ اختیار کرلیا تھا غالب نے۔ تفتہ نے برہانِ قاطع کا ذکر کیا اور کسی ضمن میں اس کا حوالہ دیا تو غالب چراغ پا ہو گئے اور انہیں لکھا:

اور پھر صاحبِ برہانِ قاطع کا ذکر کرتے ہو، وہ تو ہر لغت کو تینوں حرکتوں سے لکھتا ہے، زیر، زبر، پیش کا تفرقہ منظور نہیں رکھتا۔ لکھتا ہے کہ یوں بھی آیا ہے اور یوں بھی دیکھا ہے۔ جس لغت کو کاف عربی سے لکھے گا، کاف فارسی سے بھی بیان کرے گا۔ جس لفظ کو طائے حطّی سے لائے گا، تائے قرشت سے بھی ضرور لکھے گا"۔

غالب کی قاطع برہان کو بیشتر صاحبانِ علم نے نہیں سراہا۔ ان پر تنقید کی گئی، انہیں برا بھلا کہا گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ مرزا رحیم بیگ نے قاطع برہان میں غالب کے بے جا سخت رویئے اور بعض بے بنیاد اعتراضات کی حقیقت کو سمجھا اور ان کی شدت کو محسوس کیا، اسی طرح جو حضرات اس نزاع میں غالب کے ہمنوا تھے ان کے غیر علمی طریقِ کار کی مخالفت کی، اور قاطع برہان سے متعلق ادبی معرکے پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور اپنے تاثرات غالب کو لکھے تو غالب نے انہیں سمجھایا:

کیا تم نہیں جانتے، کیوں کر نہیں جانتے، بے شبہ جانتے ہو گے کہ اکابر امت کہ امورِ دینی میں کیا کیا منازعتیں باہم واقع ہوئی ہیں کہ نوبت بہ تکفیر یک دگر پہنچی ہے۔ اگر فنِ لغت میں ایک شخص دوسرے کا معتقد نہ ہوا، یہاں تک کہ اس کی تحمیق بھی کی تو اور مدعیانِ علم و عقل اس مسکین کے جگر تشنۂ خون کیوں ہو جائیں اور جب تک اس کا نقش ہستی صفحۂ دہر سے نہ مٹائیں، آرام نہ پائیں۔ ظلم تو یہ ہے کہ جو کچھ میں نے قاطع برہان میں لکھا ہے، نہ اس کو سمجھتے ہیں اور نہ جو کچھ آپ لکھتے ہیں،

اس کے معنی سمجھتے ہیں۔ سوال دیگر، جوابِ دیگر
پرمدار ہے۔ خارج از مبحث اقوال کی تکرار ہے۔ برہان
قاطع والے کی محبت سے دل بے قرار ہے، فرطِ غیظ و
غضب سے بدن رعشہ دار ہے۔ منشی سعادت علی نہ ناظم
ہے، نہ نثار ہے، بہ موجب اس مصرع کے:

مقتضائے طبیعتش این است

ناچار ہے۔ تم کو معرضِ تحریر میں تحمل و تامل چاہیے، نہ سخن
پروری و جانب داری میں توغل چاہیے[۴۹]۔

اسی سلسلے میں وہ مرزا رحیم بیگ کو پھر لکھتے ہیں اور انہیں قاطع برہان اور اس کے حامیوں کے بارے میں برا بھلا کہنے سے روکتے ہیں: حیران ہوں کہ اس کی جانب داری میں کیا فائدہ ہے۔ خدا جانتا ہے کہ میں یک رنگ ہوں، مگر دکنی کے جانب داروں کا چور رنگ ہوں۔ مجھے جو چاہو، سو کہو اوروں سے کیوں لڑتے ہو؟ کہیں جامع لطائف غیبی کو برا کہتے ہو، کہیں نگارندۂ دافع ہذیان سے جھگڑتے ہو۔ جانتا ہوں کہ دکنی کی عبارت کی خامی، اس کی رائے کی کجی، اس کے قیاس کی غلطی، اگر نہ سب جگہ بلکہ بعض جگہ سچ جانتے ہو، مگر میں یہ نہیں جانتا کہ اتنی محنت کرنی اور اس کے رفع تخطیہ کے واسطے توجیہاتِ باردہ ڈھونڈنی کس واسطے، ایسا اس کو کیا مانتے ہو، مجھ پہ جدا منھ آتے ہو، مولوی نجف علی اور میاں داد خاں سے جدا بگڑتے ہو۔ بھائی صاحب! مغل بچہ پن پر آگئے، گھار لڑتے ہو[۵۰]۔

قاطع برہان پر جب بہت زیادہ تنقید کی گئی تو غالب حواس باختہ ہوگئے۔ غالب کی تائید میں جو چند رسالے لکھے گئے، وہ غالب گمان یہ ہے کہ خود غالب یا ان کے احباب کے اشارہ پر لکھے گئے[۵۱]۔ اس سلسلے میں تیغ تیز تو غالب نے

خود ہی تالیف کی اور خطوط وغیرہ میں قاطع برہان اور اس کے بارے میں غالب کی جو تحریریں نظر آتی ہیں وہ بہ قول حالی: ان میں اعتراضوں اور جوابوں کے علاوہ بہت سے بیش بہا فائدے اور لطیف و دلچسپ حکایتیں اور لطائف و ترہات بھی موجود ہیں۔ لیکن غالب اس محدود تائید سے مطمئن نہیں تھے۔ انہوں نے اپنے بعض احباب کو اکسایا کہ وہ قاطع برہان کی تائید اور مخالف کتابوں کی مذمت میں کچھ لکھیں یا کم از کم ان کی کوشش کی داد دیں۔ اس سلسلے میں وہ حکیم نجف علی کو ہدایت دیتے ہیں کہ: مآخذ قاطع برہان ضرور لکھیے۔ لیکن حکیم صاحب کے لیے یہ ممکن نہیں ہو سکا۔

اسی طرح قاطع برہان پر جو رد لکھے گئے ہیں، غالب نے ان میں سے بعض کا جواب لکھا ہے۔ ان جوابوں میں بھی زیادہ تر ظرافت و شوخی طبع سے کام لیا گیا ہے۔ ان میں کہیں طرز بیان کا خاکہ اڑایا گیا ہے اور کہیں ان کی تحقیقات کا مضحکہ کیا گیا ہے۔

غالب نے شاکر کو قاطع برہان کے غور سے مطالعے کی دعوت دی اور ہدایت کی کہ اکثر وقتِ فرصت اس کو پیش نظر رکھا جائے۔

مولوی نعمان احمد کو غالب نے اپنے حال پر متوجہ پاکر اور مائل بہ تحقیق جان کر، چار رسائل ارسال کیے۔ دافع ہذیان، سوالاتِ عبدالکریم، استفتاء اور چوتھا لطائف غیبی۔ ظاہر ہے مقصد یہ تھا کہ وہ بھی قاطع برہان کی حمایت میں ان چاروں رسالوں کی نوعیت کا ایک رسالہ تالیف کریں، لیکن شاکر بھی غالب کی یہ آرزو پوری نہیں کر سکے۔

میر غلام حسنین نے غالب کے نام اپنے خط میں دافع ہذیان کے مصنف نجف علی کی تعریف کی۔ غالب نے انہیں جواب دیا اور اپنی قاطعِ برہان کی حمایت میں کچھ لکھنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی اور وعدہ کیا کہ وہ اس کام میں ان کی مدد اور

راہنمائی کریں گے۔ غالب لکھتے ہیں:

مولوی نجف علی صاحب کی کیا تعریف کرتے ہو؟ تم کچھ لکھوتو جانوں، واللہ! اگر کبھی مولوی صاحب میرے گھر آئے ہوں یا میں نے ان کو دیکھا ہو، چہ جائے اختلاط و ارتباط۔ صرف بہ رعایت جانب حق چند کلمات انہوں نے لکھے ہیں۔ تم میرے یار ہواور میری خدمت گزاری کے حقوق ہیں تم پر، مجھ کو مدد دواور اپنی قوت علمی صرف کرو۔ محرق قاطع برہان میرے پاس موجود ہے، مجھ سے منگواؤ۔ میں ہر موقع پر خطا اور زلّتِ مؤلف کا اشارہ کردوں گا۔ تم ہر فقرے کو بہ غور دیکھواور بے ربطی الفاظ اور لغویت معانی کو میزانِ نظر میں تولو، عامی نہیں ہو، عالم ہو۔ آخر مولوی نجف علی صاحب نے بھی تو اپنی قوت عاقلہ سے بے اعانتِ غیر محرق کے جامع کی دھجیاں اڑائی ہیں۔ تمہارے پاس دو نسخے ایک دافع ہذیان ایک سوالات عبدالکریم مع استفتاء وافتائے دستخطی علمائے دہلی موجود ہیں اور اب اس کتاب کے ساتھ میرے اشارات سودمند پہنچیں گے۔ تم کو معارضہ بہت آسان ہوگا۔ مدعی کا کلام دراصل لغو، پھر تمہارے پاس سرمایۂ علمی موجوداور تین نسخے معقول اس پر مزید علیہ۔ محرق اور صاحب محرق کا خاکہ اڑ جائے گا۔ میرے اس خط کے پہنچتے ہی جواب لکھیے اور اجازت بھیجے کہ میں نسخۂ

مطبوعہ، نامطبوعہ، محرق بہ سبیل ڈاک بھیج دوں۔ مگر جس دن سے کہ کتاب پہنچ جائے اسی دن سے آپ اردو زبان میں رسالہ لکھنا شروع کیجیے اور بعد اختتام مجھے اطلاع دیجیے۔ پھر میں جیسا لکھوں ویسا عمل میں لائیے۔"

اس خط کے آخر میں غالب نے اپنا نام اس طرح لکھا ہے:

غالب اثنا عشری حیدری

کسی بھی دوسرے خط میں غالب نے اس انداز سے اپنا نام نہیں لکھا۔ بہ ظاہر اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ میر غلام حسنین کو خط لکھ رہے ہیں، جو اثنا عشری ہیں۔ غالب ان سے ایک کام لینا اور اپنی کتاب قاطعِ برہان کی حمایت میں رسالہ لکھوانا چاہتے ہیں۔ اس لیے وہ خود کو میر غلام حسنین کا ہم عقیدہ وہم مسلک بتاتے ہیں اور گمان کرتے ہیں کہ یہ بھی ایک موثر طریقہ ہے کہ وہ میر غلام حسنین کو اپنی طرف زیادہ متوجہ کر سکتے ہیں اور قاطع برہان کے حق میں کچھ لکھوا سکتے ہیں۔ کتنا مضحکہ خیز ہے یہ حربہ۔

غالب کے ایک سعادت مند شاگرد حبیب اللہ ذکا نے اپنے استاد سے قاطع برہان کے قضیے میں ہمدردی جتائی اور اس کی تائید میں لکھنے والوں کی تعریف کی۔ حبیب اللہ ذکا مولوی نجف علی موکفِ دافع ہذیان سے واقف نہیں تھے۔ اس لیے انہوں نے ان کے نام اپنا ایک خط غالب کو ارسال کیا کہ نجف علی کو پہنچا دیا جائے۔ اس خط میں بہ ظاہر مولوی نجف علی کی ان زحمتوں کو سراہا گیا ہوگا جو انہوں نے قاطع برہان کی تائید میں برداشت کیں اور دافع ہذیان تالیف کی۔ ذکا قاطع برہان کی وجہ سے اپنے استاد کے خلاف پیدا ہونے والے حالات سے پریشان تھے۔ انہیں کسی نے بتایا ہوگا کہ مولوی غوث خان بے خبر قاطع برہان کا جواب لکھ رہے ہیں۔ ذکا کو فکر ہوئی

اور انہوں نے غالب کو اس کی اطلاع دی۔ غالب نے انہیں جواب دیا اور اطمینان دلایا کہ:

> مولوی غلام غوث خان بے خبر میر منشی لفٹنٹ گورنر، مخلص خالص الاخلاص ہیں۔ ہر گز ان کو مدعی سے تلمذ نہیں، البتہ اِس کو خوش گو جانتے ہیں اور یہ کبھی نہ ہوگا کہ وہ میرا مقابلہ کریں اور قاطع برہان کا جواب لکھیں۔ باطل است آنچہ مدعی گوید[۸]۔

غالب نے ذکا کو یہ خط تو لکھ دیا اور انہیں اطمینان بھی دلا دیا کہ بے خبر ان کے مخلص دوست ہیں اور وہ قاطع برہان کی رد میں کچھ نہیں لکھیں گے لیکن غالب خود مطمئن نہیں تھے۔ انہیں گمان گزرا کہ ذکا کی یہ اطلاع کہیں درست نہ ہو کہ بے خبر قاطع برہان کا رد لکھ رہے ہیں۔ قاطع برہان کے انجان مخالفین کی تعداد کچھ کم نہیں تھی اور اگر خود غالب کے ایک آشنا بھی مخالفت کی اس دوڑ میں شریک ہو گئے تو غالب کے اضطراب میں اضافہ طبیعی امر تھا۔ غالب نے اسی اضطرابی حالت میں بے خبر کو خط لکھا کہ:

> یہ معاملہ میرا اور آپ کا ہے۔ خارج سے مسموع ہوا کہ میں نے جو اغلاط برہان قاطع کے نکال کر ایک نسخہ موسوم بہ قاطع برہان لکھا ہے اور ایک مجلد اس کا آپ کو بھی بھیجا ہے، آپ اس کی تردید میں کوئی رسالہ لکھ رہے ہیں۔ اگرچہ باور نہیں آتا، لیکن عجب آیا۔ ایک مولوی نجف علی صاحب ہیں۔ باوجود فضیلت علم عربی، فارسی دانی میں ان کا نظیر نہیں۔ وہ جو ایک شخص مجہول الحال نے اہل

دہلی میں سے میرے کلام کی تردید میں کتاب تصنیف کی ہے، مسمّٰی بہ محرق قاطع برہان، انہوں نے اس کی توہین اور مسود کی تفضیح میں دو جز کا ایک نسخہ مختصر لکھا ہے اور ایک طالب علم مسمّٰی بہ عبدالکریم نے سعادت علی مؤلف محرق قاطع سے سوالات کیے ہیں اور ایک محضر اس نے بہ فتوائے علمائے شہر مرتب کیا ہے۔ ایک میرے دوست نے بہ صرف زر اس کو چھپوایا ہے۔

اس خط کا اصل مقصد یہ ہے کہ غالب بے خبر کو اپنی قاطع برہان کا رد لکھنے سے باز رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں، ممکن ہے اسی وجہ سے بے خبر نے اس موضوع پر کچھ نہ لکھا ہو یا جو کچھ لکھا ہو اسے منظرِ عام پر لانے سے باز رہے ہوں۔

اس کے بعد غالب نے ایک دوسرے خط میں ذکا کو بتایا کہ موید برہان ان کو مل گئی ہے اور:

میں اس کی خرافات کا حال بہ قید شمارِ صفحہ و سطر لکھ رہا ہوں۔ وہ تمہارے پاس بھیجوں گا۔ شرط مودت، بہ شرط آن کہ جاتی نہ رہی ہو اور باقی ہو، یہ ہے کہ میں ہوں یا نہ ہوں، تم اس کا جواب لکھو، میرے بھیجے ہوئے اقوال جہاں جہاں مناسب جانو، درج کر دو۔[۳۳]

ایک دوسرے خط میں بھی ذکا سے قاطع برہان کی حمایت میں کچھ لکھنے کی فرمائش کرتے ہیں، لیکن ذکا بھی اپنے استاد کی فرمائش پوری نہ کر سکے، غالب نے عبدالغفور سرور کو قاطع برہان کا مسودہ بھیجا تھا۔ انہیں لکھتے ہیں:

تم اور چودھری صاحب اور جو اور سخن شناس اور

منصف ہوں وہ اس کو دیکھیں [۵۱]

انہی کو پھر تاکید کرتے ہیں:

قاطع برہان چودھری صاحب کی نثر کے ساتھ بھیجا جائے گا۔ بہ مقابلہ برہان قاطع منطبعہ دیکھا جائے اور بے حیف و بے میل از راہِ انصاف دیکھا جائے [۵۲]

غالب نے قدر بلگرامی کو لکھا کہ وہ قاطع برہان کا ایک نسخہ مفتی میر عباس کو پہنچادیں۔ ان سے یہ فرمایش بھی کی:

میری طرف سے کورنش عرض کرو اور کتاب نذر کرو اور کہو کہ غلام نے بہت خونِ جگر کھا کر فارسی تحقیق کو اس پایے پر پہنچایا ہے کہ اس سے بڑھ کر متصور نہیں [۵۳]

قدر بلگرامی ہی کو ایک دوسرے خط میں پھر لکھتے ہیں:

(مفتی صاحب سے) عرض کرو کہ جو خونِ جگر میں نے اس تالیف میں کھایا ہے، یقین ہے کہ اس کی داد تمہارے سوا اور سے نہ پاؤں گا [۵۴]

بے خبر کی ایک غزل غالب نے اودھ اخبار میں پڑھی، اس کی مبالغہ آمیز تعریف کرتے ہیں کہ:

ابداع اس کو کہتے ہیں۔ جدّتِ طرز اس کا نام ہے۔ جو ڈھنگ تازہ نوایانِ ایران کے خیال میں نہ گزرا تھا، وہ تم بہ روے کار لائے [۵۵]

یہ تعریف بے مقصد نہ تھی۔ اس لیے کہ وہ اسی خط کے آخر میں اپنا مدعا بیان کرتے ہیں کہ:

خدا تم کو سلامت رکھے اور میرے دکھنی جامع برہان قاطع کے جھگڑے میں بہ خلاف اور فارسی والوں کے،

توفیقِ انصاف عطا کرے۔

قاطع برہان کے سلسلے میں غالب پر تنقید کا ایک سبب یہ بھی رہا ہے کہ انہوں نے تمام فرہنگ نویسوں کی محنت کو بے معنی اور بے سود قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے یہ بے بنیاد اور حقایق سے آنکھیں بند کر لینے کے مترادف ہے۔ اس بات کو غالب نے خود بھی محسوس کر لیا تھا۔ اور غالباً ضیاء الدین ضیا نے بھی غالب کی توجہ اس طرف مبذول کرائی تھی۔ اس لیے انہوں نے ضیاء الدین ضیاء کو درفش کاویانی کی ایک جلد پیش کرنے کے بعد لکھا:

> تخطیۂ اہل فرہنگ و تصحیح لغات کو بھاڑ میں ڈالو۔ جہاں سے فوائد شروع ہیں، وہاں سے ہر فائدے کو بہ غور پڑھو۔ ترکیب کلماتِ فارسی بتاتا ہوں اور وہی تحریر میں لاتا ہوں۔ نہ تم جاہل ہو نہ نامنصف۔ یقین ہے کہ اتنی جگر کاوی کی داد تم سے پاؤں گا۔[۵۱]

محمد محسن صدر الصدور نے بھی غالباً قاطع برہان میں غالب کی جدوجہد کو بہ نظر احسن نہیں دیکھا۔ غالب کو محمد محسن کا یہ رویہ پسند نہیں آیا۔ انہیں قاطع برہان ارسال کی اور لکھا:

> خدا کے واسطے اس کو دیکھنا اور غور سے دیکھنا۔ جس طرح لطائف غیبی کو دیکھا ہے، اس طرح نہ دیکھنا۔ تم نقادِ نقودِ معنی ہو۔ تم ہی داد نہ دو گے تو کون دے گا۔ یہ کتاب نہیں اسرارِ حکمت ہے۔ من قال سے قطع نظر ما قال کو دیکھو۔[۵۲]

غالب چاہتے تھے کہ تفتہ بھی قاطع برہان سے متعلق علمی نزاع میں عملاً شریک ہوں۔

غالب نے انہیں ثاقب کے ذریعے محرق قاطع برہان کا نسخہ بھجوایا اور لکھا:

> اس ارسال سے میرا مدعا یہ ہے کہ اس کے معائنے کے وقت اس کتاب کی بے ربطیِ عبارت پر اور میری اپنی قرابت اور نسبت ہائے عدیدہ پر نظر نہ کرو، بیگانہ وار دیکھو اور از روے انصاف حکم بنو، بے حیف و میل[۵۸]۔

تفتہ کو محرق قاطع برہان اس لیے پسند نہیں تھی کہ اس میں غالب کو اسی طرح برا بھلا کہا گیا ہے جیسے غالب نے دیگر فرہنگ نویسوں کو کہا ہے۔ لیکن غالب انہیں لکھتے ہیں:

> اس نے جو مجھے گالیاں دی ہیں، اس پر غصہ نہ کرو، غلطیاں عبارت کی، شدّتِ اطناب محل کی صورت، سوال دیگر، جواب دیگر، ان باتوں کو مطمح نظر کرو، بلکہ اگر فرصت مساعدت کرے تو ان مراتب کو الگ الگ ایک کاغذ پر لکھو اور بعد اتمام میرے پاس بھیج دو۔ میرا ایک دوست روحانی کہ وہ منجملہ رجال الغیب ہے، ان ہفوات کا خاکہ اڑا رہا ہے، نیّر رخشاں نے اس کو مدد دی ہے، تم بھی بھائی مدد دو[۵۹]۔

غالب نے اپنی قاطع برہان کے حق اور رد میں لکھی جانے والی کتابوں اور ان کے مصنفین کے بارے میں بھی اظہار رائے کیا ہے۔ ظاہر ہے حامیوں کی تعریف و توصیف کی ہے اور مخالفین اور ان کی تالیفات کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ مخالفین کی کتابوں کے بارے میں غالب کی تنقید کے علمی اعتبار پر اظہار راے کا یہ محل نہیں، لیکن بتانا یہ ہے کہ اس موقع پر غالب کی زبان، ان کا لب ولہجہ اور انداز بیان غیر سنجیدہ اور غیر علمی

ہے اور غالب کی بوکھلاہٹ، ذہنی اضطراب و کرب اور حتی کہ جائز تنقید بھی برداشت نہ کرنے کا غماز ہے۔

غالب کے تین دوستوں نے مؤلف قاطع برہان کا نام صاحب تپ محرق رکھا تھا اور اس طرح بہ قول غالب اس پر جوتی پیزار کی تھی[۳۵]۔

تفتہ نے محرقِ قاطع برہان کا مطالعہ کرنے سے انکار کر دیا۔ غالب نے انہیں نہایت معقول بات لکھی اور ایک تاریخی حقیقت کا اظہار کیا کہ:

تپ محرق کے دیکھنے سے انکار کیوں کرتے ہو۔ اگر منافیِ طبعِ تحریر کو بہ سببِ انزجار نہ دیکھا کرتے تو فریقین کی کتب مبسوط کہاں سے موجود ہوتیں؟[۳۶]

غالب نے محرّق قاطع برہان اور اس کے مصنف کا اس انداز سے خاکہ اڑایا ہے:

ایک شخص عامی فضول نے اپنی شہرت کے واسطے قاطع برہان کے مطالب کے رد میں ایک کتاب لکھی، محرّق قاطع برہان اس کا نام رکھا، عبارت مہمل، مقاصد پوچ[۳۷]۔

ذکا کو محرق قاطع برہان کا نسخہ کہیں سے مل گیا۔ اس میں قاطع برہان کی شدید تنقید ہے۔ انہوں نے غالب کو اطلاع دی۔ غالب نے اس پر قہقہہ مارا اور انہیں لکھا:

ہا ہا ہا، محرق قاطع کا تمہارے پاس پہنچنا:

کامی کہ خواستم، ز خدا شد میسّرم

ذکا نے غالب سے کہا ہوگا کہ وہ خود اس کا جواب لکھیں۔ غالب نے انہیں جواب دیا:

میں اس خرافات کا جواب کیا لکھتا؟ مگر ہاں سخن فہم دوستوں کو غصہ آ گیا۔ ایک صاحب نے فارسی عبارت

میں اس کے عیوب ظاہر کیے، دو طالب علموں نے اردو
زبان میں دو رسالے جدا جدا لکھے۔ دانا ہو اور منصف
ہو۔ محرق کو دیکھ کر جانو گے کہ مؤلف اس کا احمق ہے اور
جب وہ احمق دافع ہذیان و سوالات عبدالکریم اور
لطائف غیبی کو پڑھ کر متنبہ نہ ہوا اور محرق کو دھونہ ڈالا تو
معلوم ہوا کہ بے حیا بھی ہے[۹۶]۔

فرقانی میرٹھی نے قاطع القاطع کی تعریف کی ہوگی اور غالب کے کسی اعتراض پر اس کے مصنف کی گرفت کی طرف اشارہ کیا ہوگا تو غالب نے انہیں لکھا:
قصہ مختصر، میں نے مانا قاطع القاطع نے دو سو فاقوں میں ایک اعتراض دفع کیا، آگے کیا کرے گا؟ اور دفع اعتراض اس طرح کے سوائے ایک شخص کے دوسرے کے کلام سے سند نہ ملے[۹۷]۔

جن حضرات نے قاطع برہان کی تعریف کی، غالب نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ منشی جواہر سنگھ جوہر نے مرزا احمد خاں اور مولانا مفتی برکت اللہ سے غالب کا تعارف کرایا تھا۔ ان دونوں حضرات نے قاطع برہان کی تعریف اور اس کے مخالفین کی مذمت کی۔ اس لیے انہیں فارسی میں یہ خط لکھا:

حضرات دربارۂ قاطع برہان و منکر آن شیوۂ داد و دہش
ورزیدہ اند واز راستی و درستیِ سخن و دہش بخشیدن تسکین بہ
منِ فقیر تا بہ گیتی خواہد زیست، ثنا خواں شما و دعا گوی نور
نظر منشی جواہر سنگھ جوہر کہ ہر آیینہ باعثِ روشناسیِ من
باعزیزان است، خواہد بود[۹۸]۔

حالات سے انداز ہوتا ہے کہ غالب کے بعض شاگرد بھی کوشاں رہے کہ وہ

قاطع برہان کے قضیے میں خود بھی غالب کی حمایت کریں اور دوسروں کو بھی اس معاملے میں غالب کے حق بجانب ہونے کا یقین دلائیں۔

آغا محمد حسین ناخدائے شیرازی سے غالب کو شاید یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اس علمی بحث میں حصہ لیں گے اور قاطع برہان کو بہ نظر احسن دیکھیں گے۔ اس ایرانی کی تشویق سے غالب بہت خوش ہوئے اور متعجب بھی۔ اس ایرانی شخص کی حمایت نے انہیں اس بات کا بھی احساس دلایا ہوگا کہ مخالفت ہندستانی کر رہے ہیں جو فارسی سے واقف نہیں اور اس کی نزاکتوں سے نابلد ہیں، جیسا کہ وہ خود باور کرتے تھے اور ایک ایرانی کی طرف سے ان کی کوششوں کی حمایت و تائید، اہل زبان کی طرح فارسی زبان لکھنے پر ان کی دعوے کی تصدیق ہے۔ آقا محمد حسین ناخدائے شیرازی کے نام یہ خط بہت اہم ہے:

> نگارش خواجہ دربارۂ نکوئی قاطع برہان نامہ نگار را بہ شگفت زار افگند، چہ این سواد نامقبولِ طبایع دانشمندانِ ہند افتادہ، دعوی مرا مسلّم نمی دارند و گفتار مرا نمی پسندند واز آن میان یکی کہ درزور آزمایی و مردم گزایی شیر شرزہ و مار گرزہ را ماند، بی ہنری خیرہ سری از پارسی ناآگاہی واز تازی بی خبری۔ چشمش چنان فرو گرفت کہ ہمچون دیوانگان کف برلب آورد واز آن کف بدانسان کہ تگرگ از ابر بارد نخچہ ای چند فرو ریخت۔ خواجہ سنجیدہ باشد کہ چہ گفتم وازین چہ خواستم۔ فرومایہ ای کتابی نوشت ودر آن فرد کاس نامہ، جامع برہان قاطع را کہ یکی از عوام دکن است، بہ ہمہ دانی نام گرفت و غالب

راکہ جز زباندانیِ فرزانگان پارس گناہی ندارد، بہ زبانِ
خامہ بہ بادِ دشنام گرفت ۔ مبالغہ پندارند و چنان اندیشند
کہ چون مخنثان در ستیزہ کف برکف زنند و از قوم ہنود
در موسم ہولی سوقیان بہ چنگ و دائرہ دف زنند، چہ گویند،
ہمان گفت بلکہ لختی ناسزاتر ازان گفت، حیف کہ گیتی را بہ
داوری گاہِ سخن چون میر علی شیر مُختسبی و چون مولوی جامی
مفتی ای نیست تا این آدم پیکرِ دیوسار باد افراہِ نکوہشِ
بیجا و کیفرِ نفرین ناروا یافتی ۔ ناچار بدین مایہ خوشنودی کہ
ہرگاہ ہوشمندانِ سخندان این نگارش بی آرش را خواہند
نگریست، باد بروتِ آن شعراز شعرنشناس موجب
ریش خندِ وی خواہد بود، خود را تسلی دادم [۹۱]۔

قاطع برہان کے مخالفین میں غالب نے رحیم بیگ مؤلف ساطع برہان کی سب سے زیادہ بے عزتی کرنے اور مضحکہ اڑانے کی کوشش کی ہے۔ اصل میں بات یہ ہے کہ رحیم بیگ کی یہ کتاب قاطع برہان کا نہایت شدید رد ہے اور اسی لیے بہ قول غالب ان کے تین دوستوں نے مؤلف محرق قاطع برہان کا نام صاحب تپ محرق رکھا تھا اور اس طرح اس پر جوتی پیزار کی تھی۔ غالب ساطع برہان کا نام لیے بغیر سیاح سے رحیم بیگ کا اس طرح تعارف کراتے ہیں:

وہ جو ایک اور کتاب کا تم نے ذکر لکھا ہے وہ ایک لڑکے
پڑھانے والے مکتب دار کا خبط ہے، رحیم بیگ اس کا نام،
میرٹھ کا رہنے والا، کئی برس سے اندھا ہو گیا ہے۔ باوجود
نابینائی کے احمق بھی ہے۔ اس کی تحریر میں نے دیکھی، تم

کو بھی بھیجوں گا، مگر ایک بڑے مزے کی بات ہے کہ اس میں بیشتر وہ باتیں ہیں جن کو لطائف غیبی میں رد کر چکے ہو۔ بہ ہر حال اس کے جواب کی فکر نہ کرنا

سچ کہتے ہو، رحیم بیگ کا وطنِ اصلی سردھنہ اور فی الحال میرٹھ میں مقیم اور معلمی اس کا پیشہ ہے اور آٹھ دس برس سے اندھا، نظم و نثر میں مولوی امام بخش صہبائی کا شاگرد اور فارسی شعر کہتا ہے [۱۱]۔

پھر شاکر کو بتاتے ہیں کہ:

نامۂ غالب کا مکتوب الیہ رحیم بیگ نامی میرٹھ کا رہنے والا ہے۔ دس برس سے اندھا ہو گیا ہے۔ کتاب پڑھ نہیں سکتا۔ سن لیتا ہے۔ عبارت لکھ نہیں سکتا، لکھوا دیتا ہے بلکہ اسکے ہم وطن ایسا کہتے ہیں کہ قوت علمی بھی نہیں رکھتا، اوروں سے مدد لیتا ہے۔ اہل دہلی کہتے ہیں کہ مولوی امام بخش صہبائی سے اس کو تلمذ نہیں ہے۔ اپنا اعتبار بڑھانے کو اپنے کو ان کا شاگرد بتاتا ہے [۱۲]۔

غالب کو صحیح یا غلط بتایا گیا کہ رحیم بیگ، صہبائی کا شاگرد نہیں، لیکن غالب کے دل میں رحیم بیگ اور صہبائی کے ان کا استاد ہونے کی وجہ سے، خود صہبائی سے دل میں نفرت کی جو گرہ پڑ گئی تھی، وہ کھلی نہیں۔ صہبائی غالب کے معاصر ہیں۔ آشنا ہیں۔ عالم و فاضل ہیں، شاعر اور ادیب ہیں۔ اہم کتابوں کے مؤلف ہیں، لیکن غالب ان تمام امور کا لحاظ کیے بغیر شاکر کو لکھتے ہیں کہ:

> واے اس ہیچ پوچ پر جس کو صہبائی کا تلمذ موجب
> عز و وقار ہو[۲۲]۔

صرف اتنا ہی نہیں، جب مولوی نعمان احمد نے غالب کے نام اپنے ایک خط میں صہبائی کو امام المحققین کے خطاب سے یاد کیا تو غالب، ایسا لگتا ہے کہ چڑ گئے۔ انہوں نے اس کی تردید کی اور توجیہہ یہ کی کہ:

> یہ جو آپ نے مولوی امام بخش کو امام المحققین خطاب
> دیا ہے، کتنے محققین نے ان کو اپنا امام مان لیا ہے؟ جب
> تک نہ اجماع، محققین کا ہوگا، یہ خطاب با اجماع اہل
> عقل، ناجائز و ناروا ہوگا... اگر حضرت بہ فتحہٗ قاف ثانی بہ
> صیغہٗ تثنیہ امام المحققین کہتے تو ایک ماموم آپ ہوتے
> اور نرائن داس تنبولی دوسرا ہوتا[۲۳]۔

درج بالا کوائف سے پتا چلتا ہے کہ قاطع برہان کی مخالفت بیشتر علمی وادبی بنیاد پر تھی اور خود غالب کے بعض آشناؤں نے بھی اس قضیے میں ان کا ساتھ نہیں دیا، لیکن غالب آخر دم تک اپنی قاطع برہان کو ایک اہم کتاب سمجھتے رہے۔ جس پر اعتراضات وتنقید بے جا تھی اور اسی وجہ سے وہ اس کتاب میں اپنی علمی وادبی کاوشوں کے داد خواہ رہے۔ علمی امور میں مخالفت کے باوجود، غالب مجموعی طور پر اپنے ادبی کارناموں سے مطمئن تھے اور جہاں تک ان کی فارسی یا اردو نظم ونثر کا تعلق ہے، وہ بجا طور پر اس احساس کے ساتھ زندہ رہے کہ:

> نظم ونثر کے قلمرو کا انتظام ایزد دانا وتوانا کی عنایت و
> اعانت سے خوب ہو چکا۔ اگر اس نے چاہا تو قیامت
> تک میرا نام ونشان باقی وقائم رہے گا[۲۴]۔

آخر میں یہ عرض کر دینا بے جا نہیں کہ غالب ایک اعلیٰ پایے کے شاعر ہیں۔ اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔ معنی آفرینی اور خیال پردازی جیسے انہیں ودیعت کی گئی تھی۔ اس میدان میں انہیں اجتہاد کا درجہ حاصل ہے۔ فرہنگ نویسی ایک جداگانہ فن ہے۔ یہاں معنی آفرینی اور خیال پردازی کو خاص دخل نہیں، غالب نے قاطع برہان میں برہانِ قاطع پر اعتراضات کے ضمن میں معنی آفرینی سے بھی کام لیا ہے، جس کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

--

حواشی:

ا۔ غالب عبدالغفور سرور کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں: میں اہل زبان کا پیرو اور ہندیوں میں سوائے امیر خسرو دہلوی کے سب کا منکر ہوں، جب تک قدما یا متاخرین میں مثل صایب و کلیم و اسیر و حزین کے کلام میں کوئی لفظ یا ترکیب نہیں دیکھ لیتا، اس کو نظم اور نثر میں نہیں لکھتا۔ غالب کے خطوط، مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم، غالب انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۸۵، ص ۵۹۰

۲۔ سلسلۂ مطبوعات ادارۂ تحقیقات اردو، پٹنہ، ۱۹۶۷

۳۔ ص، ک

۴۔ شیخ مبارک علی، تاجر کتب، لاہور، اشاعت چہارم، ۱۹۳۶ء، ص ۳۸۱

۵۔ بہ نام یوسف مرزا، غالب کے خطوط، ص ۷۷۵

۶۔ غالب کے خطوط، ص ۳۶۶

۷۔ یہی بات حالی نے یادگار غالب، مطبوعہ غالب انسٹی ٹیوٹ، دوسرا ایڈیشن، ۱۹۹۶، ص ۴۲ پر کہی ہے۔

۸۔ غالب کو صاحب برہان قاطع ہی کی شہرت پر تعجب نہیں ہوتا تھا۔ وہ تو قتیل لکھنوی اور غیاث الدین ملائے مکتبی رام پوری (صاحب غیاث اللغات) کی شہرت و خوش نصیبی پر بھی حیرت زدہ تھے۔ خط بنام عبدالغفور سرور، غالب کے خطوط، ص ۵۹۲

۹۔ خط بہ نام منشی کیول رام ہشیار، خطوط غالب، ص ۸۹ے

۱۰۔ غالب کے خطوط، ص ۵۹۰

۱۱۔ حالی نے یادگار غالب (ص ۴۴) میں اس کے برخلاف یہ لکھا ہے کہ: ''جس وقت مرزا نے قاطع برہان لکھی ہے ان کے پاس ایک قلمی برہان کے سوا کوئی فرہنگ تھی... البتہ درفش کاویانی لکھتے وقت معلوم ہوتا ہے کہ فضلائے کلکتہ کی مصححہ و مطبوعہ برہان مرزا کے پیش نظر تھی۔ ظاہر ہے کہ حالی کا یہ بیان حقیقت پر مبنی نہیں۔ قاطع برہان لکھتے وقت غالب کے پاس مطبوعہ برہان قاطع تھی اس کا خطی نسخہ نہیں:

۱۲۔ خط بہ نام عبدالغفور سرور، خطوط غالب، ص ۲۰۲

۱۳۔ خط بہ نام میاں داد سیاح، غالب کے خطوط، ص ۵۵۵

۱۴۔ قاطع برہان، ص ۴

۱۵۔ یادگار غالب، ص ۴۲

۱۶۔ ایضاً، ص ۴۷

۱۷۔ خط بہ نام میر مہدی مجروح، غالب کے خطوط، ص ۴۹۵

۱۸۔ خط بنام سید غلام حسنین قدر بلگرامی، غالب کے خطوط، ص ۱۳۸۱

۱۹۔ حالی نے یادگار غالب (ص ۴۲) میں قاطع برہان کی اشاعت کا سال ۱۲۷۶ لکھا ہے، جو صحیح نہیں۔ یہ اس کی تکمیل کا سال ہے۔

۲۰۔ فارسی خط بہ نام

۲۱۔ قاطع برہان، ص ۴

۲۲۔ قاطع برہان، ص ۹۲

۲۳۔ ایضاً، ص ۸۶

۲۴۔ خط بہ نام مفتی محمد عباس ۱۴۴۷

۲۵۔ قاطع برہان، ص ۸

۲۶۔ غالب کے خطوط، ص ۵۶۴

۲۷۔ رک: غالب: غلام رسول مہر، لاہور (طبع چہارم) ص ۴۳۵

۲۸۔ غالب نے اس بارے میں صوفی منیری کو لکھا: قاطع برہان اس کا نام اور درفش کاویانی اس کا علم، ص ۱۴۴۳، اسی بارے میں وہ مولوی نعمان احمد کو بھی لکھتے ہیں کہ: جو قاطع برہان میں کہیں کہیں سہو طبیعی واقع تھا، ناچار اس کی ترمیم و تکمیل کے واسطے اسی نسخے میں کچھ بڑھایا اور ایک دیباچہ اور لکھا اور اس رسالے کا درفش کاویانی نام رکھا، ص ۱۴۵۲، اس کے علاوہ رک: خط بہ نام شاکر، ص ۸۳۱

۲۹۔ خط بہ نام میر مہدی مجروح، ص ۴۹۵

۳۰۔ خط بہ نام محمد محسن صدر الصدور، ص ۸۱۰

۳۱۔ خط بہ نام مفتی محمد عباس، ص ۱۴۴۷

۳۲۔ یادگار غالب، ص ۴۴

۳۳۔ خط بہ نام مفتی محمد عباس، ص ۱۴۴۷

۳۴۔ یادگار غالب، ص ۴۴ (محرق قاطع برہان از مولوی سعادت علی دہلوی، مطبع احمدی، امو جان، شاہدرہ، محرم ۱۲۸۰ھ، قاطع القاطع، از مولوی امین الدین امین دہلوی، مطبع مصطفائی، دہلی، ۱۲۸۳ھ، موید برہان از آقا احمد علی، مطبع مظہر العجائب، کلکتہ، ۱۲۸۲ھ، ساطع برہان از مرزا رحیم بیگ میرٹھی، مطبع ہاشمی، میرٹھ، ۱۲۸۲ھ، ان کے علاوہ تیغ تیز تر از عبدالصمد فدا اصفہانی، مطبوعہ مطبع نبوی، کلکتہ ۱۸۶۷ء، تیغ تیز کے رد میں لکھی گئی۔ شمشیر تیز تر آقا احمد علی احمد اصفہانی نے تیغ تیز کے جواب میں لکھی جو مطبع نبوی، کلکتے ہی سے ۱۸۶۷ء میں شائع ہوئی)

۳۵۔ ایضاً، ص ۴۵

۳۶۔ ایضاً، ص ۵۱۔ اس مقدمے کی مزید تفصیل کے لیے رک: غالب: غلام رسول مہر ص ۴۳۶، ۴۳۷

۳۷۔ ایضاً، ص ۵۱

۳۸۔ یادگار غالب، ص ۵۲

۳۹۔ یادگار غالب، ص ۵۶

۴۰۔ یادگار غالب، ص ۵۳

۴۱۔ غالب کے خطوط، ص ۷۸۹

۴۲۔ مؤلف غیاث اللغات

۴۳۔ روشن علی انصاری جونپوری (م ۱۲۲۵/۱۸۱۰ء) فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں پڑھاتے تھے۔ انہوں نے ''قواعد فارسی'' گرامر پر رسالہ لکھا ہے۔

۴۴۔ غالب کے خطوط، ص ۷۴۵

۴۵۔ جمال الدین انجوی شیرازی مؤلف فرہنگ جہانگیری

۴۶۔ عبدالرشید ٹھٹھوی مؤلف فرہنگ رشیدی

۴۷۔ لالہ ٹیک چند بہار مؤلف بہار عجم اور نوادر المصادر

۴۸۔ سراج الدین علی خان آرزو مؤلف چراغ ہدایت و سراج اللغت

۴۹۔ غالب کے خطوط، ص ۷۴۸

۵۰۔ ص ۱۴۷۷

۵۱۔ ص ۱۴۷۷، اس طرح کی تنقید غالب کے متعدد خطوط میں نظر آتی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ: فرہنگ لکھنے والوں کا مدار قیاس پر ہے۔ جو اپنے نزدیک صحیح سمجھا، وہ لکھ دیا، نظامی و سعدی وغیرہ کی لکھی ہوئی فرہنگ ہو تو ہم اس کو مانیں، ہندیوں کو کیوں کر مسلّم الثبوت جانیں، غالب کے خطوط، ص ۳۵۲

۵۲۔ص ۱۴۷۷

۵۳۔غالب کے خطوط،ص ۷۸۹

۵۴۔

۵۵۔برہان قاطع:محمد حسین تبریزی،بہ تصحیح دکتر محمد معین،تہران

۵۶۔مطبوعہ غالب انسٹی ٹیوٹ،نئی دہلی،۱۹۸۵

۵۷۔منقول از قاطع برہان،مرتبہ قاضی عبدالودود،۱۹۶۰،ص ۱

۵۸۔ایضاً،ص ۱

۵۹۔ایضاً،ص ۱

۶۰۔یادگارِ غالب،ص ۴۴

۶۱۔ایضاً،ص ۴۵

۶۲۔ایضاً،ص ۴۶

۶۳۔ایضاً،ص ۴۷

۶۴۔ایضاً،ص ۴۷

۶۵۔ایضاً،ص ۴۹

۶۶۔ایضاً،ص ۴۹

۶۷۔ایضاً،ص ۴۹،۵۰

۶۸۔خطوط غالب،ج ۱،ص ۳۵۱

۶۹۔ایضاً،ص ۱۴۷۵

۷۰۔ایضاً،ص ۱۴۷۵

۷۱۔قاطع برہان پر جو رد لکھے گئے ہیں،ان کے جواب میں درج ذیل رسائل تالیف ہوئے یعنی یہ رسائل غالب کی قاطع برہان ہی پر اعتراض کے طور پر لکھے گئے ہیں:

رسالۂ سوالات عبدالکریم،یہ رسالہ عبدالکریم کے فرضی نام سے ستر سوالوں پر مشتمل خود غالب نے ۱۲۸۱ھ میں لکھا تھا۔جو محرق قاطع برہان کے جواب میں ہے۔

لطائف غیبی بھی سیف الحق میاں داد خاں سیاح کے نام سے خود غالب نے لکھا ہے اور محرق قاطع برہان کے جواب میں ہے۔

ساطع برہان کے جواب میں ایک نامۂ غالب ۱۶ صفحات پر مشتمل ہے جو عود ہندی میں شامل ہے۔

دافع ہذیان غالب کی تحریک پر مولوی نجف علی خان جھجھری نے محرق قاطع برہان کے جواب میں تالیف کی جو اکمل المطابع،دہلی سے ۱۸۶۴ء میں شائع ہوئی ہے۔

خود غالب نے موید برہان کے جواب میں تیغ تیز لکھی۔اس میں چند اعتراضوں کا جواب ہے وہ بھی

تسلی بخش نہیں،

۷۲۔ یادگار غالب، ص ۵۰

۷۳۔ ایضاً، ص ۴۸۔۴۹

۷۴۔ غالب کے خطوط، ص ۴۰۷

۷۵۔ ایضاً، ص ۸۴۱

۷۶۔ ایضاً، ص ۱۴۵۷۔ (لطائف غیبی خود غالب کی تصنیف ہے جو میاں داد خان سیاح مخاطب بہ سیف الحق کے نام سے اکمل المطابع، دہلی سے شائع ہوئی۔ چوں کہ اس کی طباعت میں غالب نے ناشر سے مالی تعاون نہیں کیا تھا اس لیے انہوں نے اس کی فروخت میں حصہ لیا۔ بیس جلدیں خود خریدیں، تیس سیاح کو دلوائیں، بیس ضیاء الدین خاں نے لیں اور دس مصطفیٰ خان نے خریدیں۔ رک: خط بہ نام سیاح، ص ۵۶۲، سیاح نے تیس کے دام دس روپے بھی غالب کو ارسال کیے تھے، رک: خط بہ نام سیاح ۵۶۱)

۷۷۔ ایضاً، ص ۱۴۲۶۔ محرق قاطع کا رد لکھنے کے لیے غالب نے بعض لوگوں کو تحریک کی، لیکن نجف علی واحد شخص ہیں جو اس کام پر آمادہ ہو سکے اور دافع ہذیان لکھی۔

۷۸۔ خطوط غالب، ص ۱۵۲۰

۷۹۔ ایضاً، ص ۶۹۵

۸۰۔ ایضاً، ص ۱۵۳۴

۸۱۔ ایضاً، ص ۶۰۲

۸۲۔ ایضاً، ص ۶۰۵

۸۳۔ ایضاً، ص ۱۴۲۱

۸۴۔ ایضاً، ص ۱۴۲۱

۸۵۔ غالب کے خطوط، ص ۶۶۲

۸۶۔ ایضاً، ص ۴۸۷

۸۷۔ ایضاً، ص ۸۱۰

۸۸۔ ایضاً، ص ۴۱۱

۸۹۔ ایضاً، ص ۶۱۱

۹۰۔ ایضاً، ص ۸۳۹

۹۱۔ ایضاً، ص ۴۱۱

۹۲۔ خط بہ نام مولوی نعمان احمد، خطوط غالب، ص ۱۴۵۷

۹۳۔ خطوط غالب، ص ۱۵۲۱

۹۴۔ ایضاً،ص ۱۵۲۷
۹۵۔ ایضاً،ص ۱۳۵۷
۹۶۔ ایضاً،ص ۱۵۳۷
۹۷۔ ایضاً،ص ۷۳۰
۹۸۔ پنج آہنگ،ص ۶۰۰
۹۹۔ ایضاً،ص ۹۱۰
۱۰۰۔ خطوط غالب،ص ۵۶۵
۱۰۱۔ ایضاً،ص ۸۳۸
۱۰۲۔ ایضاً،ص ۸۴۱
۱۰۳۔ ایضاً،ص ۱۳۸۱
۱۰۴۔ ایضاً،ص ۸۴۲

مثنویاتِ غالبؔ

ترتیب و ترجمہ:

ڈاکٹر ظ۔ انصاری

غالب کا فارسی کلام جو ضخامت میں اردو دیوان سے تقریباً پانچ گنا ہے۔ مکمل ترجمے کی صورت میں ہنوز سامنے نہیں آیا۔ صاحبِ طرز ادیب اور غالب شناس ظ۔ انصاری کی اس کتاب میں وہ گیارہ مثنویاں اور ان کا اردو ترجمہ شامل ہے۔ جن مثنویوں کو خود مرزا غالبؔ نے اپنے فارسی دیوان میں غزلوں سے پہلے جگہ دی تھی۔ ان میں کل اٹھارہ سو پینتالیس اشعار ہیں جو تعداد میں دیوانِ غالب کے اردو اشعار سے کم نہیں۔

شاندار گٹ اپ، خوب صورت طباعت۔

صفحات : ۲۸۴

قیمت : ۶۰ روپے

کمال احمد صدیقی

مکاتیبِ غالب

''مکاتیب غالب''، امتیاز علی خاں عرشی نے رضا لائبریری میں موجود دستاویزوں کی بنیاد پر ترتیب دی، جو پہلی بار ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئی۔ عودِ ہندی، اردوے معلّٰی کے علاوہ مولوی مہیش پرشاد اور غلام رسول مہر نے، جو خطوط جمع کر شائع کیے، اسی زُمرے میں امتیاز علی خاں عرشی کا یہ کارنامہ بھی رکھا جاتا ہے۔ ''مکاتیبِ غالب'' کے بعد ایک اور مجموعہ غالب کے خطوط کا ۱۹۴۹ء میں چھپا۔ اس میں منشی عبداللطیف کے نام ایک خط اور تہتر (۷۳) منشی نبی بخش حقیر کے نام ہیں۔ میرن صاحب نے ان خطوں کو مرتب کیا تھا، لیکن اس مجموعے کو اشاعت نصیب نہیں ہوئی۔ میرن صاحب کے نواسے آفاق حسین نے اس مسودے کو ''نادراتِ غالب'' کے نام سے چھاپا۔ اِن مجموعوں میں سب خط مستند ہیں۔ کچھ جعلی خطوط بھی غالب سے منسوب کر کے شائع کیے گئے۔ ایک خط قدرت اللہ نقوی کی دریافت ہے، اور تین خط

میرن صاحب کی ایک بیاض سے سیّد معین الرحمٰن نے شائع کیے۔ اول الذکر کے مشتبہ ہونے کے بارے میں پروفیسر نذیر احمد صاحب نے ایک مدلل مقالہ لکھا تھا، جو خلیق انجم نے ''اردو ادب'' میں شائع کیا تھا، اس کے باوجود اسے ''خطوطِ غالب'' میں شامل کیا گیا۔ موخر الذکر کے بارے میں، مجھ حقیر نے، کوئی دس برس ہوئے غالب سمینار میں مقالہ پڑھا تھا، جو ''غالب نامہ'' میں شایع ہوا۔ دونوں حضرات نے. جنھوں نے یہ خطوط دریافت کیے تھے، اپنی دریافتوں کی حمایت میں کچھ نہیں لکھا۔ غالب کے جعلی خطوط پہلے بھی ''دریافت'' کیے گئے تھے، اور خواجہ احمد فاروقی نے ان کا جعل آشکارا کیا تھا۔

''مکاتیبِ غالب'' کی ابتدا میں، اس وقت کے چیف منسٹر رامپور، بشیر حسین زیدی کی لکھی ہوئی (۱۷ر مارچ ۱۹۳۷ء) کی تقریب ہے، جس میں اختصار کے ساتھ نوابانِ رامپور کی تاریخ اور کچھ ان کے علمی شغف کا ذکر ہے، کچھ سرکارِ انگلشیہ کی مدح ہے۔ درباردار ی اسلوب کے باوجود کچھ اہم باتیں بھی بیان ہوگئی ہیں:

نواب سیّد محمد یوسف علی خاں بہادر فردوس مکاں نے تاجِ ریاست زیبِ سر فرمایا۔ آپ نواب جنت آرام گاہ کی تخت نشینی سے قبل دہلی میں قیام پذیر ہوئے تھے، اور مولانا فضلِ حق خیر آبادی، مفتی صدرالدین خاں آزردہ اور میرزا اسد اللہ خاں غالب سے علومِ عربی و فارسی کی تحصیل فرما چکے تھے۔ آپ کی تخت نشینی کے بعد ہندوستان نے حکومتِ انگلشیہ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ نواب فردوس مکان نے اس موقع پر حکومت کی حمایت و ہمدردی میں بیش بہا خدمات انجام دیں، اور غدر فرو ہو جانے پر آفت رسیدہ علما، شعرا، ادبا، اور دیگر اہلِ ہنر کے لیے اپنے سایۂ عاطفت و پرورش کو وسیع فرمایا۔ نواب فردوس مکاں کے دامنِ جود و سخا میں پناہ لینے والے حضرات کی طویل فہرست میں مفتی محمد سعد اللہ مراد آبادی، میرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی، منشی

مظفر علی خاں اسیر لکھنوی، منشی امیر احمد امیر مینائی، صاحبِ عالم میرزا رحیم الدین بہادر حیا دہلوی، شیخ علی بخش بیمار، میر عوض علی عدیل ملیح آبادی خوش نویس نستعلیق، اور منشی انبا پرشاد لکھنوی داستان گو، وہ ممتاز ہستیاں ہیں، جن سے اربابِ علم و ادب بخوبی واقف ہیں۔

لیکن ان تمام صاحبانِ فضل و کمال میں نجم الدولہ دبیر الملک میرزا اسد اللہ خاں بہادر غالب دہلوی کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ آغازِ سنہ ۵۷ء میں مولانا فضلِ حق خیرآبادی کی وساطت سے، نواب فردوس مکاں (یوسف علی خاں) نے انہیں فنِ سخن میں اپنا مشیرِ خاص مقرر فرمایا تھا۔ ابتدا میں نواب فردوس مکاں وقتی عطیات سے میرزا صاحب کی امداد فرماتے رہتے تھے، غدر کے بعد، پنشن (انگریز عملداری کی) بند ہو جانے پر، نواب صاحب نے جولائی ۵۹ء سے سو روپے ماہوار جاری فرمادی تھی، جوان کے بعد نواب خُلد آشیاں (کلب علی خاں) کے خزانے سے ملتی رہی..... اس رشتے کی بدولت سنہ ۱۸۵۷ء سے سنہ ۱۸۶۹ء تک دربار رام پور اور میرزا غالب کے درمیان سلسلۂ مراسلت جاری رہا۔"

مؤلف (عرشی) نے تمہید بہت مختصر، مشکل سے دو صفحے کی لکھی ہے (۱۵ر جنوری ۴۶ء) سرگذشت چھتیس صفحات اور ڈھائی سطروں پر پھیلی ہوئی ہے، اور اس میں انہوں نے غالب کی زندگی کے بہت سے اہم پہلوؤں کو ایجاز سے بیان کیا ہے۔

> "۱۴ر جنوری سنہ ۱۸۵۸ء کو انہوں نے (یعنی غالب نے) دوسرا عریضہ ارسال کیا، اور اُس میں اپنے انگریزی (انگریزوں سے اپنے) روابط، حقیقتِ تعلقِ قلعہ اور ایامِ غدر میں اپنی گوشہ گیری کے تذکرے سے پہلے سرکار کو لکھا:

ہر آینہ در دل چناں گذشت کہ دریں بار بد انساں سخن سرائی تواں گشت، کہ سرگزشتِ من از ولی نعمت نہان و حجابی درمیان نماندہ۔ میرزا صاحب اس وجیہہ کے پیشِ نظر میں نے بھی مناسب خیال کیا کہ کم از کم، وہ حالات، جنہیں خود میرزا صاحب اس عریضے یا دیگر عرائض و مکاتیب رامپور کے ذریعے سے نواب فردوس مکاں، نواب خُلد آشیاں، یا وابستگانِ دربار کے علم میں لانا ضروری سمجھتے تھے، چند ضروری اضافوں کے ساتھ آغازِ مکاتیب میں شامل کر دوں۔" (ص ا)

چھتیس صفحوں میں امتیاز علی خاں عرشی نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ غالب کی زندگی، اور غالب کی تصانیف، سب یہاں ہیں۔ شاید اسی وجہ سے مختلف یونیورسٹیوں نے اسے نصاب میں داخل کیا، اور ۱۹۴۹ء تک اس کے چھ ایڈیشن شائع ہوئے۔

دوسرا باب "تلامذۂ رامپور" ہے۔ ظاہر ہے پہلے شاگرد نواب یوسف علی خاں ہیں، جنہوں نے غالب کے دیے ہوئے تخلصوں میں سے ناظم پسند کیا۔ ناظم نے غالب سے اصلاح تو لی، (اور جیسا عرض کیا جا چکا ہے، دورِ شہزادگی میں انہوں نے اوروں کے علاوہ غالب سے بھی دلّی میں تحصیل علم کی تھی۔) لیکن ان کا رنگِ سخن غالب سے بالکل جدا ہے۔

طریقِ عشق میں ہرگز رہا نہ میں بیکار
جو گر پڑا تو قدم میں نے پاسباں کے لیے

☆

ے میں یہ بات کہاں جو ترے دیدار میں ہے
جس کو دیکھا کہ گرا، پھر نہ سنبھلنے پایا

☆

تپش و زاری و تنہائی و سرگردانی
گھر میں سب کچھ ہمیں موجود ہے، صحرا کیا؟

غالب نے اصلاح دی، اور دوسرے مصرع میں ''گھر میں سب کچھ ہمیں موجود ہے'' رہنے دیا! شاید پاسِ ادب سے، کہ شاگرد، ولی نعمت بھی تھا۔ ورنہ ''گھر میں، کیا ہے جو میسر نہیں؟'' اور اگر صحرا ایک ردیف ہے تو شعر یوں بھی بنایا جا سکتا تھا:

تپش و زاری و تنہائی و سرگردانی
خود مرے گھر ہی میں موجود ہے صحرا کیا؟

غالب نے اصلاح دی، لیکن اپنا اسلوب تو کیا، اپنا فن بھی نہیں دیا، اور نہ فن کے رموز دیے۔

ایک شعر ہے:

سُنا بھی تم نے تو کس سے سُنا، 'خدا کی پناہ'
کہا ہے غیر نے جو کچھ، وہ میرا حال نہیں

'خدا کی پناہ'، حشو و زوائد کے تحت تو نہیں آتا، لیکن یہاں اس کا موقعہ نہیں تھا۔ ذرا سی توجہ سے شعر سنور سکتا تھا:

ہزار حیف! کہ تم نے سُنا، تو کس سے سُنا
کہا ہے غیر نے جو کچھ بھی، میرا حال نہیں

دوسرے شاگرد بیتاب ہیں، جو نواب فردوس کے حقیقی چچازاد بھائی اور نواب خلد آشیاں کے حقیقی ماموں تھے۔ مومنؔ کے شاگرد تھے، لیکن مومنؔ کا اصلاحی کلام بھی نظرِ ثانی کے لیے غالب کو دے دیا۔ عرشی نے صادی اشعار کا انتخاب درج کیا ہے۔

''اس شعر پر میرزا صاحب نے تین صاد بنائے ہیں:

لکھ دیا لکھنے کو لیکن پھر جو کچھ رحم آ گیا!
رو دیا اللہ نے میرا مقدر دیکھ کر

شعر کے معنی وہی رہتے ہیں۔

''ان شعروں پر دو صاد ہیں:

کیا ہوئی چینِ جبیں، ہنستے ہو کیسے نعش پر
زندگی میں یوں کبھی صورت نہ دکھلائی ہمیں
غیر بھی کہہ نہیں سکتا ہے کہ بیتاب ہوں میں
نام سے میرے ہوئی ہے انہیں نفرت کیسی؟

غالب نے ان دو شعروں پر دو صاد بنائے ہوں، یقین نہیں آتا۔ کوئی سفارتی زاویہ یا ذاتی مفاد کارفرما ہوگا۔ پہلا شعر بے دردانہ ہی نہیں، انسانی قدروں کی ایسی نفی ہے جو اردو غزل کے روائتی معشوق سے متوقع نہیں۔

ان شعروں پر ایک صاد بنایا ہے (ص ۴۵) اور یہ شعر اگر بہت اچھے نہیں تو غنیمت ضرور ہیں، اور سقم سے بھی پاک ہیں۔

کیا پشیماں ہوئے، وہ مار کے ٹھوکر، افسوس
سنگِ رہ سمجھے جس کو، وہ مرا سر نکلا

☆

ضد تو دیکھ کہ نہ کی غیر کی جانبداری
بولنا یوں بھی انہیں ہم سے گوارا نہ ہوا

دوسرے شعر میں تو کچھ غالب کی سی شوخی ہے:

باقی چند شاعروں کا مختصر ذکر ہے، لیکن انہیں غالب سے تلمذ نہیں تھا۔

''لوازماتِ امارت'' دو صفحے کا باب ہے۔ علم و ادب سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

اگلا باب انگریزی تعلقات ہے۔ ص ۵۳ سے ص ۶۶ تک۔ دربار اور خلعت کی بات انگریز حکام سے معاملات۔ تفصیل سے یہ باتیں، اور اس کتاب سے

زیادہ خود غالب کے خطوں میں موجود ہیں۔

تعلقات قلعۂ معلیٰ (۶۸۔۶۷) دو صفحوں میں جو کچھ ہے، اس سے زیادہ غالب کے خطوں میں تفصیلات ہیں۔

تعلقات رامپور (۱۳۹۔۶۹) بڑی تفصیل سے لکھا ہوا باب ہے۔ سارے ''واقعات'' میرزا کے خطوں میں ہیں، وہ سب یہاں کچھ اضافے کے ساتھ ہیں۔

''اصلاحِ غالب'' کا باب سولہ صفحوں پر مشتمل ہے (ص ۱۵۶۔۱۴۰)۔ لیکن اس مختصر سے باب میں عرشی نے اس وقت تک غالب کے فراہم خطوط سے حوالے دے کر ایک مبسوط باب لکھا ہے، اور غالب پر آئندہ کام کرنے والوں کے لیے نہ صرف بنیاد بلکہ طریقۂ کار اور طریقۂ تحریر بھی فراہم کیا ہے۔ عرشی نے حکیم احمد حسن مودودی کے نام، ۲/جون ۱۸۶۶ء کے ایک خط کی یہ عبارت نقل کی ہے:

> ''آپ پر، اور میر ابراہیم علی خاں پر میری جان نثار ہے۔ مضیٰ مامضیٰ۔ اب ایک ایک غزل آپ تینوں صاحب بھیج دیا کیجیے۔ اس طرح میں فرداً فرداً بعد اصلاح بھیج دیا کروں گا۔ مگر میرے قبلہ و کعبہ، واسطے خدا کے، شجرۂ منظومہ ارسال نہ فرمایے گا۔ اس کی اصلاح میری حدِ وسع سے باہر ہے۔'' (حوالہ اردوی، طبع لاہور، ص ۱۲۸)

ص ۱۴۳ پر عرشی لکھتے ہیں: ''وہ عام شاگردوں سے بھی تواضع وانکسار کے ساتھ پیش آتے تھے۔ شاگرد کو لکھتے ہیں:

> ''آپ اِس کو اپنی طرف سے استصلاح سمجھتے ہیں، اور میں اس کو اپنی جانب سے استفادہ جانتا ہوں۔''

قدر بلگرامی غالب کے بہت پڑھے لکھے شاگردوں میں سے تھے۔ ان کی کتاب ''قواعد العروض'' آج بھی آنکھوں سے لگانے کی چیز ہے۔ ''بحر الفصاحت'' کے لیے نجم الغنی رامپوری نے اس سے استفادہ کیا ہے۔ ہندی نظامِ اوزانِ شعری پر پہلی بار اردو میں دروبست کے ساتھ قدر بلگرامی نے ایک باب قواعد العروض میں شامل کیا۔ عرشی ص ۱۴۴ پر لکھتے ہیں: ''قدر بلگرامی کی استدعای اصلاح کے جواب میں لکھا ہے:

> ''خواہش آپ کی، کیا ممکن ہے کہ مقبول نہ ہو؟ جب مزاج میں آئے، آپ نظم ونثر بھیج دیا کریں۔ میں دیکھ کر بھیج دیا کروں گا۔ اور آرائشِ گفتار، یعنی حک واصلاح میں کوشش دریغ نہ ہوگی۔
>
> (حوالہ خطوط: ۱۷۷۷ (یہ عدد کچھ زیادہ معلوم ہوتا ہے، تحقیق چاہتا ہے۔ کمال)

عرشی نے قدر بلگرامی کے نام ایک اور خط سے عبارت نقل کی ہے، ادبی خطوط کے حوالے سے:

> ''حضرت۔ میں نے چاہا کہ حکم بجالاوں، اور عبارت کو اصلاح دوں، مگر کیا کروں، آپ غور کریں کہ اصلاح کی جگہ کہاں ہے۔ اگر بمشل آپ خود نظرِ ثانی میں کوئی لفظ بدلنا چاہیں، تو ہرگز جگہ نہ پائیں۔
>
> جس کاغذ پر اصلاح منظور ہوتی ہے، تو بین السطور زیادہ چھوڑتے ہیں۔''

شاگردوں کے نام غالب کے خطوں سے عرشی نے یہ شرائطِ اصلاح مرتب کی ہیں (ص ۱۴۶): شاگرد

(۱) نثر اور نظم کو چھدرا چھدرا لکھے

(۲) سطروں اور مصرعوں کے درمیان فاصلہ زیادہ چھوڑے

(۳) اتنے باریک کاغذ پر نہ لکھے، کہ دوسری طرف سیاہی کے دھبے نظر آئیں۔

(۴) تحریر کو پُر پیچ نہ بنائے،

(۵) کتابت صاف اور روشن ہو۔ پھیکی سیاہی سے ہرگز نہ لکھے۔

یہ باب یوسف علی خاں ناظم کے کلام پر اصلاحوں پہ ختم ہوتا ہے، لیکن اصلاحِ املا، اور اصلاحِ انشا کا بھی آخر میں ذکر ہے۔

انشای غالب کا باب ص ۱۵۷ شروع ہوتا ہے، اور ص ۲۰۹ پر ختم ہوتا ہے۔ انشای غالب کے سلسلے میں سب سے بڑا قضیہ یہ ہے غالب نے اردو میں خط لکھنا کب سے شروع کیے۔ زبان کا یہ قضیہ ان کی شاعری کے بارے میں بھی تھا کہ انہوں نے شاعری کی ابتدا فارسی سے کی یا اردو سے۔ یہ قضیہ اسد اور غالب تخلص کے سلسلے میں بھی تھا۔ مشکل یہ ہے کہ غالب کے بیانات، جو اُن کے خطوط میں، ان کی اپنی ذات سے متعلق ہیں جوں کے توں قبول نہیں کیے جاسکتے۔ مختلف خطوں میں متضاد بیان بھی ہیں۔ عبدالصمد کے بارے میں، اپنی عمر کے بارے میں۔ اسد میر امانی شاگرد سودا کی وجہ سے اپنا تخلص اسد کے بجائے غالب رکھنا۔

خود اپنی عمر کے بارے میں مظہر العجائب کے لیے جو کچھ انہوں نے لکھا، اور متعدد خطوں میں اپنی پیدائش آٹھویں رجب ۱۲۱۲ ہجری لکھی ہے۔ 'یادگارِ غالب' میں حالی نے بھی میرزا کی تاریخِ ولادت یہی لکھی ہے۔ لیکن ۲۱ر جون ۱۸۶۸ء کو مرزا علاء الدین خاں کو دبستانِ فارسی میں اپنی جانشینی کا جو سجل لکھا ہے، اس میں اپنی عمر چار کم اسی برس اپنے قلم سے تحریر کی ہے۔

اقبال نشان والا شان عزیز تر از جان میرزا علاؤالدین خاں کو درویش نہاد

غالب دیوانہ کی دعا پہنچے سال نگارش تمکو یاد ہوگا میں نے دلستان فارسی کا

تمکو اپنا جانشین و خلیفہ قرار دیکر ایک سجل تمکو لکھ دیا تھا اب جو

چار کم اسی برس کی عمر ہوئی اور جانا کہ حیات مستعار زندگی برسوں کیا

بلکہ مہینوں کی بھی نہیں ہے نہیں ہے کلام ہے کہ تمنے سنا ہو شاید بارہ مہینے مجھکو

ایک برس کہتے ہیں اور جیوں ورنہ ۵ چار مہینے پانچ سات یعنی دس

بیس دن کی بات رہ گئی ہے اپنی نجات [illegible] ہوس میں اپنی دستخط

سے یہ توقیع تمکو لکھ دیتا ہوں ہر فن اردو میں نظماً و نثراً تم میرے جانشین

ہو جانا چاہئے ہے میرے جاننے والے تمکو میری جگہ جانیں جب مجھکو جانتے تھے

ویسا تمکو جانیں اور جس طرح مجھکو مانتے تھے تمکو مانیں کل شیء ہالک

الا وجہہ ذو الجلال والاکرام پنجشنبہ سلخ [illegible]

ویبقی وجہ ربک

[illegible] ۱۲۸۵ء دہلی

یادگارِ غالب میں نثرِ اُردو کا باب حالیؔ نے ان الفاظ سے شروع کیا ہے:

’’معلوم ہوتا ہے کہ مرزا ۱۸۵۰ء تک ہمیشہ فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے۔ مگر سنہ مذکورہ میں جب وہ تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور کیے گئے، اور ہمہ تن ’’مہر نیمروز‘‘ کے لکھنے میں مصروف ہو گئے، اس وقت بضرورت ان کو اردو میں خط و کتابت کرنی پڑی ہو گی۔ وہ فارسی نثر میں، اور اکثر فارسی خطوط، جن میں قوتِ متخیلہ کا عمل اور شاعری کا عنصر نظم سے بھی کسی قدر غالب معلوم ہوتا ہے، نہایت کاوش سے لکھتے تھے۔ پس جب اُن کی ہمت ’’مہر نیمروز‘‘ کی ترتیب اور انشا میں مصروف تھی، ضرور ہے، کہ اس وقت ان کو فارسی زبان میں خط و

کتابت کرنی، اور وہ بھی اپنی طرزِ خاص میں، شاق
معلوم ہوئی ہوگی، اس لیے قیاس چاہتا ہے کہ اُنہوں
نے غالباً ۱۸۵۰ء کے بعد اردو زبان میں خط لکھنے شروع
کیے ہیں، چنانچہ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

'زبانِ فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔
پیرانہ سری اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی اور
جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی......؟

حالی بے حد لائقِ احترام شخصیت ہیں۔ غالب پر تحقیق اور تنقید کا بڑا حصّہ آج بھی ان کی تحریروں کی تشریح ہے۔ لیکن اُن کے اس قیاس سے اتفاق کرنا ممکن نہیں۔ یہ اُن کی تحقیق نہیں، اُن کا مشاہدہ بھی نہیں، قیاس ہے، اور وہ بھی اگرچہ غالب ہی کی ایک تحریر کی بنیاد پر ہے، لیکن غالب کی اس تحریر سے مطابقت حالات، واقعات اور حقائق سے نہیں۔ فارسی زبان کے سلسلے میں میرزا کو نفسِ مطمئنہ حاصل تھا، اور بقول اُن کے فارسی ان کے مزاج میں ایسی رچی ہوئی تھی، جیسے فولاد میں جوہر، وہ یہ بھی مانتے تھے، بلکہ اس پر انہیں اصرار تھا فارسی سے اُنہیں فطری لگاؤ ہے۔ ۷/اکتوبر ۱۸۶۶ء کے خط میں کلبِ علی خاں، نواب رامپور کو انہوں نے لکھا۔ ''بدو فطرت سے میری طبیعت کو زبانِ فارسی سے ایک لگاؤ تھا۔ چاہتا تھا کہ فرہنگوں سے بڑھ کر کوئی ماخذ مجھے ملے۔ بارے مراد بر آئی، اور اکابرِ پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا، اور اکبرآباد میں فقیر کے مکان پر دو برس رہا، اور میں نے اُس سے آج جس طرح ثانوی سے لے کر ایم۔ اے تک کے طلبہ اور طالبات روانی سے انگریزی بولتے ہیں، بے جھجک۔ ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں، اور نوجوان نامہ نگار مختلف شہروں سے رپورٹنگ کرتے ہیں، فی البدیہہ، اسی طرح اس زمانے میں غالب، سرسید وغیرہ اردو بھی بولتے تھے

اور فارسی بھی۔ چھاپہ خانہ ہندوستان میں آچکا تھا۔ اردو اخبارات نکلتے تھے۔ مولوی کریم الدین نے اردو میں کتابیں چھاپی تھیں۔ سرسید اگرچہ عمر میں غالب سے چھوٹے تھے، لیکن اردو کو ان کی کتابوں سے نکھرنے کا موقعہ ملا تھا۔ فورٹ ولیم کالج کی اردو کتابیں، انشا کی کہانی، رانی کیتکی کی چھپ چکی تھیں۔ اردو میں پہیلیوں، معما، اور ایہام کی شاعری ختم ہوچکی تھی۔ میرؔ، سوداؔ، مصحفیؔ، انشاؔ، ناسخؔ، غالبؔ، ذوقؔ، مومنؔ، داغؔ، امیر مینائی اور بیسیوں شعرا مقبول ہوچکے تھے۔ آتشؔ، دیاشنکر نسیمؔ، میر حسن، انیسؔ، دبیرؔ۔ سب کی شاعری سے زبان منجھی۔ فارسی کی جگہ ادب میں اردو لے چکی تھی۔ یہ کہنا کہ فارسی نثر لکھنا غالب کے لیے مشقت کا کام تھا، غالب کے ساتھ زیادتی ہے۔ غالب نے ۱۸۵۰ء سے پہلے ہی اردو میں خط لکھے۔ تفتہؔ کے نام کا ایک خط باقی رہا۔ اور باقی نہ رہے تو کیا ہوا۔ آخر سب خط ان کے، ان کی تحریر میں کہاں باقی رہے۔ لیکن عودِ ہندی ان کی زندگی میں مرتب ہوچکا تھا۔ اردوے معلّٰی بعد میں شائع ہوا۔ اردو میں خط لکھنا وقت کا تقاضہ بھی تھا، اور تاریخی جبر بھی۔ لیکن خلاصۂ بحث کے تحت عرشیؔ لکھتے ہیں:

> ''.....میرزا صاحب ایک ایسے دشوار گزار مسلکِ فارسی نگاری کے موجد تھے، جو اطمینانِ خاطر و توانائی دماغ و قلب کا مقتضی تھا۔ ۱۸۵۰ء (۱۲۶۶ھ) تک یہ دونوں اسباب میسّر رہے، اس لیے میرزا صاحب اسی زبان میں خامہ فرسائی کرتے رہے۔ سنہ مذکورہ میں بہادر شاہ ظفر نے تاریخ نگاری کی خدمت سپرد کی، اور فراغ خاطر میں کمی ہوگئی تو میرزا صاحب نے اردو نثر کو زیادہ نوازنا شروع کیا۔ ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۴ء) میں ذوق کا

انتقال ہوا تو اصلاحِ کلام بھی میرزا صاحب کے سپرد کی
گئی، اور یہ فرصت سے محروم ہو گئے.....''

عرشی کے یہاں حالی کے خیال کی گونج ہے۔ ذو لسانی لوگوں کے لیے، موضوع اور خیال کی اہمیت ہوتی ہے۔ ادیب اپنے لیے بھی لکھتا ہے، لیکن مرکزی حیثیت قاری کی ہوتی ہے، اور اسلوب وہ اختیار کیا جاتا ہے، جو قاری تک خیال کی ترسیل کر سکے۔ مصنف کے انفرادی اسلوب پر بھی ترسیل اور ابلاغ کا مقصد حاوی ہوتا ہے۔ غالب ذولسانی تھے، اس لیے یہ بحث کچھ بہت زیادہ بامعنی نہیں۔ کلاسیکی فارسی نثر مغلق ہے۔ امیر خسرو اور ابوالفضل شفاف ہے۔ غالب کی نثر مغلق نہیں، لیکن روشِ عام، یعنی رائج فارسی نثر سے مختلف ہے، جسے وہ متصدیوں کی عبارت آرائی کہتے ہیں۔ قدیم پارسی اور متروک فارسی کو بھی عقیدت سے دیکھتے تھے۔ دستنبو میں تو انہوں نے کمال ہی کر دیا۔ بے آمیزشِ عربی لغت، انہوں نے غیر مانوس نثر لکھی، اور دساتیر کو سمجھے بغیر اس سے عقیدت رکھتے تھے، اور دساتیری الفاظ کو برتنے کی بھی کوشش کرتے تھے۔

ص ۱۶۲ پر عرشی، غالب کی تحریر کا حوالہ دیتے ہیں:

''جناب ریڈ صاحب، صاحبی کرتے ہیں میں اردو میں اپنا کمال کیا ظاہر کر سکتا ہوں۔ اس میں گنجائش عبارت آرائی کی کہاں ہے۔ بہت ہوگا تو یہ ہوگا کہ میرا اردو بہ نسبت اوروں کے اردو کے فصیح ہوگا۔''

''چار جنوری سنہ ۵۹ء کو سہ بارہ بگڑ کر لکھا: 'میاں اردو کیا لکھوں۔ میرا یہ منصب ہے کہ مجھ پر اردو کی فرمائش ہو؟''

اس کے باوجود میرزا صاحب یہ ضرور جانتے تھے کہ ان

کا کلام نظم ہو یا نثر، حسن و خوبی کے اس درجے پر پہنچ
چکا ہے، جسے علمائے بلاغت سہلِ ممتنع کہتے ہیں۔''

ایک حصہ واقعی غالب کے کلام کا ایسا ہے، جو سہلِ ممتنع کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے۔ لیکن اعلیٰ پیمانے کا سہلِ ممتنع کچھ بہت زیادہ نہیں ہے۔ اس زمرے میں جس کلام کو رکھا جاسکتا ہے، اسکے بیشتر حصے کے بارے میں خود غالب کا خیال ہے:

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ
کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

عرشیؔ کا یہ خیال درست ہے کہ ''میرزا صاحب نے تحریر کو تقریر کا پیرایہ دیا۔ تھا۔'' حقیقتاً یہ خود غالب کے ایک قول سے مستفاد ہے۔ عرشیؔ نے اگر یہ لکھا ہوتا کہ میرزا صاحب نے تقریر کو تحریر کا پیرایہ دیا، تو شاید زیادہ درست ہوتا، اور وہ بھی صرف اردو نثر میں۔ جدید اردو نثر کے بانی، اس عہد کے اردو اخبار، فورٹ ولیم کالج کی اردو کتابیں، اور سرسیّد اور ان کے رفقا، خاص طور سے حالی اور نذیر احمد ہیں۔ غالب کی نثر میں انشایے کا لطف ہے، لیکن یہ نثری انشائیہ نہیں۔ یہی اس کی شناخت ہے، اور یہی اس کے دستخط۔

--

ص ۲۱۰ سے ص ۲۱۸ تک متعلقاتِ انشا کا باب ہے، جس میں مثالیں اور تصریحات ہیں۔ یہ پچھلے باب کا ضمیمہ ہے۔

ص ۲۱۹ سے ۲۳۴ تک املای غالب کا باب ہے۔ یہ بہت اہم باب ہے، اور اس سے نہ صرف غالب کے طرزِ انشاء پر روشنی پڑتی ہے، بلکہ وہ مصلحِ املا بھی قرار پاتے ہیں۔ زبان کی طرح، املا بھی نامیاتی ہے، اور اس میں تبدیلیاں آتی ہیں۔ وہ خالص پسند تھے، اور جز، یعنی مادّے کی اصل یا جز کو بنیادی اہمیت دیتے تھے، اور ماضی میں جتنی دور ممکن ہوسکتا تھا، جانے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن الفاظ کسی سردخانے میں

زندہ نہیں رہ سکتے۔ رواج، اور ضرورت کے تحت تلفظ اور املا میں تبدیلی، زبان کی نشوونما سے جڑی ہوئی ہے۔ اس تبدیلی کو وہ ابتذال اور غیر ثقہ مانتے تھے۔ عرشی نے اس اہم نکتہ سے بحث نہیں کی ہے، صرف مثالوں سے میرزا کی روش کی وضاحت کی ہے۔ ص ۲۱۸ پر میرزا کی عبارت نقل کرتے ہیں:

"پردۂ، رفتۂ۔ یہ جتنے الفاظ ہیں، ان میں یای تحتانی نہیں لکھتے۔ بس وہی ہای ابنای حرکت رہتی ہے۔ پس اگر وہ ساکن ہے تو رفتہ، بردہ اس صورت پر رہے گی۔ اور اس کو حرکت لازم آئے تو علامتِ حرکت ہمزہ لکھ دیا جائے گا۔ رفتۂ، آمدۂ، اور ان مفعول کے سب صیغوں میں یہی حال ہے۔" (خطوط ۱۔ ۱۱۹)

عرشی عربی اور فارسی کے عالم تھے۔ ان کے عہد میں ایران میں، نون غنہ، نون معلنہ ہو چکا تھا، نہ صرف خواندگی میں تبدیلیاں ہوئی تھیں، بلکہ املا میں بھی۔

آج سے ۶۵ برس حافظ کی ایک غزل اس املا کے ساتھ پڑھائی گئی تھی:

اے کے باسلسلۂ زلفِ دراز آمدۂ
فرصت باد کہ دیوانہ نواز آمدۂ

عادتاً میں آج بھی یہی املا لکھتا ہوں۔ لیکن ایران کا نیا املا یہ ہے:

اے کہ با سلسلۂ زُلفِ دراز آمدہ ای
فرصت باد......الخ

نئے املا میں فارسی کی کتابیں پڑھنے میں الجھن نہیں ہوتی، لیکن آشیاں کو آشین نہیں پڑھتا۔

ص ۲۲۰ پر عرشی لکھتے ہیں:

> ”بیتاب رامپوری کے کاتب دیوان نے ”طیمور“ لکھا تھا۔اس پر فرماتے ہیں: یہ لفظ طوی سے نہیں، ”تے“ سے ہے،اور پھر تیمور بہ وزن تنبور نہیں۔ دراصل تمر بہ وزن سہ دُر ہے۔

میرزا کی ہدایت واضح نہیں ہے۔ سہ دُر کا وزن فع لن ہے۔ عرشی نے بھی اس پہ اظہار خیال نہیں کیا ہے۔ تیمور میں واو معدولہ مان لیں تو یہ کس کھاتے میں رکھیں گے؟ حقیقت یہ ہے کہ تیمور بہ وزن منصور عہدِ غالب میں بھی رائج تھا، اور بعد میں بھی اسی طرح رائج رہا۔ ”سلاطین تیموریہ“ تاریخ میں ہمیں بھی پڑھایا گیا تھا۔ غلام قادر روہیلہ پر علامہ اقبال کی جو نظم ہے، اس میں تیمور اپنے معروف وزن پر نظم ہوا ہے۔

ص ۲۲۲ پر عرشی لکھتے ہیں:

> ”خور اور خورشید کا عام املا بواو ہے۔ میرزا صاحب خرشید کو بے واو، اور خور کو، صرف خر سے التباس دور کرنے کے خیال سے پورا لکھا کرتے تھے۔ ان کی رائے یہ تھی کہ پارسی قدیم میں خُر بضم الخا نورِ قاہر کو کہتے ہیں۔ شید، بکسر شین کے معنی روشنی ہیں۔ ایرانی آفتاب کو بعد از خدا بزرگ جانتے تھے۔ اس لیے انہوں نے سورج کو خُر اور خورشید کہا۔ جب عرب اور عجم مل گئے، اکابر عرب نے، واسطے دفعِ التباس کے خُر میں واو معدولہ بڑھا کر، خور لکھنا شروع کیا۔“

یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اکابر زبان نہیں بناتے۔ زبان کی نشو و نما کا عمل عوام کی زبانوں سے ہوتا ہے، اور وہی زبان کی ٹکسال ہیں۔

ساٹھ برس سے زیادہ سے نثر اور نظم لکھ نہ صرف اپنا نامۂ اعمال سیاہ کیا، بلکہ اسی سے روٹی روزی کمائی۔ اور علوم کی طرح لسانیات کا بھی مطالعہ کیا، اور اردو میں اس پر کام بھی کیا۔ اس لیے یہاں کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا۔ زبان ذریعۂ اظہار ہے، اور اس کا بنیادی کام ترسیل اور ابلاغ ہے۔ ترسیل اور ابلاغ میں غالب ماہر یا کامل ہے، یہ الزام ان پر نہیں لگایا جاسکتا۔ معمہ اور ایہام، اور تعقیدِ معنوی ان کے اسلوب کا غالب رجحان ہے۔ معاشرے اور معاشرت میں تبدیلی ارتقا کا نتیجہ بھی ہے اور وجہ بھی۔ یہ ارتقا زبان میں بھی جاری رہتا ہے۔ کسی زندہ زبان کو ایک حالت پر قرار نہیں۔ ہر پیڑھی پچھلی پیڑھی سے زبان ورثے میں پاتی ہے۔ اس کے باوجود اس کی زبان پچھلی پیڑھی سے ان معنوں میں مختلف ہوتی ہے کہ کچھ لفظ ترک ہو جاتے ہیں، اور کچھ لفظوں کا سماجی ضرورتوں کی وجہ سے اضافہ ہو جاتا ہے۔ نہ کوئی پیڑھی، اگلی پیڑھی یا اس کی زبان کو عاق کر سکتی ہے، اور نہ نئی پیڑھی کو اس پر مجبور کر سکتی ہے کہ پچھلی پیڑھیوں کی بنائی ہوئی لغت، یہاں تک کہ قواعد کی بھی پابند رہے۔ قواعد زیادہ دور تک متحرک اور توانا رہتی ہے، لیکن لغت کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جاسکتی۔ ہر پیڑھی کی لغت اگلی پیڑھی کے لیے اضافوں کی محتاج ہوتی ہے۔ ہم اردو والے شاید زیادہ ہی قدامت پرست ہیں، اور ہمارا امیلانِ طبع زبان کے سلسلے میں جامد ہے۔ کچھ آج سے نہیں، لغت پرست، پرانے لغات کو زیادہ معتبر جانتے ہیں۔ قدیم لغات، قدیم کتابوں کے مفاہیم تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ہیں۔ آج کی ضروریات کے لیے، ان کو جوں کا توں چھاپنا صحت مندرویہ نہیں ہے۔ آج کی زبان کے قدیم، قدیم تر اور قدیم ترین اساتذہ کے کلام سے سند لانا مناسب نہیں۔

یہی جامد ذہنی رجحان زبان اور محاورے کے سلسلے میں غالب کا بھی تھا، اور اسے ہم اُن کی سب سے بڑی کمزوری کہنے میں حق بجانب ہوں گے۔ یہ رجحان

انہیں ورثے میں نہیں ملا تھا، کیونکہ توقان بیگ سے لے کر ان تک ان کے علاوہ کوئی صاحبِ قلم نہیں تھا۔ انہوں نے ایک رجحان اپنایا، اور اپنی جودتِ طبع سے اس میں غلو، ابلاغ اور مبالغہ۔ سب روا رکھا۔ اپنے لیے اور اپنے شاگردوں کے لیے جو کسوٹی بنائی اور اُسے تقدیس بخشی، اُس سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ غالب کے شاگردوں کی فہرست تو طویل ہے، لیکن کسی کا ایک شعر بھی زبانوں پر نہ چڑھ سکا۔

ص ۲۲۳ پر عرشی لکھتے ہیں:

''میرزا صاحب ذ (ذال) کو بھی عربی کے مخصوص حرفوں میں شمار کرتے تھے۔ بیتاب کے مسودے میں حذف تھا۔ اسے حزف بنا کر لکھا: ''حزف بہ معنی ٹھیکری کے لغتِ فارسی، اور املا 'ز' سے ہے''۔ گذشتن، پذیرفتن وغیرہ فارسی مصادر کے تمام مشتقات میں، جہاں 'ذ' مروّج ہے، میرزا صاحب نے 'ز' استعمال کی ہے۔ ناظم نے سرگذشت لکھا تھا، تو اسے سرگزشت بنایا ہے۔ ڈاکٹر صدیقی صاحب فرماتے ہیں، وگذاشتن، پذیرفتن۔ یہ سب لفظ 'ذال' سے ہیں۔ البتہ گزاردن زے سے صحیح ہے۔ میرزا غالب نے پہلے نادانی سے، پھر سخن پروری اور سینہ زوری سے 'ذ' کو فارسی سے خارج کرنے کی کوشش کی۔ اردو میں یہ لفظ 'ز' سے لکھیے تو مضائقہ نہیں، مگر فارسی میں 'ذ' سے لکھنا ضروری ہے''

عقل یہ بات قبول نہیں کرتی کہ 'ذال' جب عربی کے دخیل لفظوں کے ساتھ فارسی میں آیا، تو کوئی لفظ فارسی میں ایسا نہ بنا، وضع ہوا جس میں یہ لفظ ہو۔ عربی حروف فارسی کے

ساتھ شمالی ہند میں آئے۔ اور 'ذرا' لفظ اردو کا ہے۔ کاغذ فارسی لفظ ہے، جو عربی میں ایران سے گیا۔ ذہن، عقل، سمجھنا، زیرکی کے معنوں میں عربی لغت ہے، لیکن ایک فارسی لفظ بھی 'ذہن' ذال سے ہے، جس کے معنی تہ اور باطن ہیں۔ غالب کا ذہنی رویہ اسی سے ظاہر ہے کہ وہ پذیرفتن، فہمیدن، گذشتن وغیرہ کو جعلی مصدر کہتے ہیں۔ 'دساتیر' جعلی کتاب کی وہ قسمیں کھاتے ہیں، اور دساتیر کے coded الفاظ کو، ایک طرح سے ان معنوں میں جعلی ہیں، اصلی اور اصلی سے زیادہ پاکیزہ مانتے ہیں۔ لطف کی بات تو یہ ہے کہ ان کی مادری زبان ترکی تھی، جس سے شاید وہ نابلد تھے!

ص ۲۳۲ پر عرشی نے غالب کی تحریروں میں املا کی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔ بالکل اور بالفعل وغیرہ میں واقعی سہو ہوا ہے۔ لیکن سونچ اور سونچنا غلط نہیں ہے۔ چانول کی طرح سونچ میں بھی پہلے انفیت عام تھی، اور کچھ لوگ، ثقہ لوگ بولتے تھے۔ لکھنؤ میں سونچ اور سونچنا ابھی تک رائج ہے۔ اور یہ لفظ اسی املا سے آنند نراین ملا کے کلام کے مجموعوں میں بھی ملیں گے۔ لکھنؤ میں سونچ اور سونچنا ابھی تک بولا جاتا ہے۔ پانچ سو کے بجائے پان سے بولتے ہیں، اور خطوں میں لکھتے بھی ہیں۔

'طباعتِ خطوط' کا باب ص ۲۳۴ سے ص ۲۵۴ تک پھیلا ہوا ہے، اور ساری تاریخ ان خطوں کے جمع کرنے اور طباعت کی ایجاز کے ساتھ بیان کی گئی۔ یہ بات بھی کہ میرزا خطوں کے شائع کے جانے کے حق میں نہیں تھے۔

یوسف علی خاں ناظم اور کلبِ علی خاں کے نام خطوط، بقول عرشی، ۳۶۴ ہوتی، لیکن مثلوں میں ایسے حوالے ملے جن سے یہ بات سامنے آئی کہ ۱۳۵ خط ذخیرے میں نہیں ہیں۔ سید محمد عباس علی خاں کے علاوہ، منشی سیالچند (میر منشی، خلیفہ احمد علی رامپوری، مالک مطبع مولوی محمد حسین خاں کے نام بھی خط ہیں۔

ص ۱۱۸ سے ص ۲۰۵ تک حواشی ہیں، جن کے لکھنے اور ترتیب دینے میں عرشی کو بڑی عرق ریزی کرنا پڑی ہوگی۔ نہایت اہم اور مفید معلومات ان حواشی

میں ہیں، اوران سے عرشی کے تبحرِ علمی اور ذوقِ تحقیق کا پتہ چلتا ہے۔ جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

حوالہ:

۱۔ مکاتیب میں مصرع یہ ہے: لکھ دیا لکھتے تو لیکن پھر جو کچھ رحم آ گیا

۲۔ یہ بات حلق سے اس لیے نہیں اُترتی کہ دیوانِ غالب میں اسد تخلص کے مقطعوں کی تعداد غالب تخلص کے مقطعوں سے زیادہ ہے۔ پھر اسد میر امانی کچھ ایسے بُرے شاعر بھی نہیں تھے۔ تذکروں میں ان کے ترجمے ہیں۔ مصطفےٰ خاں شیفتہ کے تذکرے 'گلشن بے خار' میں نمونے کے یہ شعر بھی ہیں:

جوں تو اسد کو لائے تھے اس کی گلی سے ہم
خانہ خراب راہ میں آکر مچل گیا
بزمِ بتاں ہو، جام ہو، خلوت ہو، پھر تو بس
کافر ہوں گر وہاں میں خدا کا بھی ڈر کروں
پروانے پڑے جلتے ہیں، روتی ہے کھڑی شمع
یارب نہ شب وصل ہو کوتاہ کسی کی
جس سے کہ دل ملا تھا، جب آیا وہ سامنے
ہلنے نہ پائے ہونٹ کہ سو بات ہو گئی!

انھی اسد میر امانی کی ایک غزل تھی: دلِ بے تاب کے سینے میں دم چند رہا۔۔ بدمِ چند... الخ... پر میاں ہدایت نے تضمین کی تھی۔ یہ غزل نصر اللہ خاں خویشگی کے تذکرے "گلشن ہمیشہ بہار" میں میر امانی کے ترجمے میں موجود ہے۔ نسخۂ عرشی کے دوسرے ایڈیشن میں (جو انہوں نے مرتب نہیں کی، ان کے نام سے مرتب کیا گیا) یہ غزل اس جعلی دیوانِ غالب، مبینہ طور پر بخطِ غالب سے نقل کی گئی، جو غالب کی سویں برسی پر برآمد کیا گیا، ہندوستان میں نسخۂ عرشی زادہ کے نام سے پاکستان میں 'نقوش' نے نسخۂ امروہہ کے نام سے عکسی شائع ہوا۔ حقیر نے بیاضِ غالب تحقیقی جائزہ میں اسی کو پرکھا ہے۔

مکرّم الدولہ بہادر بیگ خان اور غالب علی خاں، دونوں کے تخلص غالب تھے، اس لیے دوسرے کسی شاعر سے التباس نہ ہو، تو یہ مقصد بھی تخلص بدلنے سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔

۳۔ یہاں تضاد ہے۔ یہ لفظ عربوں کے ایران آنے، اور عربی رسم خط بنانے سے پہلے کی بات ہے۔ خورشید بہ واو کے ساتھ، جب واو معدولہ نہیں تھا۔ خرشید کیوں نہیں؟

۴۔ التباس کس لفظ سے۔ عربی میں کوئی لفظ خُر، خ کے ضمہ سے نہیں ہے۔ کم از کم ان لغات اور فرہنگوں میں، جو میرے ذخیرے میں نہیں ہیں۔ جب ذال، کاف، رائے عربی میں دو لفظ مختلف معنوں کے بنتے ہیں، تو اُن کے املا میں جب فرق کرنے کے لیے کچھ مداخلت نہیں کی گئی تو خُر میں واو معدولہ داخل کرنے کی منطق ذہن قبول نہیں کرتا۔

۵۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی

غالبؔ کے پُرزے

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ دنیائے ادب کی ایک بے مثال اور اردو کی ایک لازوال شخصیت کا نام ہے۔ ہماری ادبی روایت میں شعر اور نثر کی اپنی اپنی تخصیص یہ رہی ہے کہ شعر فضا میں گونجتی ہوئی آواز کی طرح خود بخود بھی کانوں میں جا پڑتا ہے جب کہ نثر باقاعدہ پڑھنی پڑتی ہے۔ اور پڑھنے کا معاملہ یہ ہے کہ اس میں خواندگی کی صلاحیت ہی ضروری نہیں ذوقِ مطالعہ بھی شرط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم جتنے آشنا غالب کی شاعری سے ہیں اتنے متعارف غالب کی نثر سے نہیں۔ ایک لکھنے والے فن کار کی حیثیت سے غالب بائی لنگول (bilingual) تھے۔ غالب کے ہر قاری کا معاملہ یہ نہیں۔ غالب اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے بے مثال ادیب اور عظیم شاعر تھے۔ آج غالب کے بیشتر قاری بلکہ قارئینِ کرام تک فارسی سے نابلد ہیں۔ بہر حال جس طرح لفافہ دیکھ کر خط کا مضمون بھانپ لیا جاتا ہے اسی طرح ہم میں سے

بیشتر اردو والے غالب کے محض اردو کلام اور اردو خطوط کے ذریعے پورے غالب کو بھانپنے کے عمل میں مشغول چلے آرہے ہیں۔ایں ہم بسا غنیمت است۔

غالب کی شاعری اور اس کے خطوط کا مطالعہ ایک ایسا تجربہ ہے جس سے گزرنے کے بعد ہم کچھ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ غالب ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جو فضا میں معلق ہے اور یہی اسکالانچنگ پیڈ ہے جہاں سے کبھی وہ ایک شاعر کی حیثیت سے آسمان کی لامتناہی بلندیوں میں پرواز کرتا نظر آتا ہے اور کبھی نثر نگار کی صورت میں زمین کی کششِ ثقل کے سبب کریش کرتے ہوئے جہاز کی مانند زمینی سچائیوں کی پتھریلی سطح پر نوز ڈائو کرتے ہوئے پُرزہ پُرزہ ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ غالب کے ان اُڑے ہوئے پُرزوں کا تماشا غالب کے خطوط کی ان چار بلکہ پانچ جلدوں میں بند ہے جنھیں خلیق انجم نے ''غالب کے خطوط'' کے نام سے بڑی کاوش سے ترتیب دے کر یکجا کر دیا ہے جس سے غالب کے تمام خطوط تک ایک ساتھ رسائی اب آسان ہوگئی ہے۔غرض غالب کی مثال کسی کارنیوال یا تفریح گاہ میں لگے ایسے الٹ پلٹ آئینے کی ہے جہاں نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خان غالب اس آئینے کے ایک رُخ میں 'عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ' کی صورت 'گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج' نظر آتے ہیں اور دوسرے رُخ میں خستہ وخراب، زار زار روتے اور ہائے ہائے کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

غالب کو جب جہانِ شعر میں دیکھیے تو وہ کسی دوسرے ہی جہان کا آدمی نظر آتا ہے۔حیات وکائنات کے مسائل کے ساتھ زور آزماتا ہوا جسے دیکھ کر ہم دانتوں میں انگلی دبا کر یہ سوچتے رہ جاتے ہیں: 'ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا'؟ آیئے زمین پر آنے سے پہلے ہزاروں بار کے پڑھے ہوئے غالب کے یہ چند اشعار ذہن میں تازہ کرتے چلیں تاکہ آگے کی بات چیت کے دوران غالب کی زندگی میں خلا کی بلندیوں

اور زمین کی پستیوں سے پیدا ہونے والے تفاوت کا وہ کتھارسس بنا رہے جو ہر بڑے آدمی کا مقدر ہوتا ہے:

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے اِدھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

--

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

--

نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کفِ خاک
آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

--

ہر قدم دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

--

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

--

غالب، جس کے کلام کو 'الہامی' بھی کہا جاتا ہے، اس کا کچھ نمونہ آپ نے دیکھا۔ اب ذرا یہ بھی سنیے کہ وہ مرزا قربان علی بیگ خاں سالک سے کیا دُکھڑا رو رہے ہیں:

''اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش

ہوتا ہوں، یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے۔ جو
دکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتا ہوں کہ لو، غالب کے ایک اور
جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی
داں ہوں، آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب تو
قرض داروں کو جواب دے۔ سچ تو یہ ہے کہ غالب کیا
مرا بڑا ملحد مرا، بڑا کافر مرا۔ ہم نے، ازراہِ تعظیم جیسا
بادشاہوں کو بعد ان کے 'جنت آرام گاہ' و 'عرش نشیمن'
خطاب دیتے ہیں، چوں کہ یہ اپنے کو 'شاہِ قلمروِ سخن' جانتا
تھا 'سقر مقر' اور 'ہاویہ زاویہ' خطاب رکھا ہے۔

آیئے نجم الدولہ بہادر ایک قرض دار کا گریبان
میں ہاتھ، ایک قرض دار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں ان سے
پوچھ رہا ہوں۔ اجی حضرت نواب صاحب کیسے آپ
سلجوقی اور افراسیابی ہیں۔ یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے۔
کچھ تو اکسو، کچھ تو بولو۔ بولے کیا بے حیا، بے غیرت۔
کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا،
میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لیے جاتا
ہے۔ یہ بھی تو سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا''۔

غالب کے خطوط، غالب کی زندگی اور ان کی شخصیت کے گوناگوں پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔ کسی بھی آرائشِ بیان سے پاک یہ بالکل شفاف (transparent) تحریریں ہیں جن میں بیان ہونے والے بیشتر حقائق فکشن سے زیادہ چسک دار لگتے ہیں۔ زندگی نے اسے کتنا رسوا اور ذلیل کیا ہے، غالب یہ خوب جانتا ہے اس لیے اس

سے پہلے کہ کوئی اور اس کا مضحکہ اڑائے اس نے اپنا مضحکہ اڑانے کا حق خود اپنے پاس رکھا ہے۔ فی الحال علاء الدین احمد خاں علائی کے نام ایک خط میں اسم نہ نکالنے کا ایک لطیف عذر ملاحظہ کیجیے:

> ''تم سخن ور ہو گئے۔ حسنِ طبع خداداد رکھتے ہو۔ ولادت فرزند کی تاریخ کیوں نہ کہو۔ اسمِ تاریخی کیوں نہ نکالو کہ مجھ پیر غم زدہ، دلِ مردہ کو تکلیف دو، علاء الدین خاں تیری جان کی قسم، میں نے پہلے لڑکے کا اسمِ تاریخی نظم کر دیا تھا اور وہ لڑکا نہ جیا۔ مجھ کو اس وہم نے گھیرا ہے کہ میری نحوستِ طالع کی تاثیر تھی۔ میرا ممدوح جیتا نہیں۔ نصیر الدین حیدر اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چل دیے، واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے پھر نہ سنبھل سکے۔ جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے وہ عدم سے بھی پرے پہنچا۔ نہ صاحب دوہائی خدا کی میں نہ تاریخِ ولادت کہوں گا نہ نامِ تاریخ ڈھونڈوں گا۔ حق تعالیٰ تم کو اور تمہاری اولاد کو سلامت رکھے''۔

عام آدمی جب دوزخ میں جاتا ہے تو اسے جہنم رسید کہا جاتا ہے۔ غالب کے لیے دوزخ میں جانا بھی سعادت کا درجہ رکھتا ہے، جواز یہ ہے۔ علائی کو لکھتے ہیں:

> ''اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہوگا بلکہ میں دوزخ کا ایندھن ہوں گا اور دوزخ کی آنچ کو تیز کروں گا تا کہ مشرکین اور منکرین نبوّت مصطفوی و

امامتِ مرتضوی اس میں جلیں ۔

سخن ناشناس لوگ غالب کو سخت گراں گزرتے ہیں تاہم ایسا کوئی شخص جسے سخن سنجی سے کوئی علاقہ نہ ہو مگر سخن سنجی کے میدان میں قدم رکھنے کی جرأت رکھتا ہو تو وہ ان کے لیے تفریح کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ نواب انوار الدولہ سعد الدین خاں شفق کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''ایک لطیفہ نشاط انگیز سنیے۔ ڈاک کا ہرکارہ جو بلّی ماروں کے خطوط پہنچاتا ہے، ان دنوں میں ایک بنیا پڑھا لکھا حرف شناس، کوئی فلاں ناتھ یا ڈھمک داس ہے.... حویلی میں آکر اس نے داروغہ کو خط دیا اور اس نے خط دے کر مجھ سے کہا کہ ڈاک کا ہرکارہ بندگی عرض کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مبارک ہو آپ کو جیسا کہ دلّی کے بادشاہ نے نوابی کا خطاب دیا تھا، اب کالپی سے خطاب کپتانی کا ملا۔ حیران کہ یہ کیا کہتا ہے۔ سرنامے کو غور سے دیکھا، کہیں قبل از اسم 'مخدومِ نیاز کیشاں' لکھا اس قرمساق نے اور الفاظ سے قطع نظر کر کے 'کیشاں' کو 'کپتاں' پڑھا''۔

تاہم خود کو سخن شناس سمجھنے والوں کی سخن شناسی سے غالب واقعی عاجز تھے۔ اس سلسلے کی ایک دو مثالیں یہ ہیں۔ مولوی عبدالرزاق شاکر کو 'قاطع برہان' کے قضیے کے تعلق سے لکھتے ہیں اور کس جھلاہٹ کے ساتھ لکھتے ہیں:

''نامہ غالب کا مکتوب الیہ رحیم بیگ نامی میرٹھ کا رہنے والا ہے۔ دس برس سے اندھا ہو گیا ہے۔ کتاب پڑھ

نہیں سکتا، سن لیتا ہے۔ عبارت لکھ نہیں سکتا لکھوا
دیتا ہے۔ بلکہ اس کے ہم وطن ایسا کہتے ہیں کہ قوت علمی
بھی نہیں رکھتا، اوروں سے مدد لیتا ہے۔ اہلِ دہلی کہتے
ہیں مولوی امام بخش صہبائی سے اس کو تلمذ نہیں ہے۔
اپنا اعتبار بڑھانے کو اپنے کو ان کا شاگرد بتاتا ہے۔ میں
کہتا ہوں کہ وائے اس ہیچ پوچ پر جس کو صہبائی کا تلمذ
موجب عز و وقار ہو"۔

غالب کے اس بیان میں ایک نفسیاتی گرہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے رحیم بیگ کے ساتھ مولوی امام بخش صہبائی کو بھی لپیٹ لیا۔ اس اجمال کی تفصیل میں جانے کا یہاں محل نہیں کہ غالب نے ایسا کیوں کیا۔ اسی طرح غیاث اللغات کے مولف کے بارے میں انورالدولہ شفق کو لکھتے ہیں:

"آپ جانتے بھی ہیں یہ کون ہے۔ ایک معلم فرومایہ،
رام پور کا رہنے والا، فارسی سے ناآشنائے محض اور صرف
ونحو میں ناتمام۔ 'انشائے خلیفہ' و 'منشآتِ مادھورام' کا
پڑھانے والا۔ چناں چہ دیباچے میں اپنا مآخذ بھی اس
نے خلیفہ شاہ محمد و مادھورام و غنیمت و قتیل کے کلام کو
لکھا ہے۔ یہ لوگ راہِ سخن کے غول ہیں آدمی کے گمراہ
کرنے والے، یہ فارسی کو کیا جانیں، ہاں طبع موزوں
رکھتے تھے، شعر کہتے تھے:

ہر زہ مشتاب و پے جادہ شناساں بردار
اے کہ در راہِ سخن چوں تو ہزار آمد و رفت"

صاحبِ عالم مارہروی کو عبدالواسع ہانسوی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، وہ بھی سنتے چلیے:

''وہ میاں صاحب ہانسی کے رہنے والے، بہت چوڑے چکلے، جناب عبدالواسع فرماتے ہیں کہ 'بے مراد' صحیح اور 'نامراد' غلط۔ ارے تیرا ستیاناس جائے 'بے مراد' اور 'نامراد' میں وہ فرق ہے جو زمین و آسمان میں ہے۔ نامراد وہ جس کی کوئی مراد، کوئی خواہش، کوئی آرزو بر نہ آوے۔ 'بے مراد' وہ جس کا صفحۂ ضمیر نقوشِ مدعا سے سادہ ہو''۔

اسی خط میں آگے چل کر یہ بھی فرماتے ہیں:

''اگر قابلِ تحقیق ہو تو میرے بیان پر غور کرو اور جو عبدالواسع، غیاث الدین اور عبدالرزاق ان ناموں کی شوکت نظر میں ہے تو تم جانو۔ ایک شخص بھیگ مانگتا ہے باپ نے اس کا نام میر بادشاہ رکھ دیا ہے۔ اصل فارسی کو اس کھتری بچے قتیل علیہ ماعلیہ نے تباہ کیا۔ رہا سہا غیاث الدین رام پوری نے کھو دیا۔ ان کی سی قسمت کہاں سے لاؤں جو صاحب عالم کی نظر میں اعتبار پاؤں؟ خالصۃً لِلّٰہ۔ غور کرو کہ وہ خرانِ نامشخص کیا کہتے ہیں اور میں خستہ و دردمند کیا بکتا ہوں۔ واللہ نہ قتیل فارسی شعر کہتا ہے اور نہ غیاث الدین فارسی جانتا ہے۔ میرا یہ خط پڑھو۔ یہ نہیں کہتا کہ خواہی نخواہی پڑھو۔ قوت ممیزہ سے

کام لو، ان غولوں پر لعنت کرو، سیدھی راہ پر آجاؤ۔ اگر
نہیں آتے تو تم جانو"۔

حالی نے غالب کا جو تاریخی مرثیہ لکھا ہے اس کی شانِ نزول کیا ہے، صاحب عالم مارہروی کے نام اس خط میں دیکھیے:

"ایک شعر میں نے بہت دنوں سے کہہ رکھا ہے۔ اس
خیال سے کہ میرے بعد کوئی میرا دوست میرا مرثیہ لکھے
اور اس شعر کو بند قرار دے کر ترکیب بند رقم کرے۔ وہ
شعر یہ ہے:

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مرد
اسد اللہ خان غالب مرد"

غالب نے اپنے خطوط میں اس بات کا تذکرہ کئی جگہ کیا ہے کہ ان کا اصل میدان فارسی ہے۔ خود ان کے قول کے مطابق انہوں نے اردو میں خطوط سہل انگاری کے سبب لکھنے شروع کیے کہ ضعیف العمری کے باعث ان میں دماغ سوزی کی اتنی سکت نہیں رہ گئی تھی کہ اپنے معیار اور مرتبے کی فارسی لکھتے۔ اس کے باوجود وہ آخر دم تک فارسی ہی کو اپنی طرۂ امتیاز سمجھتے رہے۔ منشی شیونرائن آرام کو لکھتے ہیں:

"مگر بھائی تم غور کرو اردو میں، میں اپنے قلم کا زور کیا
صرف کروں گا؟ اور اس عبارت میں معنیِ نازک کیوں
کر بھروں گا؟ ابھی تو یہی سوچ رہا ہوں کہ کیا لکھوں،
کون سی بات، کون سی کہانی، کون سا مضمون تحریر کروں
اور کیا تدبیر کروں۔ تمہاری رائے میں کچھ آئے تو مجھ کو
بتاؤ"۔

منشی شیونرائن آرام ہی کو ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

"میاں اردو کیا لکھوں؟ میرا یہ منصب ہے کہ مجھ پر اردو کی فرمائش ہو؟ خیر! ہوئی۔ اب میں کہانیاں قصے کہاں ڈھونڈتا پھروں"۔

غرض یہ غالب نام آور کی وہ سائیکی ہے جس کے ساتھ وہ تمام عمر جیے اور جس کی خلش سے وہ اپنا جگر چھلنی کرتے رہے۔ زندگی کے دو اور دو چار معاملات میں اس سے مفر ممکن بھی نہیں۔ ہاں قلمروِ شاعری میں وہ اپنے رخش انا کو ایڑ لگا کر جدھر چاہے اڑان بھرتے پھرے:

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

--

ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے
یار کا دروازہ پاویں گر کھلا

--

خود پرستی سے رہے باہم دگر ناآشنا
بیکسی میری شریک آئنہ تیرا آشنا

--

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

--

کارزارِ حیات میں ہمیں غالب ایک ایسے شخص کے روپ میں دکھائی دیتے

ہیں جو ضرورتوں کا مارا اور حاجتوں کا ستایا ہوا ہے۔ یہ غالب کی زندگی کا سب سے درد ناک پہلو ہے جہاں وہ اپنے قاضی الحاجات کے سامنے مصاحبوں کے مصاحب، غلاموں کے غلام اور خوش آمدیوں کے خوش آمدی نظر آتے ہیں۔ خطوط غالب میں ایسی اَن گنت مثالیں ہیں جن میں انوار الدولہ سعد الدین خاں شفق، نواب سیّد محمد یوسف علی خاں بہادر ناظم اور نواب کلب علی خاں بہادر کے نام لکھے گئے خط اس امر کی توثیق کرتے ہیں۔ قتیلؔ کو کھتری بچہ کہنے والا اور عبد الواسع ہانسوی اور غیاث الدین رام پوری کو فارسی سے نابلد قرار دینے والا غالب، نواب انوار الدولہ سعد الدین خاں بہادر شفقؔ کو صائبؔ و قدسیؔ و کلیمؔ کا ہم پلہ قرار دیتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے شفقؔ کے نام غالب کے خط کی یہ عبارت:

> ''غزلوں کو پرسوں سے پڑھ رہا ہوں اور وجد کر رہا ہوں۔ خوشامد میرا شیوہ نہیں ہے۔ جو ان غزلوں کی حقیقت میری نظر میں ہے وہ مجھ سے سن لیجیے اور میرے داد دینے کی داد دیجیے۔ مولانا قلق نے متقدمین یعنی امیر خسرو و سعدیؔ و جامیؔ کی روش کو سرحدِ کمال کو پہنچایا ہے اور میرے قبلہ و کعبہ مولانا شفقؔ اور مولانا ہاشمی اور مولانا عسکری، متاخرین یعنی صائبؔ و کلیمؔ و قدسیؔ کے انداز کو آسمان پر لے گئے ہیں۔ اگر تکلف اور تملق سے کہتا ہوں تو مجھ کو ایمان نصیب نہ ہو۔ یہ جو آپ اپنے کلام کے حک و اصلاح کے واسطے مجھ سے فرماتے ہیں، یہ آپ میری آبرو بڑھاتے ہیں۔ کوئی بات بے جا ہو یا کوئی لفظ ناروا ہو تو میں حکم بجا لاؤں''۔

شفق ہی کے نام ذرا غالب کے خط کی یہ عبارت بھی ملاحظہ ہو:

"زاوئد سے فارغ ہو کر عرض کرتا ہوں کہ ہائے کیا غزل لکھی ہے۔ قبلہ آپ فارسی کیوں نہیں کہا کرتے؟ کیا پاکیزہ زبان ہے اور کیا طرزِ بیان۔ کیا میں سخن ناشناس اور ناانصاف ہوں کہ ایسے کلام کے حک و اصلاح پر جرأت کروں:

چہ حاجت است بہ مشاطہ روے زیبارا"۔

یہ سب کچھ لکھنے کے بعد اب ذرا اصلاح کا انداز بھی ملاحظہ فرمایے اور غالب کی بے چارگی کی داد دیجیے:

"ہاں، ایک جگہ آپ تحریر میں سہو کر گئے ہیں!

اے مطربِ جادوفن بازم رہِ ہوشم زن

دو میم آپڑے ہیں۔ ایک میم محض بے کار ہے۔ 'دیگر' کی جگہ آپ بازم لکھ گئے ہیں:

اے مطرب جادوفن دیگر رہ ہوشم زن"

نواب سیّد یوسف علی خاں بہادر ناظم کے نام غالب کے چالیس اور نواب کلب علی خاں بہادر کے نام پچھتر خط اس وقت ہمارے سامنے ہیں۔ القاب و آداب کے معاملے میں غالب کا مزاج ہم جانتے ہیں کہ یہ غیر رسمی ہوتے ہیں اور غالب ایک ہی شخص کو یہ غیر رسمی القاب بھی بدل بدل کر لکھتے ہیں۔ لیکن ان دونوں حضرات کو لکھے گئے خطوط کی کیفیت یہ ہے کہ ایک دو خطوط کو چھوڑ کر تمام خطوط میں دونوں حضرات کے لیے ایک ہی رسمی قسم کا القاب، حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت و سلامت استعمال کیا گیا ہے اور دوسری صورت یہ ہے کہ دونوں حضرات کے نام لکھے گئے تقریباً ہر خط کا اختتام

خواہ وہ یک سطری خط ہی کیوں نہ ہو، اس دعائیہ شعر پر ہوتا ہے:

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

ان ایک سو پندرہ خطوں میں لگ بھگ ایک سو دس بار یہ شعر نقل کیا گیا ہے۔ تقریباً ہر خط میں اس شعر کی تکرار سے جی اوب جاتا ہے۔ خود غالب کا بھی جی اوب جاتا ہوگا اور یہی غالب کی پُرزہ پُرزہ شخصیت کا المیہ ہے۔

تاہم اس گھسے پٹے اندازِ تحریر کا مطالعہ اس کے باوجود انتہائی دل چسپ اس لیے ثابت ہوتا ہے کہ دونوں مکتوب الیہ غالب کے قاضی الحاجات ہیں۔ ان خطوط کے چند اقتباسات۔ یوسف علی خاں بہادر ناظم کو لکھتے ہیں:

''جب سے حضرت کی ناسازیِ مزاج مبارک کا حال خارج سے مسموع ہوا ہے، عالم الغیب گواہ ہے کہ مجھ پر اور میری بی بی پر اور میرے فرزند حسین علی پر کیا گزر رہی ہے۔ ایک دن رات میرے گھر میں روٹی نہیں پکی، ہم سب نے فاقہ کیا۔ بارے وہ خبرِ وحشت اثر غلط نکلی، حواس ٹھکانے ہوئے۔ بالکل اطمینان جب ہوگا کہ آپ کے غسلِ صحت کی نوید سنوں گا اور قطعۂ تاریخِ غسلِ صحت لکھ کر بھیجوں گا''۔

نواب کلب علی خاں بہادر کے ایک خط کے جواب میں رقم طراز ہیں:

''اس عنایت نامے میں ایک فقرہ نظر پڑا کہ جس سے میں کانپ اٹھا: 'مرا ازاں مشفق واسطۂ تلمذ بودہ است'۔ یہ ذلیل کو عزت دینی اور دوکانِ بے رونق کی خریداری

کرنی ہے، میں تو حضرت کو اپنا استاد، اپنا مرشد اور اپنا آقا جانتا ہوں"۔

غالب کے پُرزے آپ اتنی دیر سے اڑتے دیکھ رہے ہیں۔ لیکن ہم اور آپ غالب کو کیا خود غالب سے زیادہ جانتے ہیں۔ شاید نہیں۔ تو ملاحظہ کیجیے ان تمام باتوں کے جواب میں جو ہم اب تک غالب کے بارے میں کرتے رہیں، غالب کا یہ Confession۔ غالب، تفتہ کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں:

"تم مشقِ سخن کر رہے ہو اور میں مشقِ فنا میں مستغرق ہوں۔ بوعلی سینا کے علم کو اور نظیری کے شعر کو ضائع اور بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں۔ زیست بسر کرنے کو کچھ تھوڑی سی راحت درکار ہے اور باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری سب خرافات ہے۔ ہندوؤں میں اگر کوئی اوتار ہوا تو کیا، اور مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا۔ دنیا میں نام آور ہوئے تو کیا اور گم نام جیے تو کیا۔ کچھ وجہِ معاش ہو اور کچھ صحتِ جسمانی، باقی سب وہم ہے اے یار جانی۔ ہر چند وہ بھی وہم ہے مگر میں ابھی اسی پائے پر ہوں شاید آگے بڑھ کر یہ پردہ بھی اٹھ جائے اور وجہِ معیشت اور صحت اور راحت سے بھی گزر جاؤں، عالمِ بے رنگی میں گزر پاؤں۔ جس سناٹے میں میں ہوں وہاں تمام عالم بلکہ دونوں عالم کا پتا نہیں۔ ہر کسی کا جواب مطابق سوال کے دیے جاتا ہوں اور جس سے جو معاملہ ہے اس کو ویسا ہی برت رہا ہوں لیکن سب

کو وہم جانتا ہوں۔ یہ دریا نہیں ہے سراب ہے۔ ہستی
نہیں ہے پندار ہے۔ ہم تم دونوں اچھے خاصے شاعر
ہیں۔ مانا کہ سعدی و حافظ کے برابر مشہور رہیں
گے۔ ان کو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہم تم کو ہوگا"۔

غالب کے ان اڑے ہوئے پُرزوں کی سیاہ تتلیوں جیسی پرچھائیاں کہیں کہیں ان کے شعروں پر بھی منڈلاتی دکھائی دیتی ہیں۔ دیکھیے آخر میں غالب کے یہ دو شعر:

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

--

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرّر نہیں ہوں میں

مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی

معروف غالب شناس اور ممتاز جدید نقاد شمس الرحمٰن فاروقی مشرق و مغرب کی ادبیات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ یہ کتاب ان کی بیس سالہ کاوشوں کا ثمرہ ہے۔

تفہیم غالب دیوانِ غالب کی شرح نہیں بلکہ قدیم و جدید شعریات کی روشنی میں مرزا غالبؔ کے ۱۳۸ منتخب اشعار کی ایسی فکر انگیز شرح ہے جو کلامِ غالب پر ایک متوازن تنقید کا درجہ رکھتی ہے اور جس میں فاروقی کا رویہ غالبؔ کے تمام شارحین سے مختلف ہے۔

صفحات : ۳۷۸

قیمت : ۹۰ روپے

باغِ دودر میں شامل غالب کے فارسی خطوط کا اردو ترجمہ: ایک مختصر گزارش

نہایت خوشی کی بات ہے کہ پرتو روہیلہ صاحب نے ''باغ دودر'' میں شامل غالب کے فارسی خطوط کو مرتب اور اس کا اردو ترجمہ کیا جو بزم علم وفن اسلام آباد، پاکستان سے ۲۰۰۰ء میں شایع ہوا۔ اس سے پہلے بھی وہ مآثر غالب اور متفرقات غالب کا ترجمہ ادارۂ یادگار غالب کی فرمایش پر کر چکے ہیں جو باغ دودر کی اشاعت تک بھی غالباً اشاعت سے محروم تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ترمذی صاحب کے مرتبہ ''نامہ ہای فارسی غالب'' کا بھی ترجمہ کیا۔ بلاشبہ انہوں نے باغ دودر میں شامل فارسی خطوط کا ترجمہ کر کے ترجمے کے فن کو آگے بڑھایا اور اس میں چاشنی پیدا کی ہے۔ جس سے نہ صرف یہ کہ غالب کے طرز فکر بلکہ ان کے انداز نگارش کی بھی صحیح طور پر ترجمانی ہوئی ہے۔

اس میں ڈاکٹر عبدالوحید قریشی صاحب کا لکھا ہوا ایک دیباچہ بھی شامل ہے جس میں انہوں نے اعتراف کیا ہے کہ:

"اگرچہ غالب ایک مشکل شاعر اور بہت مشکل فارسی نثر نگار ہے۔ اس کے کلام نظم و نثر کا بڑا حصہ فارسی زبان میں ہے جس کا سماجی چلن خود اس کے زمانے میں ہی کم ہو رہا تھا، لیکن تفہیم غالب کے لیے فارسی پر عالمانہ عبور ضروری ہے۔ غالب کے ابتدائی محققین ذولسانی ادبا تھے اس لیے ان کے لیے غالب شناسی بہت آسان تھی۔ بیسویں صدی میں غلام رسول مہر، قاضی عبدالودود، وزیر الحسن عابدی، ڈاکٹر سید عبداللہ اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے غالب کی فارسی نثر کے حوالے سے اہم علمی کام انجام دیے۔ پچھلے پچاس برس میں پاک و ہند میں فارسی پر مزید زوال آیا اور غالب شناسوں میں فارسی کا رجحان کم ہوتا گیا۔ دساتیر کے جعلی فارسی ذخیرۂ الفاظ کی آمیزش سے غالب کی نثر کو اور بھی مشکل بنا دیا ہے۔ اب حالات اور بھی نازک ہو چکے ہیں۔ اِس وقت درسگاہوں میں جو نسل پروان چڑھ رہی ہے وہ اردو سے بھی آشنا نہیں رہی۔ آج ہم اس نسل کے لیے تحقیق کی آسانی پیدا کرنے کی خاطر غالب کے فارسی سرمایۂ علمی کو اردو میں ڈھال رہے ہیں"۔

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بلاشبہ روہیلہ صاحب اردو اور فارسی دونوں زبانوں پر مہارت رکھتے ہیں۔ انہوں نے عابدی صاحب کی مرتبہ "سبد باغ دو در" کے نثری حصے میں شامل فارسی خطوط کا ترجمہ کیا اور اس کے فارسی متن، حواشی، تعلیقات اور

فرہنگ (یعنی کچھ مشکل الفاظ کے معنی بھی کتاب کے آخر میں شامل ہیں) کے ساتھ شایع کیا۔ عابدی صاحب نے اسکو دو حصوں میں اورینٹل کالج میگزین میں ۱۹۶۰۔۱۹۶۱ میں شایع کیا تھا۔ اس کی دوسری اشاعت ۱۹۶۸ء میں ہوئی جس میں تعلیقات کے علاوہ نثری حصے کا ترجمہ بھی شامل تھا۔ روہیلہ صاحب نے ان دونوں شایع شدہ ایڈیشن کا ایک دوسرے سے مقابلہ کر کے دونوں کے ہی اختلافات کی نشاندہی کی ہے نیز خطوط کا فارسی متن بھی شامل کتاب کیا ہے، اور یہ کہنا بے سبب اور رائیگاں نہ ہوگا کہ ان کا ترجمہ چونکہ متن کے تقریباً عین مطابق ہے اس لیے اس کو مستند ترجمہ کہا جا سکتا ہے۔ اگرچہ ان کے اس ترجمے کے مطالعے کے بعد یہ بات نہایت وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ فارسی زبان پر وہ دستگاہ رکھتے ہیں اور غالب کی مشکل نثر کو انہوں نے جس رواں اور فصیح اردو میں پیش کیا ہے اس کی بنا پر ان کے اس ترجمے پر یقیناً بھروسہ کیا جا سکتا ہے لیکن فارسی اشعار کے ترجمے کے سلسلے میں راقم حروف کی نظر میں کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کی طرف اگر توجہ دلائی جائے تو بے جا نہ ہوگا، اس سے خدانخواستہ انگشت نمائی یا تنقید مقصود نہیں بلکہ یہ کہنا ہے کہ ترجمے میں بعض اشعار میں وہ ترجمہ جو پرتو صاحب نے کیا ہے اس کی جگہ وہ ہوتا جو راقم نے پیش کیا ہے تو شاید ترجمے میں کچھ اور زیادہ لطف اور روانی پیدا ہو جاتی جیسے "منشی جواہر سنگھ جوہر" کے نام لکھے گئے تیسرے خط میں ایک مصرع ہے:

عمرت دراز باد کہ این ہم غنیمت است[1]

پرتو صاحب نے اس کا ترجمہ کیا ہے کہ خدا تجھے طویل عمر دے کہ یہ بھی ایک انعام ہے۔ یہاں اگر یہ ہوتا کہ خدا تمہاری عمر دراز کرے اور اس کو بھی غنیمت سمجھنا چاہیے۔

اسی خط میں آگے چل کر ایک شعر ہے:

ماخانہ، رمید گان ظلمیم
پیغامِ خوش از دیار مانیستؔ

اس کا ترجمہ کیا گیا ہے کہ ہم ظلم کے ذریعے گھروں سے نکالے ہوئے لوگ ہیں، ہمارے شہر سے کوئی خوشی کا پیغام متوقع نہیں ہے جبکہ اس کا بہتر ترجمہ ہو سکتا ہے کہ ہم ظلم کی وجہ سے گھروں سے بھاگے ہوئے لوگ ہیں اور خوشی کا پیغام ہمارے شہر سے دور ہے۔

آگے چل کر ایک اور شعر ہے:

کنم از نبی روی در بوتراب
بہ مہ بنگرم جلوۂ آفتابؔ

اس کا ترجمہ ہے کہ نبی صلعم کی طرف سے جب میں بوتراب کی طرف رخ کرتا ہوں تو چاند میں مجھے جلوۂ آفتاب نظر آتا ہے جبکہ راقم کی نظر میں ہے کہ نبی صلعم کی طرف دیکھتا ہوں تو بوتراب نظر آتے ہیں گویا چاند میں مجھے جلوۂ آفتاب نظر آتا ہے۔ (اس شعر میں حضرت علی کا مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھا دیا گیا ہے جو بہر حال اپنی جگہ پر اچھی بات نہیں ہے)۔

ایک اور شعر:

زیزدان نشاطم بہ حیدر بود
ز قلزم بہ جو، آب خوشتر بودؔ

ترجمہ ہے کہ خدا کے مقابلے میں مجھے حیدر کے ساتھ زیادہ خوشی ہوتی ہے، چونکہ سمندر کے مقابلے میں ندی کا پانی زیادہ اچھا ہوتا ہے۔ اس کا زیادہ بہتر ترجمہ ہوتا کہ خدا سے مجھے حیدر کا نشاط حاصل ہوتا ہے اگرچہ خدا قلزم (سمندر) کی طرح وسیع ہے لیکن اس میں جو پانی ہے اس سے نہر کا پانی زیادہ بامزہ ہوتا ہے (کیونکہ

سمندر کا پانی کھارا اور نہر کا پانی میٹھا اور بامزہ ہوتا ہے)۔

اسی خط میں ایک اور شعر ہے:

مرا مایہ گر دل و گر جان بود
ازو دانم از خود زیزدان بود[۵]

اس کا ترجمہ ہے کہ اگر میرے دل و جان کی کوئی قیمت ہے تو میں تو اس کو حیدر ہی کا طفیل سمجھتا ہوں چاہے یزدان کی عطا ہو۔ راقم کی نظر میں اس ترجمہ میں الفاظ کی ترتیب اس طرح ہوتی کہ اگر چہ ہمارا دل اور ہماری روح خدا کا دیا ہوا سرمایہ ہیں لیکن مجھے یہ حضرت علی کا فیض سمجھنا چاہیے، تو زیادہ بامزہ معلوم ہوتا۔منشی جواہر سنگھ جوہر کو لکھے گئے پانچویں خط میں ایک مصرع ہے کہ:

تا یار کرا خواہد و میلش بہ کہ باشد[۶]

ترجمہ ہے کہ اب دیکھیں خدا کی کیا مرضی ہے اور وہ کس کو چاہتا ہے۔ راقم کے نزدیک خدا کا رجحان کس کی طرف ہوتا ہے اور وہ کس کا حامی و مددگار ہے۔

نواب علاؤالدین احمد خان بہادر کو لکھے گئے خط نمبر ایک میں ہے:

بو کہ بہ مستی زنیم بر سر دستار، گل
تا می گلفام را، مزد رسیدن دہیم[۷]

ترجمہ ہے: ہوسکتا ہے، ہم مستی میں اپنی پگڑی میں پھول سجالیں اور اس طرح سے می گلفام کو اس کے رچاؤ کی اجرت دیں۔ اگر یہ ہوتا کہ امید ہے کہ ہم اپنے سر کو حالت مستی میں دستار گل سے سجالیں اور اس طرح سے خوش رنگ شراب کو اس کے پہنچنے کی اجرت دیں۔

ایک دوسرا شعر اسی خط میں ہے:

بر اثر کوہکن نالہ فرستادہ ایم
تا جگر سنگ را ذوق دریدن دہیم[۸]

ترجمہ ہے: کوہکن (یعنی فرہاد) کی پیروی میں ہم نے (اپنی فریاد (پتھر کو) پہنچادی ہے کہ پتھر کے جگر کو بھی شق ہونے کی لذت سے آشنا کردیں۔ اگر یہ ہوتا کہ کوہکن کی طرح ہم نے نالہ وفریاد کی ہے ایسی فریاد کہ اس سے پتھر کے جگر کو بھی شق ہونے کی لذت سے آشنا کیا ہے۔

جان جیکب یا جاکوب (ترجمہ میں ہے) کو لکھے ہوئے خط میں ایک قصیدہ جو ۱۸۴۲ کے شروع میں نواب گورنر جنرل Lord Edward law Ellen Borough کو پیش کیا جس کا مطلع ہے:

ای برتر از سپہر بلند آستان تو
تو پاسبانِ ملک و مَلک پاسبانِ تو[۹]

پرتو صاحب نے اس مطلع کا ترجمہ نہیں کیا ہے جبکہ انہوں نے مصرعوں کے بھی ترجمے کیے ہیں۔ اس کا ترجمہ اس طرح ہونا چاہیے کہ اے حضرت والا آپ کا آستان بلند آسمان سے بھی اونچا ہے، تو ملک کا نگران ہے اور فرشتۂ آسمانی آپ کا نگران۔

ایک اور خط مولوی رجب علی خان کے نام ہے جس کو اس شعر سے آغاز کیا ہے:

سپاسے گزان نامہ نامی شود
سخن در گزارش گرامی شود[۱۰]

ترجمہ ہے کہ: (میں) وہ تشکر کہ جس سے خط کی قدر بڑھ جاتی ہے اور جس سے بات اپنے اظہار میں وقیع ہوجاتی ہے، اچھا ہوتا اور بامزہ: وہ تشکر جس سے خط کی وقعت بڑھ جاتی ہے اور وہ بات جس سے اپنا اظہار وقیع ہوجاتا ہے۔

تفضل حسین خان صاحب مرحوم خیرآبادی کے خط نمبر چار کو اس شعر سے

شروع کیا ہے:

داغم ز سوز غم کہ خجل داردم ز خلق

بوئے کہ تن ز سوختنِ استخوان دہد[۱۳]

ترجمہ: اس سوزِ غم سے کہ جس نے مجھے لوگوں میں خجل کر دیا ہے میں سلگ رہا ہوں اس بو کے سبب جو ہڈیوں کے جلنے پر جسم سے نکل رہی ہے۔ اگر یہ ہوتا کہ: اس سوزِ غم سے کہ جس نے مجھے لوگوں میں شرمندہ کر دیا ہے اور اس بو سے جو ہڈی کے جلنے سے نکلتی ہے میں داغ ہو گیا ہوں تو راقم کے نزدیک بہتر ہوتا، بانکے لال وکیل راجِ بھرت پور کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

بہ بند زحمت فرزند و زن چہ می کشیم

ازین نخواستہ غمہائے ناگوار چہ حظ[۱۴]

ترجمہ ہے کہ فرزند و زن کی زحمت کی زنجیروں سے ہم کیا کیا مصیبتیں اٹھا رہے ہیں، ان طلب کیے ہوئے ناگوار غموں کا کیا مزہ۔ اس میں زحمت کی زنجیروں کے بجائے زحمت کی فکر ہوتا تو شاید ترجمہ کا مزا دوبالا ہوتا۔

میر احمد حسین متخلص بہ میکش کو لکھے گئے گیارہ نمبر کے خط کو حسب ذیل شعر سے شروع کیا ہے:

با آنکہ ہیچ مطلب ممکن روا نشد

دل خوش نمی کنیم مگر از محال ہا[۱۵]

اس کا ترجمہ ہے: باوجود اس کے کوئی ممکن مقصد حاصل نہ ہوا، ہم ناممکن مقاصد کے علاوہ اور کسی چیز سے اپنا دل خوش نہیں کرتے۔ اس کی جگہ اگر یہ ہوتا کہ باوجود اس کے کہ میں کسی مقصد کو حاصل نہ کر سکا پھر بھی خوش ہوں، میں تو ناممکن اور حصول نہ ہونے والی چیزوں سے دل خوش کر لیتا ہوں۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ یہ روہیلہ صاحب نے باغ دودر میں شامل غالب کے فارسی خطوط کا ترجمہ مع فارسی متن، حواشی اور تعلیقات کے پیش کیا ہے۔ دور جدید کا محققہ اصول ہے کہ متن میں تاریخ، ادب، شعر وغیرہ سے متعلق جن چیزوں کا ذکر آیا ہوان کی نشاندہی ضروری ہے اور اس کا علمی نام تخریج ہے۔ اگرچہ غالب نے بعض جگہ شعرا کا نام دے دیا ہے جیسے اوحدی مراغہ ای، نظیری، ظہوری، مرزا جلال اسیر وغیرہ کے اشعار کو نقل کرتے وقت ان کا نام شامل کیا ہے، میرے فاضل مترجم نے فقط دو شعر میں اس کا احتمال رکھا ہے۔ بانکے لال وکیل کے خط میں قوسین کے درمیان (سحابی استر آبادی) لکھا ہے جس کا شعر ہے:

دریا بہ وجود خویش موجے دارد
خس پندارد کہ این کشاکش با اوست [۱۲]

اسی طرح:

کار ساز ما بہ فکر کار ما
فکر ما در کار ما آزار ما [۱۵]

کے لیے حاشیے میں لکھا ہے کلیات سعدی از محمد علی فروغی، ۱۳۶۵ھ ش، تہران۔

کتنا اچھا ہوتا ہے کہ وہ تمام دیے گئے اشعار کی طرف راہنمائی کرتے جس سے یہ واضح ہو جاتا کہ غالب نے کن شعرا سے استفادہ کیا اور کن کن کی پیروی کی ہے۔ مثلاً روہیلہ صاحب نے غالب کے اس شعر کی طرف کوئی توجہ نہیں دی کہ غالب نے یہ طرز حافظ سے اپنایا ہے اور اس کی ایک غزل میں جس میں گیارہ ابیات ہیں اس کی پیروی میں اپنی غزل کہی ہے:

حافظ (مقطع):

رواق منظرِ چشمِ من آشیانۂ تست
کرم نما و فرود آ، کہ خانہ خانۂ تست [۱۶]

غالب:

سپہر را تو بہ تاراج ما گذاشتہ ای[۱۷]

نہ ہرچہ دزد زما برد در خزانۂ تست

غالب کی مندرجہ ذیل غزل ظہوری کی غزل کے جواب میں ہے اور غالب نے مطلع میں دوسرا مصرع ظہوری کا ہی نقل کیا ہے۔ ظہوری بیجاپور میں ابراہیم عادل شاہ کا درباری شاعر تھا جس کی وفات ۱۰۲۵ھ میں ہوئی:

غالب از اوراق ما نقش ظہوری دمید

سرمۂ حیرت کشیم دیدہ بہ دیدن دہیم[۱۸]

غالب نے اوحدی کے شعر کو quote کیا ہے، وہ کہتے ہیں: ''جام جم کے مصنف نے خود میری زبان سے کہا تھا:

اوحدی شصت سال سختی دید

تا شبی روی نیک بختی دید[۱۹]

اسی طرح خدا خواجہ نظیری کی روح کو خوش رکھے ایسا معلوم ہوتا ہے میری زبان سے کہا ہے:

نہ با گلم نظری نی بہ صوتم آہنگی

شکستہ بالم و صیاد در کمین دارم[۲۰]

ایک اور جگہ ہے: ''اس لحن طرز جدید میں مرزا جلال اسیر نے کیا خوب کہا ہے:

امانت دار رازم عالمی را

بقدرِ بی زبانی ہوش دارم[۲۱]

تخریج کے اصول پر عمل کرنے سے ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جو گمنام شعرا یا مصنفین متن میں بیان ہوتے ہیں ان کے بارے میں کچھ تحقیق ہو جاتی ہے اور کبھی کبھی ایسی تحقیق

سے بعض علمی و ادبی شخصیتوں کی گمنامی کا پردہ چاک ہو جاتا ہے۔ اگرچہ یہاں جن شعرا کے کلام سے استفادہ ہوا ہے وہ گمنام نہیں بلکہ معروف شعرا ہیں لیکن چونکہ ان کے صرف شعر دے دیے گئے ہیں اور ان کی طرف نشاندہی نہیں کی گئی ہے کہ یہ کس کا شعر ہے یا کہاں سے رجوع کرنے سے اس کے بارے میں معلوم ہو سکتا ہے۔ راقم نے چند اشعار کے بارے میں معلومات بہم پہنچائی ہیں چونکہ یہ مختصر مقالہ اس کا متقاضی نہیں ہو سکتا تھا کہ تمام امور کی طرف نشاندہی کی جا سکتی بس چند ایک پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔ اگر ہمارے فاضل مترجم نے اس طرف بھی پوری طرح توجہ کی ہوتی تو یہ ترجمہ اور زیادہ موقر و وقیع ہو جاتا۔

حواشی:

۱۔ "باغ دودر" میں شامل غالب کے فارسی خطوط کا اردو ترجمہ، فارسی متن، حواشی اور تعلیقات کے ساتھ، مترجم پرتو روہیلہ، اسلام آباد، پاکستان، ۲۰۰۰ء

۲۔ ص ۲۳

۳۔ ص ۲۵

۴۔ ایضاً

۵۔ ص ۲۶

۶۔ ص ۳۱

۷۔ ص ۴۶

۸۔ ایضاً

۹۔ ص ۴۹

۱۰۔ ص ۵۳

۱۱۔ ص ۶۳

۱۲۔ ص ۸۵، ظہوری کے طرز پر ہے۔ در دنداری زہد او اچہ حظ۔ دگمش واز نالہ عمد اچہ حظ، دیوان، ص ۳۳۹

۱۳۔ ص ۹۷

۱۴۔ ص ۸۴

۱۵۔ص۱۰۰

۱۶۔دیوان حافظ، نذیر احمد، چاپ پنجم، انتشارات امیر کبیر، ۱۳۶۲ش، ص۵۲

۱۷۔ص۴۳

۱۸۔ص۳۶

۱۹۔ص۶۷

۲۰۔ص۶۹

۲۱۔ص۸۰

سیر المنازل

(فارسی متن معہ اردو ترجمہ)

تصنیف: مرزا سنگین بیگ

ترتیب و ترجمہ: ڈاکٹر شریف حسین قاسمی

فارسی کی وہ اولین کتاب ہے جس میں ابتداء سے دہلی کی اجمالی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ یہ کتاب اوائل انیسویں صدی عیسوی میں تالیف ہوئی تھی اور دہلی کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے مستند اور معتبر دستاویز کا درجہ رکھتی ہے۔ اس میں شاہجہاں آباد کی مختلف عمارات، مقابر، مساجد، منادر و معابد محلّے، مکانات اور حویلیو کے علاوہ یہاں کے مشاہیر علم وفن اور اہل حرفہ کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ دہلی کی تہذیب وتمدن کا ایک رنگا رنگ مرقع ہے۔ سیر المنازل میں بعض کتبے بھی نقل کیے گئے ہیں۔

صفحات : ۳۰۶

قیمت : ۴۵روپے

مرزا غالب بہ حیثیت اُستاد

مکتوب نگاری اپنے اندر جھانکنے کا عمل ہے۔ مکتوب نگار میں، ایک وسیع تخلیے میں، جتنی دیر تک رکے رہنے کی سکت اور اپنے حوالے سے مکتوب الیہ سے جتنی دیر تک گفتگو کرنے کی طاقت ہے، اتنی دیر اور دور تک مکتوب میں شدت اور وسعت ہو سکتی ہے۔ مکتوب مکالمہ کا ذریعہ یا مخصنصف ملاقات نہیں بلکہ مکتوب نگار کے ہونے اور سوچنے کی دستاویز اور شہادت بھی ہے۔ وہ خود کلامی بھی ہے۔ وہ لمحوں کا کولاژ ہے اور یہ کولاژ کوئی فن کار بناتا ہے تو اس میں حال، ماضی اور مستقبل کا ارتکاز ہو جاتا ہے۔ ''ہوسکتا ہے'' کو ''ہوا'' اور ''ہوا'' کو ''ہوسکنے'' میں دیکھنا بھی ایسے ہی مکاتیب سے ممکن ہے۔ یہ ایسی خود کلامی یا مکالمہ ہے جو کیا تو دوسروں سے جاتا ہے کہ لیکن اس کا بڑا حصہ خود ہی کے لیے ہوتا ہے۔ اپنی پہچان پانے کی کوشش اور خواہش ہی مکالمہ کو جنم دیتی ہے۔ غالب کے مکاتیب کی اہمیت انہیں معنوں میں ہے۔ یہ مکاتیب مرزا مرحوم کے سفرنامے ہیں۔ ایسے سفرنامے جو اپنی ذات اور صفات کی تلاش میں

نکلے مسافر نے لکھے ہیں۔ یہ وہ مسافر ہے جو کہتا ہے:

اپنی ہستی ہی سے ہو، جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

آگہی کا ادراک اور احساس ہی تو غفلت کی حد کا تعین کرتا ہے۔ مرزا کے مکتوب میں انگنت موضوعات پر بحثیں موجود ہیں جن کے احاطے کے لیے دفتر درکار ہو سکتے ہیں۔ ان کے بیان کردہ نکات سے اتفاق و اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔ ان کے محاسن و معائب پر بھی گفتگو ممکن ہے لیکن میرا موضوع مرزا کی شخصیت کا وہ حصہ ہے جو ان کی استادی کے افہام میں ممد و معاون ہو سکتا ہے۔ یعنی غالب اپنے مکاتیب میں ایک استاد کے روپ میں کیسے سامنے آتے ہیں۔ انہوں نے اپنے شاگردوں کے حوالے سے اپنی شعری شناخت کیسے حاصل کی اور شعری مسائل کو فن کی روشنی میں کیسے سمجھا اور سمجھایا۔ زبان و بیان کے مروّج معیار کو اپنے مذاق و مزاج کے مطابق پایا کہ نہیں پایا۔ تقلید کو تخلیق کے لیے کتنا ضروری مانا اور کتنے کو خارج کیا۔ اپنے شاگردوں کے ساتھ کیا ہوا یہ مکالمہ خود ان کا اپنے سے کیا ہوا مکالمہ بھی تو ہے۔

اُردو میں استاد شاگردی کی روایت کا آغاز کب سے ہوا، یہ ایک تحقیق طلب بات ہو سکتی ہے لیکن شواہد کی موجودگی میں یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ہر اچھا شاعر اچھا استاد ہو یہ ضروری نہیں اور ہر اچھا استاد اچھا شاعر ہو یہ بھی ضروری نہیں۔ اس کے باوجود چند مستثنیٰ مثالیں موجود ہیں اور مرزا غالب ان میں سے ایک ہیں۔ وہ اپنے شاگردوں کا کلام کس طرح دیکھتے تھے اس کی مثالیں ان کے مکاتیب میں موجود ہیں اور دیگر کتب مثلاً صفدر مرزاپوری کی ''مشاطۂ سخن'' وغیرہ میں بھی لیکن وہ اپنے شاگردوں کی شخصیتوں کو سنوارنے کا کام بھی کرتے تھے۔ ان کے مکاتیب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے تلامذہ کی تادیب و تربیت کے ساتھ ساتھ ان کی تہذیب

کرنے میں بھی پوری دلچسپی لیتے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ خود کو شاگردوں کا سرپرست خیال کرتے تھے۔ اس لیے وہ ان کے ذاتی اور خاندانی امور میں بھی مشورے دیتے تھے۔ اِن مقامات کا اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو ہمیں یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ ان مسائل پر غالب کی کیا رائے تھی۔ مثلاً منشی نبی بخش حقیر کو لکھے خط سے بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ حقیر کو یہ سمجھا رہے ہیں کہ تعلیم میں کی جانے والی شدّت طبیعت کی خرابی کا سبب ہے لیکن درپردہ تعلیمِ نسواں کے متعلق ان کی رائے کا اظہار بھی ہوگیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''بیگم کا حال تمہاری تحریر سے معلوم ہوا کہ اکثر بیمار ہو جاتی ہے۔ خدا اس کا حافظ رہے۔ پڑھنے میں اس پر شدّت نہ کیا کرو۔ اس محنت کو اُس پر سہل کردو۔ عورتوں کو علم اتنا ہی کافی ہے کہ حرف شناس ہوں اور کلامِ مجید ناظرہ درست پڑھ لیں۔ خدا اُس کو جیتا رکھے۔ سوادِ حرف شناسی ہوگیا ہے، قرآن پڑھ لے گی۔ شدّت نہ کرنا۔''

اِسی طرح مندرجہ ذیل اقتباس سے تعلقات کے درجات کا تعین مُترشح ہوتا ہے۔ مرزا ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:

> ''اور یہ جو تم لکھتے ہو کہ تو نے اس شخص کو اپنے عزیزوں میں گنا ہے؛ بندہ پرور! میں تو بنی آدم کو، مسلمان ہو یا ہندو یا نصرانی، عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں دوسرا مانے یا نہ مانے۔ باقی رہی وہ عزیز داری، جس کو اہلِ دنیا قرابت کہتے ہیں، اُس کو قوم اور ذات اور

مذہب اور طریق شرط ہے اور اس کے مراتب و مدارج
ہیں۔"

نواب علاء الدین احمد خاں علائی کو وہم ہوگیا ہے کہ ان کے والد پر کسی نے سحر کر دیا ہے۔ مرزا انہیں لکھتے ہیں کہ یہ صفرا یا بلغم ہے پھر بتاتے ہیں:

> تجویز ہے کہ دو دن بعد تنقیۂ خاص ہو اور اَیارِج کا مُسہل دیا جائے اَسما و آیات شفا بخش مقرر ہیں۔ ردِ سحر و دفعِ بلا ان کے ذریعہ سے متصور رہے لیکن ملاؤں اور عزائم خوانوں نے یہ تِہ توڑ دی ہے کچھ نہیں جانتے اور باتیں بکھانتے ہیں۔ تمہارے باپ پر کوئی سحر کیوں کرے گا، بے چارہ الگ ایک ایسے گوشے میں رہتا ہے کہ جب تک خاص وہاں کا قصد نہ کرے، کبھی کوئی وہاں نہ جائے۔ یہ خیال عبث ہے۔

اس اقتباس سے جہاں علائی کو طب پر تیقن کی تلقین ہے وہاں ایک شیریں تنبیہہ بھی ہے کہ جادو ٹونا کچھ نہیں اور اگر ہو بھی تو اس کی منطق کیا ہے۔ یعنی ان کا ذہن تجزیاتی یا سائنسی ہے لیکن وہ اسما و آیات پر یقین رکھتے ہیں۔

اِن اور ایسے اقتباسات سے، جو مکاتیب غالب میں انگنت ہیں، یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ چیزوں کو کس طرح دیکھتے دکھاتے اور سمجھتے سمجھاتے تھے اور اپنے متعلقین کی کس قدر تادیب، تربیت اور تہذیب کرتے تھے۔ وہ شعر سازی کے ساتھ ساتھ شخصیت سازی کا کام بھی کرتے تھے۔ احساس و ادراک ہی سے اشیا کا افہام ممکن ہے اور کسی شخص کی تادیب و تہذیب کا مطلب ہی یہ ہے کہ اسے احساس کا سلیقہ اور ادراک کا طریقہ سمجھا دیا جائے۔ غالب نے اپنا مسلک و مذہب بتاتے وقت یہی کام تو

کیا ہے کہ ان کے پیرو ان کے راستے پر چلیں ان کے پیچھے نہیں۔ مرزا تفتہ کو اسی لیے تو لکھا تھا کہ:

''یہ نہ سمجھا کرو کہ اگلے جو لکھ گئے ہیں وہ حق ہے۔ کیا آگے آدمی احمق پیدا نہیں ہوتے تھے۔''[ع]

ان کے مزاج میں استادانہ رعونت نہیں ہے ان کے یہاں علم کا اشتہار نہیں ہے لیکن بیجا انکسار بھی نہیں ہے ایک استحکام ہے۔ تفتہ کو لکھتے ہیں:

''میں عربی کا عالم نہیں مگر نرا جاہل بھی نہیں۔ بس اتنی بات ہے کہ اس زبان کے لغت کا محقق نہیں ہوں، علما سے پوچھنے کا محتاج اور سند کا طلب گار رہتا ہوں۔ فارسی میں مبدءِ فیاض سے مجھے وہ دست گاہ ملی ہے کہ اس زبان کے قواعد وضوابط میرے ضمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں، جیسے فولاد میں جوہر، اہلِ پارس میں اور مجھ میں دو طرح کے تفاوت ہیں: ایک تو یہ کہ ان کا مولد ایران اور میرا مولد ہندوستان۔ دوسرے یہ کہ وہ لوگ آگے پیچھے سو، دو سو، چار سو، آٹھ سو برس پہلے پیدا ہوئے تھے۔''[۵]

اقتباس کے پہلے حصے میں اعتراف ہے یعنی وہ خود کو عربی کا عالم نہیں سمجھتے۔ اپنی فارسی دانی پر فخر ومباہات ہے لیکن یہاں بھی عجز ہے ہاں تقدیم وتاخیرِ ولادت کی منطق بھی موجود ہے۔ یعنی وہ اپنے جاننے کو ڈراونا جنگل نہیں جانتے نہ اپنے شاگردوں کو اپنی معلومات سے مرعوب ومتاثر کرنے کے متمنی رہتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ ایرے غیرے نتھو خیرے کے آگے ہتھیار ڈال دیں۔ انہیں جتنا بھی علم ہے

اس پر اعتماد ہے۔

وہ اپنے علم کی تحدید سے واقف ہیں لیکن سامنے والے کے علم کی تحدید پر بھی ان کی نظر ہے۔ چنانچہ مرزا تفتہ ہی کو لکھتے ہیں:

> ''وہ شخص ایسا کہاں کا فارسی داں اور عالم ہے کہ میں لڑکوں کی طرح بیت بحثی کروں''[۵۳]

صاف گوئی ان کا شیوہ ہے۔ اس لیے وہ ہر بات صاف کہتے ہیں۔ میاں داد خاں سیاح کو لکھتے ہیں:

> ''بھائی! تمھاری جان کی اور اپنے ایمان کی قسم کہ میں فنِ تاریخ گوئی و معما سے بیگانۂ محض ہوں۔ اُردو زبان میں کوئی تاریخ میری نہ سنی ہوگی۔ فارسی دیوان میں دو چار تاریخیں ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ مادہ اوروں کا ہے اور اشعار میرے ہیں۔ تم سمجھے کہ میں کیا کہتا ہوں؟ حساب سے میرا جی گھبراتا ہے اور مجھ کو جوڑ لگانا نہیں آتا ہے، جب کوئی مادہ بناؤں گا حساب درست نہ پاؤں گا۔ دو ایک دوست ایسے تھے کہ اگر حاجت ہوتی تو مادۂ تاریخ وہ مجھے ڈھونڈ لا دیتے، موزوں میں کرتا اور اگر آپ میں نے مادے کی فکر کی ہے اور یہی حسابِ جمل منظور رکھا ہے تو ایسے تعمیے و تخرجے آ گئے ہیں کہ وہ تاریخ ہنسی کے قابل ہو گئی ہے''[۵۴]

اسی مکتوب میں آگے لکھتے ہیں:

> ''میں 'برہان' کا خاکہ اُڑا رہا ہوں، ''چار شربت'' اور

> ''غیاث اللغات'' کو حیض کا لتا سمجھتا ہوں؛ ایسے گم نام چھوکروں سے کیا مقابلہ کروں گا۔ ''برہانِ قاطع'' کے اغلاط بہت نکالے ہیں۔ دس جز کا ایک رسالہ لکھا ہے اس کا نام ''قاطعِ برہان'' رکھا ہے۔[۵]''

یہ زبان اعتماد کی ہے شیخی کی نہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا غالب اپنے علم و افہام کے متعلق نہ خود مغالطے میں مبتلا ہیں نہ اپنے تلامذہ کو مغالطے میں رکھتے ہیں۔

ان کے کردار کے اس پہلو پر گفتگو کے بعد اب ہم یہ دیکھیں کہ مرزا اپنے شاگردوں کو شعر سازی کے اُمور کس طرح سمجھاتے ہیں اور ان کی شعریات کیا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھیے کہ وہ دوسرے اساتذہ سے کتنے مختلف ہیں۔ عام طور پر اساتذہ کا قاعدہ ہے کہ پہلے قافیے، حاشیے میں لکھ لیے جاتے ہیں پھر ثانی مصرع پہلے لکھیں گے اس کے بعد مصرع اوّل کی فکر ہوگی وغیرہ وغیرہ۔ مرزا غالب، تفتہؔ کو لکھتے ہیں:

> ''بھائی! شاعری، معنی آفرینی ہے؛ قافیہ پیمائی نہیں۔''[۶]

اور لکھتے ہیں:

> کیا ہنسی آتی ہے کہ تم مانند اور شاعروں کے مجھ کو بھی یہ سمجھے ہو کہ استاد کی غزل یا قصیدہ سامنے رکھ لیا، یا اس کے قوافی لکھ لیے اور ان قافیوں پر لفظ جوڑنے لگے۔
>
> لاحول ولاقوۃ الا باللہ!
>
> بچپن میں جب میں ریختہ لکھنے لگا ہوں، لعنت ہے مجھ پر اگر میں نے کوئی ریختہ یا اس کے قوافی پیش نظر رکھ لیے

ہوں۔ صرف بحر اور ردیف قافیہ دیکھ لیا۔"[۱۰]

تو یہ ہے مرزا مرحوم کا طریقۂ شعر سازی۔ اب یہ دیکھیں کہ مرزا نئے شاگرد کو کیا لکھتے ہیں اور اپنی روش سے کیسے مطلع کرتے ہیں۔ مولوی محمد عبدالرزاق شاکر کو لکھتے ہیں:

"آپ کا، واسطے اصلاح کے رجوع کرنا میری طرف،
موجب میری نازش کا ہے۔ میرا طریق اس فن خاص
میں یہ ہے کہ جو شعر بے عیب ہوتا ہے اس کو بہ دستور
رہنے دیتا ہوں اور جہاں لفظ کے بدلے لفظ لکھتا ہوں،
اس کی وجہ خاطر نشان کر دیتا ہوں تا کہ آیندہ صاحب
کلام اس قسم کے کلام میں خود اپنے کلام کا مصلح رہے۔[۱۱]"

یعنی مرزا غالب کو بلا وجہ اپنی استادی جتانے کا شوقِ فضول نہیں تھا، لیکن شاگرد اپنی کم سوادی اور عدم اعتمادی کے سبب یقین نہیں کر پاتا کہ اس کا شعر بے عیب ہے یا ایسا بے عیب ہے کہ مرزا موصوف جیسا استاد اس میں عیب تلاش نہ کر سکے۔ چنانچہ وہ اپنی عدم یقینی، جو دراصل عدم اعتمادی ہے، کا اظہار کرتا ہے تو مرزا دو ٹوک الفاظ میں لکھتے ہیں:

"دونوں غزلیں دیکھیں خوش ہوا۔ فقیر کا شیوہ خوشامد
نہیں، اور فنِ شعر میں اگر اس شیوے کی رعایت کی
جاوے تو شاگرد ناقص رہ جاتا ہے۔ یاد کرو کبھی کوئی
غزل تمہاری اس طرح کی نہیں ہوئی کہ جس میں اصلاح
نہ ہوئی ہو۔ خصوصاً روزمرہ اُردو میں دونوں غزلیں لفظاً
اور معناً بے عیب ہیں کہیں اصلاح کی حاجت نہیں[۱۲]۔"

تو منشی نبی بخش حقیر کو لکھتے ہیں:

"اگر جگہ اصلاح کی ہوتی تو میں کبھی چشم پوشی نہ کرتا۔ تم

سے میرا یہ معاملہ نہیں ہے کہ خوشامد کروں۔ تمہارا کلام
میرا کلام تمہارا ہنر میرا ہنر۔ تمہارا نقص میرا نقص[۳۱]۔''

وہ ایک ذمہ دار استاد ہیں اور اپنی استادانہ ذمہ داریوں سے بخوبی واقف ہیں چنانچہ مرزا ہر گوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:

تمہارے شعر پر اعتراض، اس راہ سے کہ وہ ہمارا دیکھا ہوا ہے، گویا ہم پر ہے۔ اس سے ہمیں کام نہیں کہ وہ مانیں یا نہ مانیں۔ کلام ہمارا اپنے نفس میں معقول و استوار ہے۔ جو زباں داں ہوگا وہ سمجھ لے گا۔ غلط فہم و کج اندیش لوگ نہ سمجھیں، نہ سمجھیں۔ ہم کو تمام خلق کی تہذیب و تلقین سے کیا علاقہ؟ تعلیم و تلقین واسطے دوستوں کے اور یاروں کے ہے، نہ واسطے اغیار کے
تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے تمہیں بارہا سمجھایا ہے کہ خود غلطی پر نہ رہو اور غیر کی غلطی سے کام نہ رکھو[۳۲]۔''

مرزا مرحوم کے کردار کا یہ پہلو دیکھنے کے بعد آیئے اب یہ دیکھیں کہ وہ بیان اور زبان کے متعلق کس طرح اظہارِ خیال کرتے ہیں اور فنِ شعر کے باب میں اپنے شاگردوں کی تادیب کس طرح کرتے ہیں۔ مرزا قاضی عبدالجمیل جنونؔ بریلوی کو لکھتے ہیں:

''دو باتیں سنیے ''طرح'' بہ سکونِ رائے قرشت بہ معنی ''فریب'' ہے لیکن اردو میں یہ لفظ مستعمل نہیں۔ وہ دوسرا لغت ہے۔ ''طرح'' بہ حرکتِ رائے قرشت، بروزنِ ''فرح'' اس کو بسکونِ رائے مہملہ بولنا عوام کا

منطق ہے۔ معاذ اللہ: اگر تقریر میں اس طرح یعنی بہ
سکون بولوں، تو زبان اپنی کاٹ ڈالوں، چہ جائے آں
کہ نظم میں لاؤں۔ ہاں غزل ''طرح'' کی زمین ''ط ر
ح'' کی یہ بہ سکون ہے اور بہ معنی ''روش'' و ''طرز'' طرح
ہے۔ بہ فتحتین۔''[۵۱]

اب سید محمد عباس علی خاں بیتاب کے شعر:

نہیں آتا ہے شرارت کا گماں بھی ان پر
دیکھنے میں تو ہے اس ''طرح'' کی بھولی صورت

کے مصرع ثانی میں مرزا نے طرح کو ''طور'' بنایا ہے۔

''فرہنگِ آصفیہ'' میں لکھا ہے ''یہ لفظ بفتحِ ثانی مشہور اور اکثر شعرائے اردو کے کلام میں موجود ہے۔ اس صورت میں اردو خیال کرنا چاہیے کیوں کہ عربی اور فارسی کلام میں بسکونِ دوم ہی آیا ہے۔ یہ تفرق ہے رسائی (APPROACH) کا۔

اب سہلِ ممتنع کے متعلق دیکھیے، کیا لکھتے ہیں:

''سہلِ ممتنع'' میں کسرۂ لام توصیفی ہے۔ سہل موصوف
اور ممتنع صفت۔ اگر چہ بہ حسبِ ضرورتِ وزن کسرۂ لام
مشبع ہوسکتا ہے لیکن مخل فصاحت ہے اور لام موقوف تو
خود سراسر قباحت ہے۔ سہلِ ممتنع اس نظم و نثر کو کہتے ہیں
کہ دیکھنے میں آسان نظر آئے اور اس کا جواب نہ
ہوسکے۔ بالجملہ سہلِ ممتنع کمالِ حسنِ کلام ہے اور بلاغت
کی نہایت ہے۔ اور ممتنع در حقیقت ممتنع النظیر ہے۔ شیخ
سعدی کے بیشتر فقرے اس صفت پر مشتمل ہیں اور رشید

وطواط وغیرہ شعرائے سلف نظم میں اس شیوے کی
رعایت منظور رکھتے ہیں۔ خودستائی ہوتی ہے۔ سخن فہم
اگر غور کرے گا تو فقیر کی نظم ونثر میں سہلِ ممتنع اکثر پائے
گا:

ہے سہلِ ممتنع یہ کلامِ ادق مرا
برسوں پڑھے تو یاد نہ ہووے سبق مرا

یہ مصرع حیرت آور ہے۔ کلامِ ادق، سہل ممتنع کے منافی ہے۔ پھر یاد نہ ہونا
اور حافظے پر نہ چڑھ جانا ہرگز سہلِ ممتنع کی صفت نہیں ہو سکتی۔''

اس ضمن میں تذکیر وتانیث کا ذکر اشد ضروری ہے۔ وہ یوں کہ ''دریائے
لطافت'' کے مصنف انشاء سے لے کر آج تک یہ بحث طلب موضوع ہے۔ مرزا سے
منسوب لطیفے بھی اس باب میں موجود ہیں۔ اُن سے قطع نظر، تو تذکیر وتانیث کے
باب میں مرزا مرحوم نے اپنے بہت سے شاگردوں کو بہت کچھ لکھا ہے۔ بقول جلیل
مانکپوری یہ ہے بھی بڑے جھگڑوں بھری چیز۔ اس باب میں سید انشا، جلال لکھنوی،
رشید حسن خاں اور شمس الرحمٰن فاروقی کی تحریریں بھی خصوصاً قابلِ مطالعہ ہیں خیر، یہ تو
جملۂ معترضہ تھا۔

۸؍دسمبر ۱۸۶۳ء کے مکتوب میں مرزا غالب میر مہدی مجروحؔ کو لکھتے ہیں:

''تذکیر وتانیث کا کوئی قاعدہ منضبط نہیں کہ جس پر حکم کیا
جائے، جو جس کے کانوں کے لگے، جس کو جس کا دل
قبول کرے، اس طرح کہے۔ ''رتھ'' میرے نزدیک
مذکر ہے، یعنی رتھ آیا لیکن جمع میں کیا کرونگا۔ ناچار
مونث بولنا پڑے گا۔ یعنی ''رتھیں آئیں''۔ خبر مونث

ہے، بہ اتفاق مگر کاغذ اخبار اس کو خود سمجھ لو کہ تمہارا دل کیا قبول کرتا ہے۔ میں تو مذکر کہوں گا، یعنی ''اخبار آیا'' ''پیر ہوئی یا ہوا؟'' یہ منطق عوام کا ہے ہمیں اس سے کچھ کام نہیں۔ ہم کہیں گے کہ ''دو شنبہ ہوا''۔ ''پیر کا دن ہوا''۔ نری ''پیر ہوئی'' یا ''پیر ہوا'' ہم کیوں بولیں گے؟ ''بلبل'' میرے نزدیک مونث ہے جمع اس کی ''بلبلیں'' ''طوطی بولتا ہے''، ''بلبل بولتی'' ہے''۔

بھائی اس امر میں مفتی و مجتہد بن نہیں سکتا۔ اپنا عندیہ لکھتا ہوں جو چاہے مانے، جو چاہے نہ مانے[۱۲]''

مندرجہ بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا غالب کے نزدیک:

۱۔ تذکیر و تانیث کا کوئی قاعدہ منضبط نہیں ہے۔

۲۔ بعض الفاظ بہ طور واحد مذکر ہوتے ہیں لیکن جب وہ جمع کی صورت میں استعمال ہوں تو اُن کی جنس بدل جاتی ہے۔ یعنی وہ مؤنث ہو جاتے ہیں۔ جیسے ''رتھ''۔

۳۔ بعض الفاظ جب واحد استعمال ہوں تو مؤنث ہوتے ہیں لیکن جب بہ طور جمع استعمال ہوں تو مذکر ہو جاتے ہیں۔ جیسے خبر۔

۴۔ لفظ ''منطق'' غالب کے نزدیک مذکر ہے۔ قاضی عبدالجمیل جنون کے خط میں بھی مذکر آیا ہے۔ (ص ۱۴۹۶، جلد چہارم)۔ فرہنگِ آصفیہ اور تذکیر و تانیث از جلیل حسن جلیل مانکپوری جانشینِ امیر مینائی میں مونث درج ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے غالب کے ایک اور خط کا اقتباس دیکھ لیں۔

مرزا یوسف علی خاں عزیز کو لکھتے ہیں:

> ''سعادت و اقبال نشاں مرزا یوسف علی خاں کو بعد دعا کے دل نشیں ہو کہ تانیث و تذکیر ہرگز متفق علیہ جمہور نہیں۔ اے لو ''لفظ'' اس ملک کے لوگوں کے نزدیک مذکر ہے۔ اہلِ پورب اس کو مؤنث بولتے ہیں۔ خیر جو میری زبان پر ہے، وہ میں لکھ دیتا ہوں اس باب میں کسی کا کلام حجت اور برہان نہیں ہے۔ ایک گروہ نے کچھ مان لیا، ایک جماعت نے کچھ جان لیا۔ اس کا قاعدہ منضبط نہیں [۲۱] ''

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں غالب نے پہلا خط ۱۸۶۳ء میں لکھا ہے۔ اگر یہ مان لیں کہ یوسف علی خاں عزیز والا خط ۱۸۵۶ء کا ہے، تو ہمیں یہ ماننا ہوگا کہ انیسویں صدی کے وسط تک اردو میں تذکیر و تانیث کا کوئی قاعدہ منضبط نہیں تھا لیکن یہ بات جزوی طور پر ہی صحیح ہے۔ جب میں جزوی طور پر صحیح کہہ رہا ہوں تو اس کا سیدھا سا مطلب یہ ہے کہ یہ بات جزوی طور پر غلط بھی ہے۔ وہ یوں کہ اردو کی پہلی گریمر، انشا، محاورے اور روزمرہ کی کتاب ''دریائے لطافت'' ہے۔ اس کتاب کی اہمیت یوں بھی ہے کہ یہ وہ پہلی اردو کے علمِ لسان کی کتاب ہے جو کسی ہندوستانی نے تصنیف کی۔ خیر، تو میر انشاء اللہ خاں انشا نے یہ کتاب ۱۸۰۸ء میں تصنیف کی اور بقول مولوی عبدالحق، تخمیناً ۴۳ برس بعد یعنی ۱۸۴۹ء مولوی مسیح الدین خاں بہادر نے اپنے نستعلیق ٹائپ کے مطبع آفتاب عالمتاب واقع مرشد آباد میں طبع کی [۲۲]۔ یعنی یہ کتاب غالب کے مکتوب سے کوئی (۷) سات برس پہلے (اگر یوسف علی خاں عزیز والے خط کا سنہ ۱۸۵۶ء مان لیں تو) شائع ہو چکی تھی۔ اگر یہ سنہ یعنی ۱۸۵۶ء مشتبہ ہے تو یہ کہنا ہوگا کہ

"دریائے لطافت" مجروح کو خط لکھنے سے چودہ یا پندرہ برس پہلے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں انشانے تذکیروتانیث کی فصل میں طویل بحث کی ہے۔ اس بحث کو دیکھنے کے بعد قاری یہ ماننے پر تو مجبور ہو جاتا ہے کہ واقعی تذکیروتانیث کا کوئی قاعدہ نہیں ہے اور ہر اُصول کے باب میں مستثنیٰ موجود ہے۔ نہ صرف انشا کے عہد میں بلکہ مابعد عہد میں بھی اس کا کوئی قاعدہ منضبط نہ ہو سکا۔ مثلاً یہ کہا گیا کہ عربی مصادر جو افعال و افتعال کے وزن پر ہوں انہیں مذکر مان لو۔ یعنی انعام، اکرام، احسان وغیرہ مذکر ہوئے کیوں کہ افعال کے وزن پر ہیں لیکن اصلاح، اسناد، افراط وغیرہ مونث ہے یعنی یہ مستثنیٰ ہیں تو پھر قاعدہ کیا ہوا؟ اب اِفتعال کی مثالیں دیکھ لیں۔ انحصار، ابتذال۔ اشتعال، انتقال وغیرہ مذکر ہیں کیوں کہ یہ افتعال کے وزن پر ہیں لیکن احتیاط۔ وغیرہ کا کیا کریں یہ مستثنیٰ ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تفعّل کے مصادر بھی تفاعل کے مصادر کی مانند مذکر بولے جاتے ہیں۔ تصرّف، تقرّر، تبسّم وغیرہ مذکر تو توجہ، تمنّا وغیرہ کا کیا کریں؟ تجاہل، توارد، تعاقب، تقابل وغیرہ مذکر بولے جاتے ہیں کیونکہ یہ تمام تفاعل کے وزن پر ہیں لیکن تواضع وغیرہ کا کیا کریں؟ اگر عربی مصادر کے اردو استعمال کا یہ قضیہ ختم کر دیا جائے، جو ممکن نہیں ہے، لیکن بات سمجھنے کے لیے ہم سب یہ مان لیں کہ افعال وافتعال اور تفعّل وتفاعل کے وزن والے تمام الفاظ مذکر ہی بولے جائیں گے اور مستثنیٰ کا مرض ختم کیا جاتا ہے، تب بھی مسئلہ وہی اور وہیں رہے گا۔ فارسی اور ہندی الفاظ جو اردو میں بہ کثرت موجود ہیں ان کا کیا کریں گے؟ ان کی تذکیروتانیث کا تعین کیسے کیا جائے گا؟۔ انشانے "دریائے لطافت" میں ایسے الفاظ کی فہرست دی ہے ان کی جنس کے تعین اور معیار بندی کی بھی کوشش کی ہے۔ انہوں نے فصل کا آغاز ہی اس جملے سے کیا ہے "مذکر اور مؤنث کی کئی قسمیں ہیں، حقیقی، سماعی، تقدیری"۔ پھر امثال کے ساتھ ان کی تشریح کی ہے۔ ایک قاعدہ بنانے بتانے کی کوشش کی ہے لیکن

مستثنیٰ وہاں بھی موجود ہے۔

مذکر و مونث کے باب میں پہلے ہی دن سے مستثنیٰ ایسا در آیا کہ یہ ہر عہد تک سینہ بہ سینہ سفر کرتا رہا۔ امیر مینائی کے جانشین جلیل مانکپوری اپنی تالیف ''تذکیر و تانیث'' (مطبوعہ غالباً ۱۹۰۸ء) یعنی اگر ''دریاے لطافت'' کی تصنیف کا سال ۱۸۰۸ء مان لیں تو اس کے سو سال بعد، میں لکھتے ہیں:

> ''اُردو میں تذکیر و تانیث بڑے جھگڑوں بھری چیز ہے۔ کیوں کہ اس کے لیے کوئی قاعدہ کوئی معیار نہیں ہے، محض بول چال اور استعمالِ اہلِ زبان پر مدارِ کار ہے۔ اگرچہ بعض اوزان کے الفاظ قاعدے میں آسکتے ہیں مگر اس سے مقصود حاصل نہیں ہوتا۔''[۱۱]

اس اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ ہم اس باب میں کہیں نہیں پہنچے اور شاید یہ ممکن تھا بھی نہیں۔ خیر، یہ تو صورت حال کی بات ہے۔ ہمیں تو مرزا کے اقوال اور اس باب میں ان کے فرمودات سے مطلب ہے۔ انہوں نے اپنے شاگرد میر مہدی مجروح کو لکھا ہے:

> ''مقدَر مذکر اور ''تقدیر'' مونث ہے۔ کون کہے گا فلانے کی مقدر اچھی ہے؟ کون کہے گا کہ ڈھمکے کا تقدیر برا ہے؟ یہ مسئلہ صاف ہے مذبذب نہیں۔''[۱۲]

تو یوسف علی خاں عزیز کو لکھتے ہیں:

> ''پورب کے ملک میں جہاں تک چلے جاؤ گے تذکیر و تانیث کا جھگڑا بہت پاؤ گے۔ سانس میرے نزدیک مذکر ہے لیکن اگر کوئی مونث بولے گا تو میں اس کو منع

نہیں کر سکتا۔ خود "سائنس" کو مونث نہیں کہوں گا[۱۸]۔"

میاں داد خاں سیاح کو لکھا ہے:

"گلشن بعض کے نزدیک مؤنث اور بعض کے نزدیک مذکر ہے۔ "قلم"، "دہی"، "خلعت" ان کا یہی حال ہے۔ کوئی مؤنث کوئی مذکر بولتا ہے۔ میرے نزدیک "دہی" اور "خلعت" مذکر ہے اور قلم مشترک۔ چاہو مذکر کہو چاہو مؤنث۔ "گلشن" البتہ مذکر مناسب ہے[۱۹]۔"

جب لفظِ "تذکیر" ہی تانیث ہے تو کہاں تک باتوں کا طومار باندھیے۔ چنانچہ اس باب کو ہم بھی غالب کے ان الفاظ کے ساتھ ختم کرتے ہیں۔ غالب، قدر بلگرامی کو لکھتے ہیں:

فقیر کے نزدیک "نقاب" اور "قلم" اور "دہی" ترجمہ جغرات، یہ تینوں اسمِ مذکر ہیں۔ منکر سے مجھے بحث نہیں۔ مجیب کا میں احسان مند نہیں۔ لغت فارسی اور روزمرہ فارسی ہو تو اہلِ زبان کے کلام سے سند کریں۔ منطقِ فارسی میں تذکیر و تانیث کہاں؟ اس امر کے مالک اور اہلِ زبان ہم ہیں اور یہ ہم صیغۂ متکلم مع الغیر ہے۔ یعنی ہم اور تم اور مجموعِ شرفاے دہلی و لکھنؤ ایسے دس آدمی کا اتفاق سند ہے۔ زیادہ جھگڑا بے فائدہ ہے[۲۰]۔

مندرجہ بالا مثالیں صرف یہ بتانے کے لیے ہیں کہ مرزا اپنے شاگردوں کی

تادیب وتربیت کس طرح کرتے تھے۔ اگر اس زاویے سے ان کے مکاتیب کا مطالعہ کیا جائے تو ممکن ہے کہ ایسے بہت سے پہلو ہمارے سامنے آئیں جو ہنوز مکتوبات میں مخفی ہیں۔

حواشی:

۱۔ غالب کے خطوط، مرتبہ خلیق انجم، جلد سوم، ص ۱۱۵۶، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۸۷
۲۔ ایضاً، جلد اول، ص ۳۱۷،
۳۔ ایضاً، جلد اوّل، ۳۸۲ تا ۳۸۳
۴۔ ایضاً، جلد اوّل، ص ۳۳۶
۵۔ ایضاً، جلد اوّل، ص ۳۳۸
۶۔ ایضاً، جلد اوّل، ص ۳۳۳
۷۔ ایضاً، جلد دوم، ص ۵۴۸
۸۔ ایضاً، جلد اوّل، ص ۳۳۳
۹۔ ایضاً، جلد اوّل، ص ۳۳۵
۱۰۔ ایضاً، جلد اوّل، ص ۳۳۵
۱۱۔ ایضاً، جلد دوم، ص ۸۳۵
۱۲۔ ایضاً (بنام میاں داد خاں سیاح) جلد دوم، ص ۵۵۷
۱۳۔ ایضاً، جلد سوم، ۱۱۳۵،
۱۴۔ ایضاً، جلد اوّل، ص ۲۴۰
۱۵۔ ایضاً، جلد چہارم، ۱۴۱۶،
ایضاً جلد دوم، ص ۶۵۴
۱۶۔ غالب کے خطوط، مرتبہ خلیق انجم، جلد دوم، ۵۴۲ (مطبوعہ ۱۹۹۶ء) دوسری اشاعت۔ غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی۔
۱۷۔ خطوط غالب: مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم، جلد دوم ۸۰۲۔۸۰۳، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی۔
ہندوستانی اکیڈیمی، الہ آباد نے ناگری رسم خط میں، ''غالب کے پتر'' (مرتبہ شری رام شرما اور شری رام نواس شرما) ۱۹۵۸ء میں شائع کیے ہیں۔ مرتبین کے مطابق ان کا ماخذ مولوی مہیش پرشاد کی کتاب ''خطوط غالب''

ہے اور اس میں یہ خط ۱۸۵۶ء کا ہے۔ خلیق صاحب نے اس خط کا عکس دیا ہے اس لیے شبہ کی گنجائش نہیں۔

۱۸۔ "دریائے لطافت" مترجمہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کے مقدمے میں مولوی عبدالحق (مرقومہ ۲۸ رمئی ۱۹۱۶ء) نے لکھا ہے "یہ کتاب ۱۲۲۲ھ مطابق ۱۸۰۲ء میں تصنیف ہوئی۔ اس کے چھیالیس برس بعد مولوی مسیح الدین خاں بہادر، کاکوروی نے اپنے مطبع آفتاب عالمتاب مرشد آباد میں بہ تصحیح واہتمام مولوی احمد علی گوپاموی طبع کرایا۔" ص ۲۲۱۔ دیباچہ مرتب (برطبع ثانی) مرقومہ ۳ر اپریل ۱۹۳۵ء میں مولوی عبدالحق نے لکھا ہے "سید انشا کی دریائے لطافت ۱۲۲۳ھ (۱۸۰۸ء) میں تصنیف ہوئی او رتخمیناً ۴۳ برس بعد ۱۲۶۶ھ (۱۸۴۹ء) میں..." ص ۲۴۔ دریائے لطافت: انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی ۱۹۸۸ء

۱۹۔ تذکیر و تانیث" مولفہ جلیل، پہلی اشاعت ۱۳۲۶ھ عکسی اشاعت ستمبر ۱۹۹۴ء، مکتبہ جامع لمیٹڈ، نئی دہلی، ص ۱

۲۰۔ ایضاً، جلد دوم، ص ۳۹۔ ۵۳۸

۲۱۔ ایضاً، جلد دوم، ص ۸۰۳، ۸۰۲

۲۲۔ ایضاً جلد دوم، ص ۵۵۳

۲۳۔ ایضاً، جلد چہارم، ص ۱۴۳۱

ظہورالدین

غالب کے مکاتیب میں طنز و مزاح

طنز و مزاح انسانی فطرت کے گونا گوں مظاہر میں سے ایک ایسا مظہر ہے جس کو ان عناصر میں جگہ دی جانی چاہیے جو شخصیت کو مخصوص رنگ و روپ عطا کرتی ہیں۔ ہنسنا اور رونا انسانی وجود کے دو ایسے پہلو ہیں جو اس کی پیدائش کے ساتھ جنم لے کرتا حیات اُس کے ساتھ رہتے ہیں۔ دکھ میں اگر وہ روتا یا مایوس ہوتا نظر آتا ہے تو سکھ میں کِلکاریاں مارتا، قہقہے بکھیرتا دکھائی دیتا ہے۔ کبھی غیر معمولی حالات میں وہ اس کے برعکس بھی عمل کرتا ہے۔ یعنی دکھ میں ہنستا اور سکھ میں روتا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن ان معکوس افعال کے معنی ہرگز وہ نہیں ہوتے جو بادی النظر میں ہوا کرتے ہیں۔ یعنی یہاں نہ تو رونے کا مطلب دکھ کا اظہار ہوتا ہے اور نہ ہنسنے کا سکھ کا بیان۔

ادب چوں کہ انسانی زندگی کے سبھی پہلوؤں کی عکاسی کرنے کے ساتھ ہی ساتھ کائنات کے متنوع مظاہر کو بھی گرفت میں لانے کی کوشش کرتا ہے اس لیے اس میں جہاں ہمیں انسانی افکار و جذبات کے بے پایاں مظاہر روشن و تاباں نظر آتے ہیں

وہاں کائنات کے مخفی رازوں پر بھی وہ کمند ڈالنے کی کوشش کرتا دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ اُس میں جہاں سنجیدہ حقائق جگہ پاتے نظر آتے ہیں وہاں بوجھل دلوں کی گرہیں کھولنے کے سامان بھی ساتھ ہی پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ انہیں حقائق کا نتیجہ ہے کہ عالمی ادب میں جہاں المیہ ادب کے بے پناہ ذخائر موجود ہیں، وہاں طربیہ ادب کے انبوہ بھی کم نہیں ہیں۔

طنز کا مزاح سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جس طرح خالص مزاح کے عناصر ہمیں نہ ہونے کے برابر دکھائی دیتے ہیں اسی طرح خالص طنز کی جھلکیاں بھی خال خال ہی نظر آتی ہیں۔ ان دونوں کے مقاصد بھی کم وبیش ایک سے ہیں، یعنی جس طرح طنز انسان کی اخلاقی وسماجی اصلاح کا فریضہ انجام دیتا ہے اسی طرح مزاح بھی محض ہنسانے تک ہی خود کو محدود نہیں رکھتا۔ اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ مزاح انسانی کمزوریوں کو اس طرح سامنے لانے کی کوشش کرتا ہے کہ دیکھنے یا پڑھنے والا کھِلکھِلا کر ہنس دیتا ہے۔ لیکن ہنسنے والا محض ہنس دینے تک ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ درپردہ وہ کمزوریوں کی اصلاح کی طرف بھی مائل ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہی کام تو طنز بھی انجام دیتا ہے۔ طنز نگار ایک طرح سے روحانی معالج ہوتا ہے جو منافقت، غرور، لالچ، حسد اور فریب جیسی روحانی بیماریوں کو جڑ سے نکال باہر کرنے کی کوشش کرتا ہے اور انسان کو ایک صحت مند شخصیت بنانے میں مدد دیتا ہے۔ اسی طرح طنز کو احتجاج کا نام بھی دیا جاتا ہے یعنی احتجاج کو آرٹ بنا کر پیش کرنے کا نام طنز ہے جو سماجی بھی ہوسکتا ہے اور انفرادی بھی۔

عالمی ادب کی تاریخ شاہد ہے کہ طنزیہ ومزاحیہ ادب سے دنیا نے بڑے بڑے کام انجام دیے ہیں۔ سلطنتوں کی بنیادیں ہل گئیں اور اربابِ حل وعقد پر مرتب ہونے والے مثبت اثرات نے جہاں نئے انقلابات کے لیے راہیں ہموار کیں وہاں

منفی اثرات کی وجہ سے ادیبوں اور دانش وروں کو حکام کے عتاب کا نشانہ بھی بننا پڑا۔ انگریزی زبان کے مشہور ادیب سوفٹ(swift) کے طنزیہ ناول للی پتین (Lily putaine) نے انگریزی معاشرے پر جو مثبت اثرات مرتب کیے وہ کسی سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔ اسی طرح جان پوپ کی مشہور زمانہ نظم زلف کا انقطاع Rape of the Lock نے اٹھارہویں صدی کے انگلستان کے معاشرے کو فیشن پرستی اور فحاشی کی بدعت سے آزاد کرانے میں جو کردار ادا کیا وہ برطانیہ کی تاریخ کا ایک ناقابلِ فراموش باب ہے۔ اردو میں منفی اثرات کی روشن مثال جعفر زٹلی سے بہتر اور کیا ہو سکتی ہے جہاں ایک شعر کی پاداش میں بادشاہ نے اس کا سر قلم کروا دیا۔

مزاحیہ وطنزیہ ادب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اُس کا چاہے مثبت ومنفی اثر نہ بھی ہو پھر بھی وہ اپنے دور کو آئینہ دکھانے میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرتا۔ اپنے دور، اپنے سماج کی صورتِ حالات کو وہ جس خوبی سے پیش کرتا ہے کوئی تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔ اردو میں سودا کا ہجویہ قصیدہ ''تضحیک روزگار'' یا اکبر الٰہ آبادی کی متعدد نظمیں اس کی بہترین مثال ہیں۔ ہم اپنے اس دور سے بھی متعدد مثالیں پیش کر سکتے ہیں۔

آمدم برسر مطلب، غالب کے حوالے سے ابتدأ یہ کہہ دینا بھی شاید بے جا نہ ہو کہ غالب کے مکتوبات میں مزاحیہ عناصر کی تو یقیناً فراوانی ہے لیکن طنزیہ عناصر خال خال ہی دکھائی دیتے ہیں اور وہ بھی صرف ان کی اپنی ذات سے متعلق ہیں، یعنی وہ کسی دوسرے کو ان کا نشانہ بنانے کی بجائے خود اپنی ذات کو ہی نشانہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں جس سے ان کی شرافتِ نفس کا تو پتا چلتا ہی ہے ان حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے جن میں وہ خود کو مس فٹ (Misfit) تصور کرتے ہوئے یہ تک کہہ دینے سے بھی گریز نہیں کرتے کہ:

میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ غالب بہت ہی ظریف الطبع، بذلہ سنج اور حاضر جواب انسان تھے۔ ان کی ظرافتِ طبع اور حاضر جوابی کا اندازہ ان لطائف سے لگایا جاسکتا ہے جو مختلف موقعوں پر ان کی حاضر جوابی کی وجہ سے آپ ہی آپ بنتے چلے گئے۔ یہ لطائف زبان زد عام ہیں اس لیے یہاں انہیں دہرانے کی ضرورت نہیں لیکن اِس کا ذکر کرنے کی ضرورت یقیناً ہے کہ ان کی ظرافت کے اعلا نمونے ان مقامات پر خصوصاً ابھر کر سامنے آئے ہیں جہاں وہ اپنے مکتوب الیہ کو کوئی ادبی یا لسانی نکتہ ایسے لطیف انداز میں سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں جو صرف غالب کے ہی انداز تخاطب کا حصہ ہے۔ یہی وہ مقامات ہیں جہاں ان کی ظرافت، ظرافت عارفانہ کے مرحلے طے کرتی نظر آتی ہے اور جہاں وہ مسرت ہی نہیں بصیرت بھی عطا کرتے ہیں۔ دیکھیے مرزا ہرگوپال تفتہ کو ایک خط میں اپنی قصیدہ نگاری کی روش سمجھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''آپ کا مہربانی نامہ پہنچا۔ دل میرا اگرچہ خوش نہ ہوا لیکن ناخوش بھی نہ رہا۔ بہر حال مجھ کو، کہ نالائق و ذلیل ترینِ خلائق ہوں، اپنا دعا گو سمجھتے رہو۔ کیا کروں، اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا۔ وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھ کو نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کریں۔'' (ص ۲۳۶)

اپنے کسی خط میں ہرگوپال تفتہ نے بار بار اصلاح کے لیے کلام بھیج کر پریشان کرنے کے لیے معذرت کی تھی، دیکھیے جواب میں انہیں غالب کیسا بصیرت افروز خط لکھتے ہیں:

> ''سنو صاحب! یہ تم جانتے ہو کہ زین العابدین خاں

مرحوم میرا فرزند تھا اور اب اُس کے دونوں بچے، کہ وہ
میرے پوتے ہیں، میرے پاس آرہے ہیں اور دم بدم
مجھ کو ستاتے ہیں اور میں تحمل کرتا ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ
میں تم کو اپنے فرزند کی جگہ سمجھتا ہوں۔ پس تمہارے
نتائج طبع، میرے معنوی پوتے ہوئے۔ جب ان عالمِ
صورت کے پوتوں سے، کہ مجھے کھانا نہیں کھانے
دیتے، مجھ کو دوپہر کو سونے نہیں دیتے، ننگے ننگے پاؤں
میرے پلنگ پر رکھتے ہیں، کہیں پانی لڑھاتے ہیں،
کہیں خاک اڑاتے ہیں؛ میں نہیں تنگ آتا تو ان
معنوی پوتوں سے کہ ان میں یہ باتیں نہیں ہیں، کیوں
گھبراؤں گا، آپ اُن کو جلد میرے پاس بہ سبیلِ ڈاک
بھیج دیجیے کہ میں ان کو دیکھوں۔ وعدہ کرتا ہوں کہ پھر
جلد اُن کو تمہارے پاس بہ سبیلِ ڈاک بھیج دوں گا۔ حق
تعالیٰ تمہارے عالمِ صورت کے بچوں کو جیتا رکھے اور
ان کو دولت و اقبال دے اور تم کو ان کے سر پر سلامت
رکھے اور تمہارے معنوی بچوں، یعنی نتائجِ طبع کو فروغِ
شہرت اور حسنِ قبول عطا فرماوے۔'' (ص ۲۴۴)

تفتہ نے حزیں کے حسبِ ذیل شعر کا حوالہ دے کر اپنے کسی شعر کی کمزوری کے لیے جواز تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

ز ترکتازیِ آں نازنین سوار ہنوز
زسبزہ میدمد انگشتِ زینہار ہنوز

''حزیں کے اِس مطلع میں واقعی ایک ''ہنوز'' زائد اور بے ہودہ ہے۔ تتبع کے واسطے سند نہیں ہوسکتا۔ یہ غلطِ محض ہے، یہ سُقم ہے، یہ عیب ہے، اس کی کون پیروی کرے گا؟ حزین تو آدمی تھا؛ یہ مطلع اگرچہ جبرئیل کا ہوتو اِس کو سند نہ جانو اور اس کی پیروی نہ کرو''۔ (ص ۲۵۰)

غالب کا کمال یہ ہے کہ وہ بسا اوقات بڑے ہلکے پھلکے انداز میں ایسے ایسے دقیق شعری وفنی نکتے بیان کر جاتے ہیں کہ جنہیں بصورتِ دیگر سمجھانے کے لیے دفتر کے دفتر سیاہ کرنے پڑتے ہیں بلکہ ہمارے ماہرینِ علم کلام نے کیے بھی ہوئے ہیں۔ ان کی کسی غزل کو نظیری کی غزل سے ٹکراتے ہوئے دیکھ کر تفتہ نے شاید غالب کو یہ لکھا کہ آپ نے نظیری کی فلاں غزل سے متاثر ہوکر متذکرہ غزل کہی ہے۔ اس کے جواب میں غالب انہیں تخلیقی عمل کی کرشمہ سازی اور شعری تجربے کی عمل آفرینی سے متعارف کراتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''کیا ہنسی آتی ہے کہ تم مانند اور شاعروں کے مجھ کو بھی یہ سمجھتے ہو کہ استاد کی غزل یا قصیدہ سامنے رکھ لیا، یا اس کے قوافی لکھ لیے اور ان قافیوں پر لفظ جوڑنے لگے۔ لاحولَ ولاقوۃ اِلاّ باللہ۔ بچپن میں جب میں ریختہ لکھنے لگا ہوں، لعنت ہے مجھ پر اگر میں نے کوئی ریختہ یا کوئی اس کے قوافی پیشِ نظر رکھ لیے ہوں۔ صرف بحر اور ردیف قافیہ دیکھ لیا اور اُس زمین میں غزل قصیدہ لکھنے لگا۔ تم کہتے ہو، نظیری کا دیوان وقتِ تحریر قصیدہ پیشِ نظر ہوگا اور جو اس کے قافیے کا شعر دیکھا ہوگا، اس پر لکھا ہوگا۔ واللہ اگر تمہارے اس خط کو دیکھنے سے پہلے

میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس زمین میں نظیری کا قصیدہ
بھی ہے، چہ جائے آں کہ وہ شعر: بھائی شاعری، معنی
آفرینی ہے؛ قافیہ پیمائی نہیں ہے۔" (ص ۳۳۵)

اس طرح کے ایک اور خط کا جواب دیتے ہوئے بھی دیکھیے وہ دقیق نکات کو کس لطیف انداز میں لیکن اپنی عام روش سے قدرے ہٹ کر پیاری پیاری گالیاں دیتے ہوئے کیسے سمجھاتے ہیں:

ایک اور نمونہ دیکھیے:

"سنو میاں! میرے ہم وطن یعنی ہندی لوگ جو وادیِ
فارسی دانی میں دم مارتے ہیں، وہ اپنے قیاس کو دخل
دے کر ضوابط ایجاد کرتے ہیں۔ جیسا وہ گھا گھس، اُلّو
عبدالواسع ہانسوی لفظِ "نامراد" کو غلط کہتا ہے اور یہ
الّو کا پٹھا قتیل "صفوت کدہ وشفقت کدہ" و "نشتر کدہ"
کو اور "ہمہ عالم" وہ "ہمہ جا" کو غلط کہتا ہے۔ کیا میں بھی
ویسا ہی ہوں جو "یک زمان" کو غلط کہوں گا؟ فارسی کی
میزان یعنی ترازو میرے ہاتھ میں ہے۔ الحمد لِلّٰہ
الشکر؟ (ص ۳۳۶)

اور پھر حتمی فیصلہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"یہ نہ سمجھا کرو کہ اگلے جو لکھ گئے ہیں، وہ حق ہے۔ کیا
آگے آدمی احمق پیدا نہیں ہوتے تھے" (ص ۳۳۶)

اسی طرح کے ایک اور نکتے کا، جس کا بنیادی تعلق اگرچہ فنِ ترجمہ نگاری سے ہے، ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دوسری وجہ یہ کہ کول تو معلوم، مگر مکان آپ کا نہیں معلوم، خط لکھوں تو کس پتے سے لکھوں؟ ہاں، آپ نے سرنامے پر ''چاہِ گرمابہ'' لکھا، میں نہیں لکھ سکتا؛ کس واسطے کہ یہ ''حمام کے کنویں'' کی مٹی خراب کر کر اُس کو چاہِ گرمابہ'' لکھا ہے۔ اسماوِ اعلام کا ترجمہ فارسی میں کرنا، یہ خلافِ دستورِ تحریر ہے۔ بھلا اس شہر میں ایک محلّہ ''بلی ماروں'' کا ہے؟ اب ہم اُس کو ''گربہ کشاں'' کیوں کر لکھیں؟ یا املی کے محلّے کو ''محلّہ تمرِ ہندی'' کس طرح لکھیں؟ یہ بہر حال، ناچار تمہاری خاطر سے احمق بننا قبول کیا اور وہی لفظِ مہمل لکھ کر خط بھیج دیا ہے۔''
(ص ۲۶۴)۔

جیسا کہ ابتدا میں کہا گیا غالب کے ہاں خالص مزاح کے عناصر ان کے خطوط میں جا بجا بکھرے ہوئے ہیں۔ اس میں مبالغہ نہیں کہ وہ فطرتاً ظریف الطبع واقع ہوئے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو عمر بھر کے آلام و مصائب سے نبرد آزما ہونا اور انہیں خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کرنا ہرگز ممکن نہ ہوتا۔ عمر بھر انہیں جس جس طرح کے چرکوں کو سہنا پڑا، انہیں برداشت کرتے ہوئے مسکرانا ایک ایسے انسان ہی کے بس کی بات ہے جو زندگی کی حقیقتوں کو پا چکا ہو اور جانتا ہو کہ آدمی کا سب سے قیمتی اثاثہ دکھ ہے۔ یہی اثاثہ انسان میں بصیرت کے وہ چراغ روشن کرتا ہے جو زندگی کے تاریک گوشوں کو منور کر کے ان حقائق سے آشنا کرتے ہیں جن تک پہنچنے کے لیے ہمارے رشی منی اور ولی و قلندر زندگیاں صرف کرتے رہے ہیں۔ حقیقت کے اسی ادراک نے شاید غالب سے بھی یہ شعر کہلوایا:

یہ مسائلِ تصوف، یہ ترا بیان غالب
ہم تجھے ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

غالب اگر اس حقیقت کو نہ پا چکے ہوتے تو شاید غموں سے گھبرا کر فرار کی کوئی راہ تلاش کرتے۔ اُن کی بادہ خواری فرار کی نہیں زندگی کے گہرے ادراک کا سرچشمہ تھی اور وجدان کے گہرے سمندر میں اترنے کا وسیلہ۔ اس کا انہیں بخوبی احساس تھا اس لیے ایک موقعے پر وہ خود بھی یہ کہے بنا نہ رہ سکے:

مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

یہ بے خودی دراصل وہ سیڑھی تھی جس کے بغیر حقائق کے تہہ خانوں میں اترنا ممکن نہ تھا۔ اِسی بے خودی سے دراصل بصیرت کی مشعل کی شکل اختیار کر کے غالب کو حقائق کے تہہ خانوں میں پھیلے ہوئے گھٹاٹوپ اندھیروں میں خوابیدہ صداقتوں تک رسائی حاصل کرنے کے قابل بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں پائے جانے والے خالص مزاح کے نمونے بھی محض تفنن طبع کی چیز نہیں۔ اُن سے بصیرت کے ایسے شرارے چھوٹتے نظر آتے ہیں جو زندگی کے مخفی رازوں پر پڑے ہوئے پردوں کو دھواں کرتے چلے جاتے ہیں۔ مشتے نمونہ زخروارے کے مصداق چند مثالیں ملاحظہ کیجیے۔

مرزا تفتہ کو ان کے ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں:

”تم اپنے کلام کے بھیجنے میں مجھ سے پُرسش کیوں کرتے ہو؟ چار جزو ہیں تو، بیس جزو ہیں تو، بے تکلف بھیج دو۔ میں شاعرِ سخن سنج اب نہیں رہا، صرف سخن فہم رہ گیا ہوں، بوڑھے پہلوان کی طرح پیچ بتانے کی گوں

ہوں۔ بناوٹ نہ سمجھنا، شعر کہنا مجھ سے بالکل چھوٹ
گیا۔ اپنا اگلا کلام دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ یہ میں
نے کیوں کر کہا تھا۔" (ص ۲۷۳)

غالب حقیقتِ حال کو بڑے لطیف انداز میں سمجھاتے ہوئے دراصل انسانی زندگی کی اس دائمی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ انسان کا وجود قدرت نے زندگی کی بے معنویت میں معنویت پیدا کرنے کے لیے ممکن بنایا ہے۔ یہی انسانی وجود کا مقصد اور انسان کا منصب ہے اسی لیے وہ اپنے جسمانی زوال وانحطاط کے باوجود اپنی زندگی کے ہر لمحے کو کام میں لاتے ہوئے معنویت کے چراغ روشن کرنا چاہتے ہیں۔ انسانی منصب سے متعلق یہ موضوع ان کے ہاں بڑے لطیف اسلوب میں بار بار ابھر کر سامنے آتا ہے۔ چند ایک مثالیں دیکھیے:

"بندہ پرور! میں تو بنی آدم کو، مسلمان ہو یا ہندو یا نصرانی،
عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں۔ دوسرا مانے یا نہ
مانے" (ص ۳۱۷)

"بہت گزر گئی ہے، تھوڑی رہی۔ اچھی گزری
ہے، اچھی گزر جائے گی۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ عرفی کے
قصائد کی شہرت سے عرفی کے کیا ہاتھ آیا جو میرے
قصائد کے اشتہار سے مجھ کو نفع ہوگا؟ سعدی نے بوستان
سے کیا پھل پایا، جو تم سنبلستان سے پاؤ گے؟ اللہ کے
سوا جو کچھ ہے موہوم و معدوم ہے۔ نہ سخن ہے، نہ
سخنور ہے، نہ قصیدہ ہے نہ قصد ہے۔ لاموجود الا اللہ۔"
(ص ۳۲۶)

''میں قریب بہ مرگ ہوں۔ پاؤں کے ورم نے
اور ہاتھ کے پھوڑے نے مار ڈالا ہے۔ باور کرنا اور
میرے سب آدمی، بلکہ بعض دوست جو روز نئے آتے
ہیں، وہ بھی گواہ ہیں کہ میں صبح سے شام تک اور شام
سے صبح تک پڑا رہتا ہوں۔ خطوط کی تحریر لیٹے لیٹے ہوتی
ہے۔ اشعار اصلاح کو بہت جگہ سے آتے تھے، سب کو
منع کر دیا، ایک رئیسِ رام پور اور ایک تم اِن کی اصلاح
رہ گئی ہے۔'' (ص ۳۴۳)

بعض اوقات غالب کسی نکتے کی وضاحت کے لیے کوئی ایسی مثال پیش
کر دیتے ہیں جس سے مکتوب الیہ کے ہونٹوں پر ہنسی تو آجاتی ہے پر اس ہنسی کو ہم درد
میں ڈوبی ہوئی ہنسی ہی قرار دے سکتے ہیں۔ آنسوؤں میں نہائی ہوئی یہ مسکان اکثر کسی
تاریخی یا عصری منظر کے نگاہوں میں پھر جانے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ 'سنبلستان'
کی خراب اشاعت پر مرزا تفتہ کو دیکھیے کس طرح اپنے جذبات سے مطلع کرتے ہیں:

''تم نے روپیہ بھی کھویا اور اپنی فکر کو اور میری اصلاح
کو بھی ڈبویا۔ ہم سے کیا بری کاپی ہے! اپنے اشعار کی
اور اس کاپی کی مثال جب تم پر کھلتی کہ تم یہاں ہوتے اور
بیگمات قلعہ کو پھرتے چلتے دیکھتے! صورت ماہِ دو ہفتہ کی
سی اور کپڑے میلے، پائچے لیر لیر، جوتی ٹوٹی۔ یہ مبالغہ
نہیں بلکہ بے تکلف ''سنبلستان'' ایک معشوقِ خوبرو
ہے، بد لباس ہے۔'' (ص ۳۲۶)

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد دلی میں جو صورتِ حال پیدا ہوئی اور سلطنت مغلیہ کے

خاتمے کے بعد امرا و شرفا پر جو مصیبت نازل ہوئی اُس سے بہتر تصویر پیش کرنا شاید ممکن نہ ہو جیسی غالب نے اوپر پیش کی ہے۔ اِس منظر کو دیکھ کر ہمارے ہونٹوں پر ہنسی کی لہر نمودار تو ضرور ہوتی ہے پر ہم اُسے درد میں ڈوبی ہوئی ہنسی ہی کہہ سکتے ہیں۔

کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ غالب بات تو اپنی مظلومیت کی کر رہے ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اُنکا مکتوب الیہ اُن سے ہمدردی کا اظہار کرے پر ہوتا یہ ہے کہ وہ ہمدردی کا اظہار کرنے سے پہلے بے اختیار ہنس دیتا ہے۔ اسی طرح کی ایک صورت حال کا ذکر وہ تفتہ کے نام اپنے ایک خط میں کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بڑا پرانا قصہ تم نے یاد دلایا، داغِ کہنۂ حسرت کو چمکایا۔ یہ قصیدہ منشی محمد حسن کی معرفت روشن الدولہ کے پاس اور روشن الدولہ کے توسط سے نصیر الدین حیدر کے پاس گزرا اور جس دن گزرا، اُسی دن پانچ ہزار روپے کے بھیجنے کا حکم ہوا۔ متوسط یعنی منشی محمد حسن نے مجھ کو اطلاع نہ دی۔ مظفر الدولہ مرحوم لکھنؤ سے آئے۔ انہوں نے یہ راز مجھ پر ظاہر کیا اور کہا خدا کے واسطے میرا نام منشی محمد حسن کو نہ لکھنا۔ ناچار میں نے شیخ امام بخش ناسخ کو لکھا کہ تم دریافت کر کے لکھو کہ میرے قصیدے پر کیا گزری؟ انہوں نے جواب میں لکھا کہ پانچ ہزار ملے؛ تین ہزار روشن الدولہ نے کھائے، دو ہزار منشی محمد حسن کو دیے اور فرمایا کہ اس میں سے جو مناسب جانو غالب کو بھیج دو۔ کیا اُس نے ہنوز تم کو کچھ نہ بھیجا؟ اگر نہ بھیجا ہو تو مجھ کو لکھو۔ میں نے لکھ بھیجا کہ مجھے پانچ روپے

بھی نہیں پہنچے۔ اس کے جواب میں انہوں نے لکھا کہ
اب تم مجھے خط لکھو، اُس کا مضمون یہ ہو کہ میں نے بادشاہ
کی تعریف میں قصیدہ بھیجا ہے اور یہ مجھ کو معلوم ہوا ہے
کہ وہ قصیدہ حضور میں گزرا مگر یہ میں نے نہیں جانا کہ
اُس کا صلہ کیا مرحمت ہوا۔ میں کہ ناسخ ہوں اپنے نام کا،
خط بادشاہ کو پڑھوا کر، ان کا کھایا ہوا روپیہ ان کے حلق
سے نکال کر تم کو بھیج دوں گا۔ بھائی یہ خط لکھ کر میں نے
ڈاک میں روانہ کیا۔ آج خط روانہ ہوا، تیسرے دن شہر
میں خبر اڑی کہ نصیر الدین حیدر مر گیا۔ اب کہو، میں کیا
کروں اور ناسخ کیا کرے۔" (ص ۳۲۸)

کچھ ایسی ہی صورت اس خط میں بھی پیش آئی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

"اپنا حال پرسوں کے خط میں مفصل لکھ چکا ہوں۔ ادنیٰ
بات یہ ہے کہ جو کچھ لکھتا ہوں وہ لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔
مزے کی بات ہے کہ میرا لکھا ہوا میرا حال باور نہیں، اور
کسی نے جو کہہ دیا کہ غالب کے پاؤں کا ورم اچھا ہو گیا
اور اب وہ شراب دن کو بھی پیتا ہے تو حضور نے ان
باتوں کو یقین جانا۔ بیس برس آگے یہ بات تھی کہ
ابر و باراں یا پیش از طعام چاشت یا قریب شام تین
گلاس پی لیتا تھا اور شراب شبانہ معمولی میں مجرا نہ
لیتا تھا۔ اس بیس برس میں بیس برساتیں ہوئیں، بڑے
بڑے مینہ برسے، پینا یک طرف دل میں بھی خیال نہ

گزرا بلکہ رات کی شراب کی مقدار کم ہوگئی ہے، پاؤں کا ورم حد سے زیادہ گزر گیا۔ مادہ تحلیل کے قابل نہ نکلا، کھولن شروع ہوگئی۔ حکما جو دو تین یہاں ہیں، ان کی رائے کے مطابق کل سے نیب کا بھرتا بندھے گا۔ وہ پکالائے گا، تب اُس کو پھوڑنے کی تدبیر کی جائے گی، تلوا زخمی، پنڈلی زخمی، اگر وہ نامرد بے درد جھوٹا ہے تو اُس پر ہزار لعنت اور اگر میں جھوٹا ہوں تو مجھ پر سو ہزار لعنت۔'' (ص ۱۴۱ ۳)

ایک بڑے مزاح نگار کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے آپ پر ہنسنے کا فن جانتا ہے، اسی طرح ایک بڑا طنز نگار بھی وہی ہوتا ہے جو دوسروں کو نشانہ بنانے کی بجائے اپنی ذات پر کچوکے لگا کر دوسروں کے لیے بصیرت کے چراغ روشن کرتا ہے۔ اُسے طنز اور ہجو کے درمیانی فرق کا علم ہوتا ہے اور وہ طنز کو ہجو بننے سے ہمیشہ بچائے رکھتا ہے۔ غالب کے ہاں یہ دونوں خوبیاں موجود ہیں وہ نہ تو اپنے مزاح کو پھکڑ پن بننے کی اجازت دیتے ہیں اور نہ طنز کو ہجو کے دائرے کی طرف پھسلنے کی۔

غالب کے کچھ خطوط ایسے بھی ہیں جن میں موسمی حالات کا بیان اس انداز سے کیا گیا ہے کہ مزاح کے پہلو آپ ہی آپ پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ خصوصا برسات کی مُسلا دھار بارشوں کا ذکر اِس طرح کرتے ہیں کہ ایک طرف جہاں اُن کی وجہ سے دلی پر نازل ہونے والی تباہ کاریوں کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے، وہاں بیان کی لطافت دلوں کو بھی گدگدائے بنا نہیں رہتی۔ دیکھیے میر مہدی مجروح کو لکھے ایک خط میں ایسی ہی ایک برسات سے دلّی پر نازل ہونے والی تباہی کو کس لطیف انداز میں بیان کرتے ہیں کہ قاری افسوس کرنے کی بجائے کِھلکِھلا کر ہنسنے لگتا ہے:

"برسات کا نام آ گیا، سو پہلے مُجملاً سنو۔ ایک غدر کالوں کا، ایک ہنگامہ گوروں کا، ایک فتنہ انہدام مکانات کا، ایک آفت وبا کی۔ ایک مصیبت کال کی۔ اب یہ برسات جمیع حالات کی جامع ہے۔ آج اکیسواں دن ہے۔ آفتاب اس طرح گاہ گاہ نظر آ جاتا ہے جس طرح بجلی چمک جاتی ہے۔ رات کو کبھی کبھی اگر تارے دکھائی دیتے ہیں تو لوگ ان کو جگنو سمجھ لیتے ہیں۔ اندھیری راتوں میں چوروں کی بن آئی ہے۔ کوئی دن نہیں کہ دو چار گھر کی چوری کا حال نہ سنا جائے۔ مبالغہ نہ سمجھنا ہزار ہا مکان گر گئے۔ سینکڑوں آدمی جابہ جادب کر مر گئے۔ گلی گلی ندی بہہ رہی ہے۔ قصہ مختصر وہ ان کال تھا کہ مینہ نہ برسا۔ اناج نہ پیدا ہوا۔ یہ پن کال ہے۔ پانی ایسا برسا کہ بوئے ہوئے دانے بہہ گئے۔ جنہوں نے ابھی نہیں بویا تھا، وہ بونے سے رہ گئے۔ سن لیا دلی کا حال؟ اِس کے سوا کوئی نئی بات نہیں ہے۔"
(ص ۵۳۴۔۵۳۵)

اسی طرح کا ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"برسات کا حال تمہیں بھی معلوم ہے اور یہ بھی تم جانتے ہو کہ میرا مکان گھر کا نہیں ہے، کرایے کی حویلی میں رہتا ہوں۔ جولائی سے مینہ شروع ہوا۔ شہر میں سینکڑوں مکان گرے اور مینہ کی نئی صورت دن میں رات میں

دو چار بار برسے اور ہر بار اس زور سے کہ ندی نالے بہہ نکلیں۔ بالاخانے کا جو دالان میرے بیٹھنے اٹھنے، سونے جاگنے، جینے مرنے کا محل ہے؛ اگرچہ گرا نہیں، لیکن چھت چھلنی ہو گئی۔ کہیں لگن، کہیں چلمچی، کہیں اگالدان رکھ دیا۔ قلم دان، کتابیں اٹھا کر توشے خانے کی کوٹھری میں رکھ دیے۔ مالک مرمت کی طرف متوجہ نہیں۔ کشتی نوح میں تین مہینے رہنے کا اتفاق ہوا، اب نجات ہوئی ہے۔" (ص ۳۴۶)

شخصی راج ہو یا جمہوری نظام بیوروکریسی کو ہمیشہ بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ وہ جو چاہتے ہیں وہی ہوتا ہے۔ بڑے بڑے وزیروں اور حاکموں کو ان کے سامنے مجبور و معذور پایا پایا سنا ہے۔ غالب کو بھی اس بیوروکریسی کی وجہ سے ناکوں چنے چبانا پڑے۔ دیکھیے نیچے دیے خطوط کے اقتباسات میں وہ اُن کا ذکر کس طرح کرتے ہیں:

"میں سالِ گذشتہ بیمار تھا، بیماری میں خدمت احباب سے مقصر نہیں رہا۔ اب مردہ ہوں، مردہ کچھ کام نہیں کرسکتا۔ کمشنر و ڈپٹی کمشنر وغیرہ حکام شہر سے ترکِ ملاقات ہے۔ مگر ڈپٹی کلکٹرِ شہر سے، کہ وہ مہتمم خزانہ ہے، ہر مہینے میں ایک بار ملنا ضرور ہے۔ اگر نہ ملوں، تو مختار کار کو تنخواہ نہ ملے۔ (ص ۳۴۶)

ایک اور اقتباس دیکھیے:

"ریٹی گن صاحب اب عدالت خفیفہ کے جج ہو گئے۔

ڈکرو در صاحب پہاڑ سے آگئے، اپنا کام کرنے لگے۔
ریٹی گن صاحب شہر سے باہر دو کوس کے فاصلے پر
جا رہے۔ معہٰذا جاڑے کا موسم بڑھاپے کا عالم، وہاں
تک جانا دشوار اور پھر کوئی مطلب نکلتا ہوا نظر میں
نہیں۔'' (ص ۳۴۷)

اور یہ بات کہی گئی ہے کہ خود پر ہنسنے کا فن اگر سیکھنا ہو تو اُردو میں غالب سے بہتر مثال نہیں مل سکی۔ وہ حقیقتِ حال کا بیان اس انداز سے کرتے ہیں کہ مزاح کے ساتھ ساتھ طنز کی شدّت بھی پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ ساتھ ہی انسانی وجود کی کم مائیگی کا احساس بھی کچوکے لگانے لگتا ہے۔ اِس سے بڑا المیہ کیا ہو سکتا ہے کہ وہی انسان جو زندگی بھر زندگی کی معنویت کے راگ الاپتا رہا ہو وہ اپنی ہی زندگی کے آخری دور میں قدرت کی طرف سے ملی ہوئی قوتوں کو زائل ہوتے دیکھ کر کرب کی اتھاہ گہرائیوں میں یوں اترتا چلا جاتا ہے:

''سامعہ مر گیا تھا، اب باصرہ بھی ضعیف ہو گیا۔ جتنی
قوتیں انسان میں ہوتی ہیں، سب مضمحل ہیں۔ حواس
سراسر مختل ہیں۔ حافظہ گویا کبھی نہ تھا۔ شعر کے فن سے
گویا کبھی مناسبت نہ تھی۔ رئیسِ رام پور سَو روپے
مہینا دیتے ہیں۔ سال گزشتہ ان کو لکھ بھیجا کہ اصلاحِ نظم
حواس کا کام ہے اور میں اپنے میں حواس نہیں پاتا،
متوقع ہوں کہ اِس خدمت سے معاف رہوں۔ جو کچھ
مجھے آپ کی سرکار سے ملتا ہے عوض خدمات سابقہ میں
شمار کیجیے تو میں ''سکہ باہر'' سہی، ورنہ خیرات خوار سہی اور

اگر یہ عطیہ بہ شرطِ خدمت ہے تو جو آپ کی مرضی ہے، وہی میری قسمت۔ برس دن سے ان کا کلام نہیں آتا، فتوحِ مقرری نومبر تک آئی اب دیکھیے آگے کیا ہوتا ہے۔ (ص ۳۴۹)

نہ جانے ایسا کیوں ہے کہ جو لوگ جتنے زیادہ ذہین و فطین ہوتے ہیں وہ اسی قدر اوہام کا بھی شکار ہوتے ہیں۔ بسا اوقات یہ اوہام نفسیاتی عارضوں کا رُوپ اختیار کر کے انسانوں سے طرح طرح کی حرکات سرزد کراتے ہیں۔ عمر بھر کی صعوبتوں نے غالب کو بھی اس وہم کا شکار کر دیا تھا کہ وہ ایک ایسے بدنصیب انسان ہیں جس کا سایہ بھی دوسروں کے لیے نحوست کا باعث ہو سکتا ہے۔ اس احساس کے سائے اُن کے خطوط میں جگہ جگہ دیکھے جا سکتے ہیں۔ نیچے دیے خط کے اقتباس میں دیکھیے ان کا یہ احساس کس طرح کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ نواب علاؤ الدین علائی کی طرف سے ان کے ہاں بچے کی ولادت پر تاریخ کہنے کے تقاضے کے جواب میں غالب لکھتے ہیں:

"مولانا نسیمی کیوں خفا ہوتے ہو۔ ہمیشہ سے اَسلاف و اَخلاف ہوتے چلے آئے ہیں۔ اگر نیّر خلیفۂ اوّل ہے، تم خلیفۂ ثانی ہو۔ اُس کو عمر میں تم پر تقدم زمانی ہے، جانشین دونوں مگر ایک اوّل ہے اور ایک ثانی۔ شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتا ہے، طریقِ صید افگنی سکھاتا ہے۔ جب وہ جوان ہو جاتے ہیں آپ شکار کر کھاتے ہیں۔ تم سخنور ہو گئے، حسنِ طبع خداداد رکھتے ہو۔ ولادتِ فرزند کی تاریخ کیوں نہ کہو۔ اسم تاریخی کیوں نہ نکال لو کہ مجھ پیرِ غم زدہ، دلِ مُردہ کو تکلیف دو؟ علاؤ

الدین خان تیری جان کی قسم، میں نے پہلے لڑکے کا اسمِ تاریخی نظم کر دیا تھا اور وہ لڑکا نہ جیا۔ مجھ کو اِس وہم نے گھیرا ہے کہ میری نحوستِ طالع کی تاثیر تھی۔ میرا ممدوح جیتا نہیں۔ نصیرالدین حیدر اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چل دیے۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے، پھر نہ سنبھل سکے۔ جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے وہ عدم سے بھی پرے پہنچا۔ نہ صاحب دوہائی خدا کی میں نہ تاریخِ ولادت کہوں گا نہ نامِ تاریخی ڈھونڈوں گا۔ حق تعالیٰ تم اور تمہاری اولاد کو سلامت رکھے اور عمر و دولت و اقبال عطا کرے۔ (ص ۳۶۸)

ایک اور خط میں بھی غالب دیکھیے کیسے لطیف انداز میں اس کی طرف کس طرح اشارہ کرتے ہیں:

''ہر چند قاعدۂ عام یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم عالمِ ارواح میں سزا پاتے ہیں لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔ ۱۳ برس حوالات میں رہا، ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلّی شہر کو زندان مقرر کیا اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا۔ فکرِ نظم و نثر کو

مُشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد میں جیل خانے سے بھاگا۔ تین برس بلادِ شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایانِ کار مجھے کلکتے سے پکڑ لائے اور پھر اُسی مجلس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے، دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں۔ پاؤں بیڑی سے فگار، ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار، مُشقتِ مقرری اور مشکل ہوگئی، طاقت یک قلم زائل ہوگئی۔ بے حیا ہوں، سالِ گزشتہ بیڑی کو زاویۂ زنداں میں چھوڑ مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ مراد آباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا، کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا، بھاگوں کیا بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔ حکمِ رہائی دیکھیے کب صادر ہو۔ ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اسی ماہِ ذی الحجہ ۱۲۷۷ھ میں چھوٹ جاؤں۔ بہ ہر تقدیر، بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا۔ میں بھی بعدِ نجات سیدھا عالمِ ارواح کو چلا جاؤں گا:

فرخ آنروز کہ از خانۂ زنداں بروم
سوے شہرِ خود ازیں وادیِ ویراں بروم

(ص: ۲-۷۱-۳۷۱)

غالب کبھی کبھی الفاظ کے الٹ پھیر سے بھی مزاح کے پہلو پیدا کر لیتے ہیں جس میں صورتِ حال پر طنز کی ایک ہلکی سے لہر بھی مسلط رہتی ہے۔ الفاظ سے

پینترے بدلوانے کا فن غالب سے بہتر اُن کے دور میں شاید اور کسی کے حصے میں نہ آیا تھا اگرچہ اُس دور میں غالب کے پائے کے اور بھی کئی لوگ موجود تھے۔ اسی خصوصیت کی وجہ سے غالب اپنے ہم عصروں میں سب سے الگ اور منفرد ہی نہیں دراز قد بھی دکھائی دیتے ہیں: میر مہدی مجروح کے نام اپنے ایک خط میں اپنے حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''یہ میرا حال سنو! بے رزق جینے کا ڈھب مجھ کو آ گیا ہے۔ اس طرف سے خاطر جمع رکھنا۔ رمضان کا مہینہ روزہ کھا کھا کر کاٹا، آیندہ خدا رازق ہے۔ کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے۔ بس صاحب، جب ایک چیز کھانے کو ہوئی، اگرچہ غم ہی ہو تو پھر کیا غم ہے؟ (جلد دوم۔ ص ۴۹۴)

مسئلہ چاہے کوئی بھی زیرِ بحث ہو، بات دین کی ہو رہی ہو یا دنیا کی غالب کی نگاہِ ستم کوئی نہ کوئی کمزور پہلو ایسا تلاش کر لیتی ہے جسے طنز کا نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔ اسی میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں دیکھیے غالب کس طرح امتِ مسلمہ میں پائے جانے والے نفاق کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں:

> ''میرن صاحب جے پور پہنچے، تم شاہ پوری بتاتے ہو، شاید سچ یہی ہو۔ ہاں! میر محمود علی اور یہ، بیر بر اور ابوالفضل تو تھے، مگر دیکھا چاہیے، درخت جگہ سے اکھڑ کر بہ دشواری جمتا ہے۔ خلاصہ میری فکر کا یہ ہے کہ اب بچھڑے ہوئے یار کہیں قیامت ہی کو جمع ہوں تو ہوں، سو وہاں کیا خاک جمع ہوں گے۔ سنی الگ، شیعہ الگ،

نیک جدا، بد جدا۔'' (جلد دوم، ص ۴۹۶)

اوپر پیش کردہ معروضات سے اِس بات کا اندازہ ہو گیا ہو گا کہ غالب کے خطوط میں جہاں اُس دور کی دلّی ہمیں اپنی تمام تر خوبیوں اور خرابیوں کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے، وہیں ان سے ہمیں غالب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں سے بھی کماحقہ روشناس ہونے کا موقعہ ملتا ہے۔ خصوصاً ان کی ظریف الطبعی کی ایسی ایسی تصویریں ان میں جا بجا بکھری ہوئی ہیں کہ ان کے دور کی کسی دوسری شخصیت میں ہمیں اتنی ساری خصوصیات بیک وقت مجتمع نظر نہیں آتیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے مکاتیب کا جتنی بار مطالعہ کیا جاتا ہے ان میں ہمیں اتنی ہی نئی چیزیں اور اتنے ہی نئے پہلو ابھرتے نظر آتے ہیں۔ غالب کی عظمت کی اس سے روشن دلیل اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔

آزرمیدخت صفوی

''غالب کی فارسی مکتوب نگاری۔ پنج آہنگ کی روشنی میں''

اسد اللہ خاں غالب کی یوں تو ہزاروں خواہشیں رہی ہوں گی اور شاید ہر ایک ایسی کہ اس پہ دم نکلے لیکن ان میں کم سے کم دو کا اظہار انھوں نے بار بار اور بے اختیار کیا ہے: ایک یہ کہ ان کے فارسی طرز کو ''استادان پیشین'' کی طرز کا مماثل مانا جائے:

تو ای کہ محو سخن گستران پیشینی
مباش منکر غالب کہ در زمانۂ تست

دوسری یہ کہ ان کے فارسی کلام کو ان کے اردو کلام پر ترجیح دی جائے اور ''نقش ہای رنگ رنگ'' دیکھنا ہوں تو دیوان اردو کی جگہ فارسی کلیات کی طرف رجوع کیا جائے۔ نجم الدولہ دبیر الملک کی کون کون سی آرزوئیں پوری ہوئیں، اس کا علم تو اُن کو ہوگا اور ان کے خدا کو، لیکن یہ دو خواہشیں تو بہر حال فی الجملہ تشنۂ تکمیل رہیں۔ فارسی

جاننے والوں کی اصطلاح میں ''پیشینان'' یا ''قدما'' سے مراد ہوتی ہے رودکی، فرخی، منوچہری، عنصری، فردوسی، بلعمی وغیرہ۔ غالب کا فارسی طرز شعر اور نثر کو ان قدما کے انداز سے کوئی سروکار نہیں، البتہ دور گورکانیان کے شاعروں اور ادیبوں کا طرز یعنی سبک ہندی ضرور ان کے کلام پر چھایا ہوا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی خود پسند اور بے باک طبیعت اس کو ماننے سے ابا کرتی ہے کہ ان کا مرجع تقلید ہندوستانی شعرا اور نثر نویس تھے۔

غالب کی دوسری خواہش کہ ان کا فارسی کلام ان کے اردو کلام سے زیادہ مورد توجہ ہو، شاید قبول ہی ہو جاتی لیکن اس میں رکاوٹ بنا خود ان کا اردو کلام جس نے ایسا طلسم بُنا اور ایسی انوکھی فضا پیدا کی جو اردو شعر و ادب کے لیے بالکل نئی تھی۔ ہندوستان میں غالب جیسے فارسی شعر کہنے والے اور بھی تھے، لیکن اردو میں ان کا مقام ممتاز اور مشخص تھا اور ہے۔

یہی بات ان کی فارسی مکتوب نگاری پر بھی صادق آتی ہے۔ اردو میں انہوں نے ایسے طرز نامہ نویسی کی بنا ڈالی جو نہ ان سے پہلے کسی کو میسر تھا نہ ان کے بعد کسی کے بس میں ہے۔ چنانچہ ان کے فارسی خطوط ان کے اردو خطوں کے تحت الشعاع قرار پا گئے اور ان پر ویسی توجہ نہیں ہوئی جیسی ہونا چاہیے تھی، حالانکہ اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے یہ خطوط قابل ملاحظہ ہیں۔ مقالۂ حاضر میں ''پنج آہنگ'' کی روشنی میں غالب کے فارسی خطوط کا مختصر جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ وہ خطوط ہیں جو پنج آہنگ کے آہنگ پنجم میں دستیاب ہیں۔ جناب وزیر حسن عابدی کی مرتب کردہ پنج آہنگ کا پانچواں آہنگ ۶۳ خطوط پر مشتمل ہے۔ ان میں سب سے زیادہ خطوط (۳۰) مولوی سراج الدین احمد کے نام ہیں۔ اس کے بعد نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے (۱۷) بجز چند کے جو میجر جاکوب، جیمز تامسن، شمس الامرا نائب والی حیدر آباد، سلطان العلما

مولوی سید محمد، نواب محمد علی خان بہادر عرف میرزا حیدر صاحب، نواب امداد حسن خان بہادر، وزیر اودھ، دیوان مہاراجہ الور، صاحب عالم میرزا سلیمان شکوہ بہادر وغیرہ کے نام ہیں، باقی سب خطوط اخوانی ہیں۔

اس مجموعۂ نثر کا پانچواں آہنگ خطوط پر مبنی ہے اور پہلا بیانِ اصول وضوابط نامہ نگاری پر جس کو غالب نے 'القاب و آداب و ما یتعلق بہا' کا نام دیا ہے۔ مرزا علی بخش رنجور جو پنج آہنگ کے پہلے مُدوّن تھے، لکھتے ہیں کہ چونکہ برادر قدسی اثر جناب اسداللہ متخلص بہ غالب میرے اوپر خاص کرم کرتے تھے اور "درمیان این نحیف و آن سخنور یکتا پیوند قرابت استوار است، لاجرم مرا بہ انواع لطف و مکرمت نواختے و ہموارہ بہ دانش و بینش رہنمایی کردے۔ تا اینکہ حسب التماس من ورقی چند از القاب و آداب و شکر و رسید خطوط و شکوۂ عدم رسی مکاتبات رقم فرمودہ بمن عطا نمود۔ آن نگاشتہ ہا در فن تحریر دستور العمل خود ساختم۔"

غالب آہنگ اول کی تمہیدی عبارت میں خود بھی اس امر کی وضاحت کرتے ہیں کہ انہوں نے مکتوب نگاری کے آداب و القاب کے بابت تفصیلات کو جس کو وہ "دستور العمل موجز برای نامہ نگاران" کہتے ہیں، 'برادر ستودہ خوی، مرزا علی بخش کی فرمائش پر لکھا ہے:

"از من آرزو کرد کہ القاب و آداب متعارفہ رسمیہ بروی
ہم ریختہ و الفاظ شکر و شکوہ و شادی و غم باہم آمیختہ و ساختہ
آید"۔

اس فرمائش کا سرانجام انہوں نے تین دن کے اندر کردیا:

"درعرض سہ روز سواد این اوراق بپایان رسید۔"

ان ابتدائی کلمات کے بعد غالب "القاب و آداب" وغیرہ کا بیان شروع

کرنے سے قبل مکتوب نگاروں کو چند عمومی ہدایات دیتے ہیں جن کا لب لباب کچھ اس طرح ہے:

۱۔ مشکل اور نامانوس الفاظ سے پرہیز کرے

۲۔ تحریر و تقریر میں زیادہ فرق نہ ہو اور مکتوب نگار "نبشتن را رنگ گفتن دہد"۔

۳۔ استعارہ ہای دقیق و لغات مشکلہ استعمال نہ کرے۔

۴۔ عربی الفاظ بس بقدر ضرورت ہوں۔

۵۔ ادائے مطلب میں سادگی ہو۔

ان ہدایات کے بعد وہ "مراتب اعیان روزگار" کے حساب سے مکتوب الیہ کو تین قسموں میں بانٹتے ہیں: اعالی و اواسط و ادانی اور تینوں طرح کے خطوط کے القاب و آداب، فقرات خیریت، رسید نامہ، شکوۂ نرسیدن خط، استدعای ارسال خطوط، فقرات درخاتمۂ مکاتیب، اور فقرات دعائیہ کا بیان کرتے ہیں اور مثالیں دیتے ہیں۔ باب کے آخر میں تعزیتی اور تہنیتی خطوط کے لکھنے کا طریقہ اور مثالیں نقل کرتے ہیں۔

آہنگ اول کے مذکورشدہ مطالب سے طرز مکتوب نگاری کے بابت غالب کی ہدایات کا علم ہوتا ہے اور یہ گمان بھی کہ وہ خود القاب و آداب، پرسشِ احوال وغیرہ میں وہی انداز اختیار کریں گے جو انہوں نے اس دستور العمل میں بطور مثال دیتے ہوئے خطوط میں پیش کیا ہے۔

دلچسپ بات وہاں سے شروع ہوتی ہے جب آہنگ پنجم کے خطوط کو پڑھ کر ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا اسد اللہ نے خود خط لکھتے وقت اپنی بتائی ہوئی ان رسوم متعارفہ اور قوانین مندرجہ کو ہوا پر اڑا دیا جن کی نشاندہی غریب رنجور اور دیگر مکتوب نگاروں کو کی تھی۔

فارسی میں غالب کا اپنا طرز مکتوب نگاری کیا تھا؟ اپنے بتائے ہوئے لوازمات کی پابندی انہوں نے کس حد تک کی اور اگر نہ کی تو کیوں؟ ان باتوں کو سمجھنے کے لیے آہنگ اول کے تناظر میں آہنگ پنجم کے خطوط پر نظر ڈالنا ہوگی:

یہ بتانے کے بعد کہ انہوں نے یہ دستور العمل مرزا علی بخش کی درخواست پر لکھا ہے، غالب کہتے ہیں:

''ہر چند بیگانگی این روش از شیوۂ غالب مستمند نہ
چندانست کہ بہ گفتن نیاز داشتہ باشد۔''

ان کا یہ فقرہ ان کی افتاد مزاج اور سبک نامہ نویسی کو سمجھنے کی کلید ہے۔ بے شک وہ اپنے برادر 'ستودہ خو' کی فرمایش پر، اس کی خاطر نامہ نویسی سے متعلق ایک رسالہ لکھنے پر آمادہ ہو گئے، لیکن ان کے مزاج کا وہ عنصر جو روشِ عام پر چلنے سے وحشت کرتا تھا، یہاں بھی کارفرما رہا اور انہوں نے بڑی وضاحت سے اس بات کو بتا دیا کہ ان کو ان رسوم وضوابط اور اصول وقواعد سے چنداں سروکار نہیں۔ ہمیشہ کی طرح ان کی اپنی راہ سب سے جدا ہے اور وہ رسوم وقیود سے مستغنیٰ:

بندگی میں بھی وہ آزادہ وخود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

مکتوب نگاری کا یہ بندھا ٹکا format اور زبان ان حضرات کے لیے بتایا گیا ہے جو اس کے محتاج ہوں اور ان کے خطوط عامہ مردم کے مرجع نظر۔ وہ صاحب طرز ادیب ہیں، ان کے شعر کی طرح ان کی طرز نامہ نویسی بھی مشخص ہے، جس کو وہ ''شیوۂ غالب'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ جو شخص جنت کے قصور وحور کی یکسانی کے تصور سے گھبرا جائے، وہ ایک ہی ڈھرّے کی مکتوب نویسی کیونکر کر سکتا ہے۔

''نامہ نگار را باید کہ بیشتر بہ مذاق اہلِ روزگار حرف زندو

ازاحاطۂ قواعد وقوانینی کہ قرار دادۂ ایں مردم است،
بدر نرود۔"

کیا 'این مردم، کی ترکیب میں کچھ contempt کی بوآتی ہے؟

سادہ نگاری:

غالب نے فارسی خطوط نویسی کے لیے جو معایر وموازین بیان کیے ان میں سب سے مشہور ان کا یہ فقرہ ہوا "نبشتن رارنگ گفتن دہد"۔ اس فقرہ کی زد پر ان کے فارسی خطوط بار بار آئے۔ شیخ محمد اکرام اپنے غالب نامے میں لکھتے ہیں:

"غالب نے رنجور کی استدعا پر جو فارسی رسالہ مکتوب نویسی سے متعلق لکھا، اس سے خیال ہوتا ہے کہ وہ خط و کتابت سے متعلق ایک خاص نقطۂ نظر رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ مکتوب نویسی میں وہی زبان استعمال کی جائے جو گفت وشنید میں ہوتی ہے۔ اگرچہ خود غالب نے فارسی خطوط میں اس کی پوری پیروی نہیں کی۔"

دوسرے ناقدین نے بھی غالب کے نظریہ اور عمل میں اس اختلاف کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یعنی انہوں نے کہا کچھ اور، کیا کچھ اور۔ اس کے علاوہ قول اور فعل کے اس تضاد کے علاوہ بعض حضرات بین السطور میں غالباً یہ بھی اشارہ کرنا چاہتے تھے کہ شاید غالب سادہ محاورۂ فارسی پر قدرت نہ رکھتے تھے اور اہل زبان کی سادہ اور فصیح فارسی لکھنے کی ان کو فی الجملہ مشق نہ تھی۔

لیکن ان دونوں باتوں میں سے پہلی ذرا simplistic ہوگی اور دوسری ناانصافی۔ غالب ایک باسلیقہ اور سمجھ دار نثر نویس تھے۔ ان کو بھی یہ احساس ہوگا کہ ان کے فارسی خطوط اس طرز پر نہیں جس کی ہدایت انہوں نے دی ہے۔ پھر آخر کیا وجہ تھی

کہ انہوں نے عمداً اس ہدایت کی پابندی نہ کی؟ اس کا پہلا سبب تو غالباً یہی ہے کہ صاحب طرز ادیب اور نویسندہ اپنے لیے خود اصول وضع بھی کر سکتا ہے اور موقع کی مناسبت سے ان میں ترمیم و تنسیخ بھی کر سکتا ہے۔ عام لکھنے والے میں نہ یہ صلاحیت ہوتی ہے نہ سلیقہ، وہ افراط و تفریط دونوں کا شکار ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ وہ ایک چارچوب format کی پابندی کرے۔ غالب کی وہ ہدایات عام آدمی کے لیے تھیں۔ وہ خود ان پر عمل کر بھی سکتے تھے اور نہیں بھی۔

فارسی خطوط میں اس پر عمل نہ کرنے کا ایک اہم سبب اور بھی تھا۔ غالب فارسی زبان کے مزاج سے واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ وہ زبان ہے جو ڈھائی ہزار سال کا ماضی رکھتی ہے اور ماضی بھی ایسا جو سلجوقی اور صفوی سلاطین کے پرشان و شکوہ درباروں میں پروان چڑھا ہے۔ لازمی طور پر فارسی زبان میں وہ تمام تکلفات، حفظ مراتب، آرایش کلام اور structured approach ساخت بڑے فطری انداز میں رچی بسی ہوئی ہے جو دربار شاہی کا لازمی جزو ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ ہر قوم کا ایک مزاج ہوتا ہے جس کا اثر مستقیماً اس قوم کے زبان و ادب پر پڑتا ہے۔ ایرانی قوم کے مزاج میں آج بھی تکلف اور تعارفات بڑی حد تک موجود ہیں۔ آج بھی فارسی خطوط بڑے اہتمام سے لکھے جاتے ہیں: ''من'' کی جگہ ''بندہ'' اپنے سے اعلیٰ مرتبہ رکھنے والے یا بزرگ کے لیے آن حضرت، ''آن دوست'' لکھا جاتا ہے اور براہ راست اس کو مخاطب نہیں کیا جاتا۔ نامہ نگار اپنے کو واحد متکلم کی جگہ 'این جانب' لکھتا ہے۔ زمانۂ موجودہ کی دو ایرانی کتب ''انشاء و نامہ نگاری برای ہمہ'' اور ''انشاء نو'' سے دو ماڈل خطوط کے اقتباسات اس بات کو واضح کر دیں گے:

۱۔ دوست گرانمایہ و گرامی وارجمند،

نامۂ مہر آمیز و سرتا سر لطف آن دوست این جانب را

بی نہایت بہجت وشادمانی بخشید۔ از آنکہ نسبت بہ بندہ آن ہمہ مؤدت ومحبت را ابراز فرمودہ اید فوق العادہ سپاسگزارم۔

(ص ۸۱)

۲۔ بزیارت ملاطفت نامۂ جنابعالی بندہ بسیار ممنون وسپاسگزار شد۔ بندہ امیدوار ہست کہ این تشکرات در حضور آن محترم موقع قبول یافتہ برمراتب توجہات و التفات آنجناب نسبت بہ این بندہ افزودہ گردد۔ (ص ۱۲۰)

انیسویں صدی میں خود غالب کے ہم عصر ایرانی نویسندے باوجود سادہ گرایی اور سادہ نویسی کی تحریک کے پرتکلف اور مصنوع فارسی میں خط لکھ رہے تھے: قایم مقام:

امید از رافت ورحمت خداوند یگانہ دارم کہ احوال خجستہ مآل آن دستگاہ عصمت وعفت مقرون بہ بہجت و عافیت باشد رقیمہ جات مفصل مصحوب ذوالفقار بیگ رسیدہ بود۔ عریضۂ مختصری می نوشتم تا اواسط صفحہ طوری باہم آمدیم آنجا قلم سرکش کرد عنان از دست گرفتم ....

از آن زمان کہ رشتۂ مراد دولت حضوری گسستہ و شیشۂ شکیبائی از سنگ تفرقہ و دوری شکستہ، طایر مکاتبات راپر بستہ و کلبۂ مؤدت دربستہ۔ شمارا طرب داد و مارا تعب۔

ان خطوط کے پہلو بہ پہلو اگر مرزا کے خطوط کو رکھا جائے تو وہ اسی طرز کا extension معلوم ہوں گے۔

غالب:

''من وایمان من کہ ریشۂ مہر شما بہ مغزِ دل و دیدہ ومحبت شما با جان در آمیختہ۔ تازندہ ام، بندہ ام۔ وفا آئین من است و موّدت دین من است۔ اگر در نگارش نامہ درنگے روی دہد، برفراموشی محمول نشود۔ دردہا در دل، دہنگامہ ہا در نظر وتفرقہ ہا در خاطر و سوداہا در سر، چہ گویم چہ می کنم و روز وشب چگونہ بسر می کنم۔'' ص ۳۳۳

اس پس منظر میں دیکھیے تو یہ بات خاصی قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے فارسی خطوط نویسی میں یہ طرز جان بوجھ کر اور اس زبان کی روایت کو نظر میں رکھتے ہوئے اختیار کی نہ کہ عجز سخن سے۔

ایک اور بات توجہ چاہتی ہے: غالب نے لکھا ''رنگ گفتن دہد۔'' کیا اس سے صرف یہی مراد لی جاسکتی ہے کہ ان کا مطلب مکالماتی محاورہ سے ہے؟ spoken word میں مکالمے کی سادگی کے علاوہ اور بھی کئی جہات ہوتی ہیں: لہجے کی گرم جوشی، انداز کی برجستگی، بیان کی شگفتگی اور روانی، بات کا مخاطب کے حسب حال ہونا وغیرہ۔ عام خط لکھنے والا بسا اوقات ان باتوں کا لحاظ نہیں رکھتا جس سے اس کی تحریر میں ایک طرح کی بے کیفی، میکانکی انداز اور بے لطفی پیدا ہوجاتی ہے اور خط ایک رسمی اور بے جان چیز بن کر رہ جاتا ہے۔ غالب کا مدعا یہ بھی ہے کہ ایسے بے جان خطوط اور بے روح تحریر سے گریز کیا جائے اور خطوط میں بھی وہی جان، شگفتگی، گرماگرمی اور برجستگی پیدا کی جائے جو گفتگو میں ہوتی ہے۔ ان کے فارسی خطوط کو پڑھیے، باجود عبارت کی آرایش کے، نہایت بامزہ اور پرکیف پایئے گا:

''...شما درنا کاھی من است، ورنہ اگر تاب وتوان داشتمی

آن قدر با شما در آویختے کہ شمار دامن و گریبان بہ زیان رفتے و مرا سرو رو شکستے۔ آخر از خدا بترسید و از روی داد بسنجید۔"

"زنہار اے مولوی سراج الدین! بترس از خدای جہان آفرین کہ چون قیامت قایم گردد و آفریدگار بہ داد نشیند من مویہ کنان و گریان در آن ہنگامہ آیم و در تو آویزم و گویم کہ این آن کس است کہ یک عمر مرا بہ محبت بہ فریفت و دلم بُرد۔ چون من از سادگی بر وفا تکیہ کردم و این را از دوستان برگزیدم، نفس کج یافت و بہ من بے وفائی کرد۔ خدارا بگو آن زمان چہ جواب خواہی داد و چہ عذر پیش خواہی آورد۔"

اگر حقیقت پوچھیے تو یہ ہے کہ غالب کے فارسی خطوط میں وہ کیف اور مزہ ہے جو اس وقت کے ایرانی نامہ نویسوں کے ہاں باوجود اہل زبان ہونے کے نظر نہیں آتا۔ خطوط نویسی communication ابلاغ و ترسیل کا اہم ترین وسیلہ ہیں۔ جو اس فن میں جس قدر ماہر ہوگا اس کے خطوط بھی اتنے ہی با اثر ہوں گے۔ غالب کے اردو خطوط ان کے اس وصف مخصوص کے جیتے جاتے ثبوت ہیں۔ زبان بدل جانے سے فطری صلاحیت کم نہیں ہوتی، مختلف سمت میں channelise ہو جاتی ہے اور اپنا اظہار اس زبان کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے کرتی ہے کہ یہی بلاغت ہے۔ غالب کے فارسی مکتوب اسی بلاغت کے آئینہ دار ہیں۔

القاب و آداب:

فارسی مکتوب میں غالب کے القاب و آداب کا انداز بھی بامزہ اور لطیف ہے۔ آہنگ اول میں القاب و آداب کے ذیل میں انہوں نے کئی صفحے لکھے ہیں اور بزرگوں، استادوں، مرتبہ داروں، رشتہ داروں، دوستوں یہاں تک کہ "ملازمان و

نوکران" تک کے لیے الگ الگ اور مخصوص اور مقرر القابات کی مثالیں دی ہیں:

ابتدا از القاب پدر = حضرت ولی نعمی، قبلۂ کونین وکعبۂ دارین، قبلۂ جسم وجان وکعبۂ روح رواں۔

وہ لکھتے ہیں کہ یہی القاب دو تین الفاظ کے تغیر کے ساتھ مرشد اور استاد کے لیے بھی استعمال ہو سکتے ہیں۔ اس کے بعد "آداب والقاب متوسط کہ بالفعل عبارت از تحریر مراسلت احباب است" کا بیان کرتے ہیں:

"ہر چہ در خور حفظ ہر رتبہ باشد، رعایت آن ملحوظ باید داشت ودر میزان متصدیان 'شفیق' بر 'مشفق' و 'مشفق بر مہربان می چربد و "کرمفرمای مخلصان" بر "کرمفرمای دوستان" تفوق دارد۔"

یہ تمام موشگافی ایک طرف اور ان کے اپنے خطوط کے القاب وآداب ایک طرف! پورا آہنگ پنجم پڑھ جائیے، ٹکسال سے نکلے ہوئے یکساں اور یک روسکوں جیسے یہ القاب وآداب کہیں مشکل سے ہی پائیے گا۔ ہر خط ایک نئے طریقے، ایک مختلف انداز سے شروع ہوتا ہے۔ ایسا احساس ہوتا ہے کہ لکھنے والے کے لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ ہے، وہ اپنے مخاطب سے رسمی اور mechanical الفاظ کو بیچ میں ڈالے بغیر اس تعلق کے وسیلے سے بات کرنا چاہتا ہے جو ان کے درمیان میں ہے۔ خط کے القاب اور ابتدائی سطور میں ہی ایک نامعلوم طریقے سے اس تعلق کا ابلاغ قاری کو ہو جاتا ہے۔ نواب مصطفیٰ خان کو لکھتے ہیں:

خواجۂ نانوشتہ خوانان، ناگفتہ دان را از بندۂ سادہ، دل بہ وفا نہادہ صد ہزار آفرین۔

عبارت مسجع ہے لیکن غالب کے بے تکلف انداز اور بے اختیار لہجے نے

اس میں آورد پیدا ہونے نہیں دی اور یہی ان کا کمال ہے۔

دوسرے کچھ القابات: رشک طالب وفخر غالب نواب مصطفیٰ خان، مہربان روی مہربانی خوی سلامت، ولی نعمت طوطیان شکر خا سلامت، عمر من و جان من مولوی سراج الدین احمد صاحب، چشم و چراغ دودۂ مردمی و مردم دیدۂ من منشی جوہر سنگھ جوہر بہ سرت گردم؛ وغیرہ وغیرہ۔

اکثر خطوط کو بغیر القاب و آداب کے کسی چست جملے یا رنگین عبارت سے شروع کر دیتے ہیں:

آتش خس پوش بلکہ آتش خاموش کہ صورتیان اسد اللہ روسیاہش نامند۔

مطلب بے شمار و مدعا بسیار و حوصلۂ وقت تنگ و ظرف گفتگو تنگ، مختصر مفید۔

شادم کہ رسیدن نامہ بہ رسیدن جامہ آگہم کرد و گرمی ہنگامہ افزود۔ وغیرہ۔

فقرات خیریت: اس زمانے تک القاب کے بعد فقرات خیریت لکھنے کا رواج تھا۔ خود غالب نے بھی آہنگ اول میں ''فقرات خیریت'' کا الگ عنوان قایم کیا ہے۔ جس کے ذیل میں بہت سے ایسے فقرے بطور مثال لکھے ہیں۔

لیکن خود ان کے خطوط میں ان فقرات کا فقدان ہے۔ وہ کہہ چکے ہیں کہ ''خیریت گویی و عافیت جوئی حشو زاید است''۔ ایسی پیش پا افتادہ اور گھسی پٹی رسم کو اختیار کرنا ان کے لیے چبائے ہوئے نوالے کو چبانا اور کہی ہوئی بات کو دہرانا ہے۔ پانچویں آہنگ کے ۶۳ خطوط میں سے کسی ایک میں بھی ''فقرہ ہای خیریت'' موجود نہیں۔ القاب کے بعد یا بغیر القاب کے وہ کسی برجستہ اور رنگین عبارت کو سرنامہ بنا کر

خط شروع کر دیتے ہیں:

''ہان وہان این نامہ ایست از اسد اللہ دردمند بسوی آن یار خود پسند۔ (ص ۳۴۱)

من دانم و دل کہ در شکوہ چہ روش ہا ایجاد و در گلہ چہ عربدہ ہا بنیاد کردمے۔

بدنخواہی گفت کہ اسد اللہ داد خواہ مرا از دیوانگی بستوہ آوردہ۔

درد ہا در دل و ہنگامہ ہا در نظر و تفرقہ ہا در خاطر و سودا ہا در سر، چہ گویم چہ می کنم و روز و شب چگونہ بسر می برم

رسیدن نامہ:

جس کو غالب نے 'رسید' یا 'رسید ملاطفات' کہا ہے۔ خطوط وصول ہونے پر کس طرح شکر گزاری کی جائے اس کی کئی مثالیں آہنگ اول میں دی ہیں اور مختلف جملے بدل بدل کر اس مطلب کو ادا کرنے کا طریقہ بتایا ہے۔

خود غالب نے کہیں بھی ان جملوں کو استعمال نہیں کیا۔ کبھی وہ شعر کے ذریعہ اپنی شکر گزاری کا اظہار کرتے ہیں:

جان برسر مکتوب تو از شوق فشاندن
از عہدۂ تحریر جوابم بدر آورد

کبھی ایک خوبصورت فقرہ میں یوں کہتے ہیں:

از رسیدن دلکشا نامہ دانستم کہ بیکس نیم و کس دارم۔

کبھی اپنے اور مکتوب الیہ کے خصوصی تعلق اور اس کے مکتوب کے وصول

سے میسر آنے والی خوشی کو اس طرح ادا کرتے ہیں:

دلنواز نامہ پس از عمرے رسید و عمرے دیگر
بخشید۔ مستانہ از جا بر جستمی و جہان جہان نشاط اندوختمی۔

این نامہ کہ راحت دل ریش آورد — سرمایۂ آبروی درویش آورد
در ہر بن مو دمید جانے یعنی — سامان نثار خویش با خویش آورد

امانرسیدن خط و شکایت: اس سلسلے میں آہنگ اول میں غالب نے تقریباً دو صفحے تحریر کیے ہیں اور لکھا ہے کہ وہی فقرات جو رسید نامہ میں لکھے جاتے ہیں، منفی انداز میں یہاں لکھے جا سکتے ہیں۔

لیکن خود ان کی شکایت کا رنگ سب سے جدا ہے۔ غالب بنیادی طور پر شاعر ہیں اور وہ بھی غزل کے شاعر جس کے موضوعات اور مضامین کا ارتکاز شکوہ پر ہے۔ مشرقی شعرا نے شکوہ اور شکایت کے مضمون کو بلا مبالغہ، ہزار رنگ سے باندھا ہے اور اس میں ہزار رنگ پیدا کیے ہیں:

مکن بہ پرسشم از شکوہ منع کیں خونیست
کہ خود بخود ز دم دوختن فرو ریزد

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

سرو سیمینا بہ صحرا می روی
نیک بدعہدی کہ بی ما می روی

شکوہ کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ کہ جو کہیے تو گلہ ہوتا ہے

غزل کا شاعر ہونے کی حیثیت سے شکوہ کا موضوع فطری طور پر غالب کے ذہن کو مہمیز کرتا ہے۔ چنانچہ اپنے خطوط میں جہاں جہاں بھی انہوں نے خط نہ لکھنے کا، جواب نہ دینے کا، بے توجہی برتنے کا شکوہ کیا ہے وہاں ہر بار ایک نیا انداز اختیار کیا ہے:

قبلۂ حاجات، دشوار است بہ ہجران زیستن و دانم
کہ بیدوست نتوان زیستن۔
اگر نہ اندوہ سترگ بند بر دلم نہادہ بودے، من دانم
و دل کہ در شکوہ چہ روش ہا ایجاد و در گلہ چہ عربدہ ہا بنیاد
کردمے۔

کار من وشما بدان رسید کہ روزگار ہا بگذرد و بہ نامہ
یاد نکردم۔ گفتم کہ در بند گزارش اندوہے تازہ ام،
شکوہ کجا بہ خاطر ناشادی رسد

چار ماہ است کہ از نارسیدن فروغانی نامہ روزم
سیاہ است۔ کافر باشم اگر گمان بے التفاتی رود یا بے
مہری مظنون خاطر شود۔

بے تو گر زیستہ ام تختی این درد بسنج
بگذر از مرگ کہ وابستہ بہ ہنگامی است

بودش از شکوہ خطر ورنہ سری داشت بمن
بہ مزارم اگر از مہر بیاید چہ عجب

اختتامیہ کلمات اور فقرہ ہای دعائیہ: آہنگ اول میں غالب کا کہنا ہے کہ ان فقروں کو ''باید بے الفاظ مغلق بنویسند''۔ پھر بہت سے اختتامیہ جملے اور دعائیہ کلمات بطور مثال لکھے ہیں: زیادہ ازیں چہ نویسم، زیادہ زیادہ، بخت فراوان وزمانہ مہربان وغیرہ۔ ایسے فقرے ان کے خطوط میں بھی جابجا، بلکہ خاص جگہ نظر آتے ہیں، لیکن اکثر خطوط میں محض 'والسلام' کہنے پر اکتفا کی ہے یا کسی چھوٹے سے لطیف فقرے اور رنگین عبارت سے شگفتگی پیدا کی ہے:

نگاشتۂ دومی روز از ماہ روزہ؛ نگاشتہ پنج شنبہ ہنگام نماز عصر کہ ابر قطرہ فشان بود و ہوا تنگرگ باران؛ تا نامہ بہ پایان نرسید نان نخوردم؛ اشک وآہ غالب نامراد یعنی آب وہوای اکبرآباد بہ شما سازگار باد۔

نامہ ہای تہنیت وتعزیت: آہنگ اول میں غالب نے ایسے خطوط کا ذکر الگ کیا ہے۔ تعزیت کے خطوط کو وہ اظہار اندوہ ملال، تعلیم صبر وشکیبائی، مغفرت خواستن پر مشتمل کرتے ہیں اور تہنیتی خطوط میں خاص طور پر ہدایت کرتے ہیں کہ الفاظ موحش اور نکوہیدہ استعمال نہ کیے جائیں۔ انہوں نے کئی مثالیں ان دونوں قسموں کے خطوط کی دی ہیں جو مروجہ فقروں پر مشتمل اور لطافت سے عاری ہیں۔ غالب کے اردو خطوط سے آشنا حضرات جانتے ہیں کہ ان دونوں موارد میں انہوں نے کیسے بے ساختہ

جذبات کا اظہار کیا ہے:

یوسف میرزا کے والد کے انتقال پر غالب کے خط سے ہم سب واقف ہیں۔

ان کے فارسی کے خطوں میں بھی کم سے کم ایک تعزیت کا خط شامل ہے جو انہوں نے مولوی سراج الدین احمد کو میرزا احمد بیگ کی رحلت کی خبر سن کر لکھا تھا۔ یہ خط ان کے دلی اور پرخلوص جذبات کا بے ساختہ اظہار ہے:

"والا نامہ رسید ونوید فراق دائمی مرزا احمد بیگ رسانید۔ چہ مایہ سنگین دلم وسخت جانم کہ نامہ در تعزیت دوست انشا می کنم واجزای وجودم از ہم نمی ریزد۔ می گفت کہ بہ دہلی می آیم وعدہ فراموش بی مروت راہ گرداند وناقہ سر منزل دیگر راند۔ وای بے یاری یاران وی ودریغا بے پدری پسران وی۔

خصایص نام بردہ کے علاوہ، خطوط غالب کی، خواہ وہ اردو میں ہوں یا فارسی میں، سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ لکھنے والے کی شخصیت، اس کے ذہن، اس کی مزاجی کیفیات، احساسات وجذبات، پسند وناپسند کا vibrant اور جیتا جاگتا اظہار ہیں۔ غالب خود 'خامہ ونامہ' کی رسائی اور گیرائی سے آشنا ہیں اور اس کے معترف:

"لاجرم خامہ میانجی بے زبانان است ونامہ زبان دانِ رازدانان"

آخر میں غالب کے فارسی خطوط کی نثر اور ان کے طرزِ ادا کے متعلق چند مختصر معروضات:

غالب کی نثر سبک ہندی کی نثر ہے، بہ تمام معنی۔ یہ وہ سبک ہے جس نے فارسی نظم ونثر کی فکر، زبان اور طرز ادا سب کو تحت تاثیر قرار دیا، جس کی پرورش، نشو ونما،

نضج، کمال اور زوال سب ہندوستان میں ہوا۔ جب کمال کو پہونچا تو ابوالفضل کا اکبرنامہ تخلیق ہوا اور جب زوال پذیر ہوا تو انشائی مادھورام لکھی جانے لگی! غالب کا زمانہ آتے آتے مغلیہ سلطنت کے ساتھ یہ طرز بھی اپنی آن بان اور بانکپن کھو رہا تھا۔ شعر خصوصاً غزل کا شعر استعارے کی دنیا اور علامتوں کا جہان ہے۔ یہاں فکر کا اظہار ایک شعر کے آٹھ دس الفاظ میں ہوتا ہے۔ گویا واقعی سمندر کو کوزہ میں سمو دیا جاتا ہے۔ نثر کا معاملہ جدا ہے۔ اہل زبان اور غیر اہل زبان ہونے کا فرق نثر میں کھلتا ہے، شعر میں کم۔ غالب کے شعر میں سبک ہندی کی تمام باریکی، جاہ وجلال، معنی آفرینی، اور طلسم پورے طور پر موجود ہے۔ ان کے خطوط کی نثر فارسی ابوالفضل کی منشآت کی طرح جزیل تو نہیں، لیکن سبک ہندی کی بنیادی خصایص سے متصف ہے۔

اضافت ہای مرتب و مسلسل: کبھی کبھی ۴،۴ اضافتیں متصل و متواتر لا کر مرکبات بناتے ہیں: پاکیزگی گوہر آبروی خانوادۂ ابروہوا، دلآویزی پیکر چشم و چراغ دودۂ برگ ونوا؛ حساب زیان زدگیہای روزگار گہر سازی؛ گل افشانی گلبن التفات شش جہت؛ سپاس آشنائی بنان گوہر آمای او؛ سجدہ ریز خرامیدن خامۂ نگارش۔

کچھ حد تک یہ بات ہر شخص کے خطوں میں ہوتی ہے لیکن مرزا کے خطوط میں تو ان کی شخصیت ہزار رنگ سے جلوے دکھاتی ہے۔ ایک full-blooded انسان جو دنیا کا گرم و سرد جھیلتا ہے، طرح طرح کی سختیاں اٹھاتا ہے لیکن جانتا ہے کہ زندگی اس کا نام ہے، وہ شکوہ ضرور کرتا ہے لیکن تلخی کے ساتھ کم۔ دوستوں کی بے التفاتی اس کا دل ضرور توڑتی ہے لیکن وہ اپنے کو یوں تسلی دیتا ہے ''این جا مہر و وفا فراوان است لاجرم جفا نیز باید کہ فراوان باشد۔'' دنیا جیسی بھی ہے بری یا بھلی، اس کی رنگارنگی، تڑپ، گہما گہمی، سرد رگی اس کو اپنی طرف کھینچتی ہے، شدید احوال میں بھی اس کی یک گونہ

انقطاعیت اور حس مزاح اس سے یہ معروف فقرہ کہلواتے ہیں "لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔" اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے اور لبوں پر یہ شعر:

گفتنی نیست کہ بر غالب ناکام چہ رفت
می توان گفت کہ این بندہ خداوند نداشت

اضافت ہای مقلوب: مہر افزا نامہ بجای نامۂ مہر افزا، رخشندہ گہر بجای گہر رخشندہ؛ این گران ارز ثمر بجای این ثمر گران ارز، ایں پاک شیرہ بجای ایں شیرۂ پاک، شیریں نیشکر بجای نیشکر شیریں، مینو بار نامہ، شرف افزا نامہ۔

فک اضافت: سراب جای

مرکبات توصیفی نو بہ نو و عجیب: رہرو تشنہ لب امتیاز فروش، سخن پیوند ستایش نگار، ذرہ ہای غازہ اندود، داغ ناصیۂ نگاہ، قبول نظارگیان بی پروا؛ فرہ مند سرو برگ پیدایی۔ بیمودۂ خامۂ پارہ پارہ وغیر بزم طور گرد غم از دل شوی۔

جملہ ہای مقفی: خار این آرزو بدامن دل آویختہ و شور ایں تمنا باغوغای رستخیز آمیختہ، سراب جای دلدادگی و تکیہ گاہ آزادگی؛ پیش طاق بلند نامی را نقش و نگار، و نہال نکو سر انجامی را برگ بار، گہر نسفتن خامہ و گوہرین نگشتن نامہ۔

رعایت لفظی، سجع، تجنیس، ایہام، مراعاۃ النظیر، تضاد، اشتقاق اور بے شمار دوسری صنائع لفظی و معنوی کا بکثرت استعمال۔ چھے چھے، سات سات، کبھی آٹھ، دس فقروں کے بعد فاعل کا فعل اور مبتدا کی خبر آنا۔!

پورے مطلب کا استعارہ میں ادا ہونا: قدسی صحیفۂ تفقد رقم بہ جنبش تسلیم ورود بوی یکدلی و ہمدردی بہ مشام آگہی زد۔ رہرو نظر چون بہ پیدایِ ناپیدای ذوقِ سخن گامِ تماشا بردارد توشئہ بہ ازایں بہ کمر نتواند بست۔

لطافت و رنگینی فکر، نازک خیالی: انگور اگر در ریشگی دانستے کہ آب گشتن و بادۂ ناب گشتن

دیگر است و چاشنی خدا آفریدا ایں شیرۂ پاک دیگر، ہرگز آب نخوردے و بار نیاوردے تا دریں ساختگی بہ مردم دردسر ندادے۔ کہنا مشکل ہے کہ یہ نثر زیادہ لطیف ہے یا مرزا کے یہ شعر:

نہ چلا جب کسی طرح مقدور
بادۂ ناب بن گیا انگور

یہ بھی بے بات جی کا کھونا ہے
شرم سے پانی پانی ہونا ہے

آم کی تعریف میں لکھے گئے اس خط میں، بہار، شیرینی، گل افشانی، گلبن، نخل، برومندی، چاشنی ثمر، اور باغ و بوستاں کا تلازمہ ہے۔

جدت فکر: دیدہ روی دوست ندیدہ و دل بہ مہر گرفتارست، زبان بادوست سخن نگفتہ و خامہ را پیام نگار است ہم دیدہ را بر دل رشک است و ہم زبان را بہ خامہ۔ کاش پیش از نامۂ خود بہ دوست رسیدے تا بہ غصہ خوردن و بر نامۂ خود حسد بردن روی ندادہ۔

''برید فرخندہ نامہ بہ من سپرد و رفت و ابر باریدن آغاز کرد۔ ابر قطرہ می ریخت و من از روی نامہ گہر می چیدم۔ تا اینکہ کلبہ ام از آب و دامنم از گوہر نایاب پر شد۔''

نواب علی بہادر مسند نشین باندہ کے نام خط میں غالب نے پنج آہنگ کے متعلق لکھا ہے:

''اگر نہ از من بودے، گفتمے فارسی را قانونے ہست خرد پسند۔ بسا نکتہ ہای ژرف و فراوان ترکیب ہای شگرف و

لغت ہای نغز بہ نگارش در آمدہ۔

مندرجہ بالا مثالیں انہیں ''ترکیب ہای شگرف، ور لغت ہای نغز'' کا مختصر سا نمونہ ہیں۔

پنج آہنگ کے خاتمے میں غالب کہتے ہیں کہ پچاس سال تک ''نے بے برگ'' کو بہ ہنجار او رامہ سرایان پارسی بہ نوا داشتہ ام، اکنوں آن روش فرو گذاشتہ ام۔ سپس مافی الضمیر را کہ بہ یاران دور و نزدیک عرضہ باید داد، در زبان اردوی و آن ہم سرسری و از تکلف بری رقم خواہم کرد تا زندگی آسان گردد۔'' اور غالب کی یہ تقسیم اردو کو ان کے وہ خطوط دے گئی جن کے سامنے ان کے فارسی مکتوبات بے رونق ہو گئے! اردو کی قسمت۔

مولانا امتیاز علی عرشی

ادبی و تحقیقی کارنامے

مرتب: پروفیسر نذیر احمد

مولانا امتیاز علی عرشی، بعض اعتبار سے ہندوستان کے اکثر محققوں میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں، اُن کی تمام تر شہرت اُردو محقق اور ماہرِ غالبیات کی حیثیت سے ہے۔ اس کتاب میں اُردو اور فارسی کے مشہور محققوں اور نقادوں نے عرشی صاحب کی شخصیت اور کارناموں پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی ہے۔

خوب صورت طباعت، عمدہ گٹ اپ۔

صفحات : ۲۸۰

قیمت : ۶۰ روپے

ع۔و۔اظہر دہلوی

مرزا غالب کی مکتوب نگاری

اردو و فارسی۔ایک موازنہ، ایک مطالعہ

مرزا غالب کا فارسی نظم ونثر کا حصہ اردو کے مقابلہ میں کئی گنا زیادہ ہے ،ہندوستان کے فارسی دانوں میں ان کے مقام و درجہ کا تعین جتنا آسان اور سادہ معلوم ہوتا ہے اس کا جواب بہت مشکل اور پیچیدہ ہے۔فارسی پر ان کا دعویٰ اور عجم سے اپنے تعلق پر اصرار نے ان کے مطالعہ کرنے والوں کو بہت ہی تنگ اور پیچیدہ راستوں پر ڈال دیا ہے۔وہ رسم ورواج کے قایل، روایت پرست لیکن اسکے بھی مدعی کہ پرانے طریقوں کو چھوڑ دیا جائے اور نئی طرز کو اپنایا جائے۔

فرسودہ رسمہائے عزیزان فرو گذار
در سور نوحہ خوان و بیزم عزا برقص

غالب شخصیت اور شاعری دونوں اعتبار سے عجمی ہیں۔وہ اس سلسلہ میں زیادہ اعتراف فارسی اشعار میں کرتے ہیں:

بود عند لیپے از گلستان عجم
من ز غفلت طوطی ہندوستان نامیدمش

غالب ز ہند نیست نوای کہ می کشم
گوئی ز اصفہان و ہرات و قمیم ما

رموز دیں نشناسم درست و معذورم
نہاد من عجمی و طریق من عربیست

دلم معبود زردشتست غالب فاش میگویم
بہ خس یعنی قلم من دادہ ام آذر فشانی را

فارسی اور اردو خطوط کے موازنہ سے قبل اگر اشارہ ان کے فارسی و اردو کلام کے موازنہ اور مقابلہ سے ہو تو ہم ان کے خطوط سے بہتر نتائج نکال سکتے ہیں۔

غالب ذولسانین شاعر ہیں تو طبعی بات ہے کہ ان کے کلام میں توارد بلکہ تکرار کی کافی مثالیں مل جاتی ہیں۔ اس تکرار میں کہیں تو اردو اور فارسی کے اشعار میں مماثلت ہے۔ کہیں ایک مصرع دونوں زبانوں میں ایک ہی خیال کو ادا کر رہا ہے اور کہیں خیال میں تھوڑی سی تبدیلی ہوگئی ہے یا انداز بیان جدا ہے یا اس زبان کے تقاضہ کے تحت مصرع بہت بلند ہوگیا ہے۔

فارسی کا شعر ہے:

مکن ناز و ادا چندیں، دلی بستاں و جانی ہم
دماغ نازک من برنمی تابد تقاضا را

اب اس خیال کو اردو میں دیکھیے:

دل اس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے
ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا

کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ فارسی یا اردو میں ایک ہی مضمون کے اشعار دو یا زیادہ مل جاتے ہیں:

کعبہ میں جارہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں
بھولا ہوں حق صحبت اہل کنشت کو

اور فارسی میں دو مختلف جگہ پر اس خیال کو یوں پیش کیا ہے:

زمن حذر نکنی گر لباس دیں دارم
نہفتہ کافرم و بت در آستیں دارم

بی گناہم پیر دیر از من مرنج
من بہ مستی بستہ ام احرار را

اردو میں مرزا کا مشہور شعر:

میں نے چاہا تھا کہ اندوہ وفا سے چھوٹوں
وہ ستم گر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

اور فارسی میں یہی خیال بعینہ یوں بیان کیا ہے:

گفتم البتہ زمن شاد بہ مردن گردی
گفت دشوار کہ مردن بتو آساں شدہ است

یا اردو میں یہ دو شعر:

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

اور فارسی میں یہی خیال یوں بیان کیا ہے:

اندراں روز کہ پرسش رود از ہر چہ گذشت
کاش باما سخن از حسرت مانیز کنند

غالب کا یہ اردو شعر فارسی کے بالکل مماثل ہے:

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے

خود را ہمی بہ نقش طرازی علم کنم
تا با تو خوش نشینم و نظارہ ہم کنم

غالب کا فارسی کلام ندرت بیان اور مضمون آفرینی کی وجہ سے ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس کو جو مقام اور درجہ اس زمانے کے فارسی شعرا میں ملنا چاہیے تھا بد قسمتی سے وہ ایران، افغانستان اور تاجیکستان میں پورے طور پر متعارف نہ ہونے کی وجہ سے نہیں ملا۔ اس میں اگرچہ غالب کے پرستاروں کی بھی کوتاہی ہے لیکن دوسری جانب تعصب اور تنگ دلی کا بھی خاصا حصہ رہا ہے۔

خطوط نگاری کے آئین واصول مرتب کرنے والے غالب صرف اردو میں ہی اس پر عمل کر سکے۔ فارسی زبان وادب کی ہزار سالہ روایت کے دائرہ کو توڑنا شاید ان کے بس کی بات نہیں تھی اور وہ بھی اس خواہش کے ساتھ کے خود ان کا شمار امیر خسرو کے بعد ہندوستان کے فارسی شاعر و ادیب اور عالم کی حیثیت سے کیا جائے۔ ملا عبدالصمد کا خارجی وجود ایک اختلافی مسئلہ ہے لیکن میرزا کے یہ خیالی استاد ان کو فارسی کے محاورے اور رائج زبان سے کتنا آگاہ کر گئے کم از کم اس کی کوئی جھلک میرزا کی تحریروں میں تو نہیں ملتی۔ وہ سادگی، سلاست، بے ساختہ پن اور سماجی زندگی کی عکاسی جو ان کے اردو خطوط سے ہوتی ہے، فارسی خطوط اس سے عاری ہیں۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے تو ان کے خطوط کو فنون لطیفہ کا جزو قرار دیا ہے۔ وہ فرماتے

ہیں ''خطوط نویسی کو میں فنون لطیفہ میں جگہ دیتا ہوں لیکن اردو میں اس کی مثال صرف غالب کے خطوط میں ملتی ہے۔ حسن و ہنر کا جو اظہار و ابلاغ مختلف فنون لطیفہ سے علیحدہ علیحدہ ہوتا ہے، گفتگو کرنے میں ان سب سے بطریق احسن کام لینا پڑتا ہے۔ اچھی گفتگو کرنے والے کی گفتگو میں نقش، رنگ، رقص، آہنگ اور شخصیت کی بیک وقت جلوہ گری ملتی ہے۔ شخص کی عدم موجودگی میں یہی کرشمہ اس کے خطوط میں نظر آئے گا۔ غالب نے جو کہا ہے کہ میں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے، اسی رمز کی وضاحت ہے۔ ان امور کے پیش نظر غالب کے خطوط کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ تصنیف اور مصنف میں کتنی ہم آہنگی ہے''[۱]۔

اس سے قبل ایک اور جگہ انہوں نے غالب کے خطوط کے حوالے سے بہت ہی دلچسپ بات کہی ہے۔ وہ فرماتے ہیں ''ہندوستان میں اردو جیسی کثیر الاسالیب اور کثیر الاصناف زبان شاید کوئی دوسری نہ ہو۔ اس میں رقعات غالب کو اردو نثر کے بنیادی اسالیب میں سے ایک نمونہ قرار دینا غلط نہ ہوگا۔ خطوط کو نہ پکا گانا ہونا چاہیے، نہ فلمی، نہ قوالی۔ خط لکھنا دراصل اتنا خطبۂ صدارت تصنیف کرنے کا فن نہیں ہے جتنا گفتگو کرنے کا سلیقہ ہے اور گفتگو کرنا گفتگو ہی کرنے کا نہیں، خاموش رہنے کا بھی فن ہے۔ اس اعتبار سے بڑا سخت گیر فن ہے۔ خاموش رہنا صفات الٰھیہ میں سے ہے۔ اپنے بے پایاں اور بے کراں اختیارات میں تنہا بیٹھنا خدا ہی کے بس کی بات ہے''[۲]۔

غالب کے اردو خطوط ہمارے لیے اس عہد کی سماجی زندگی کا مطالعہ کرنے کا بہت اہم ذخیرہ ہیں۔ آپ ان کے خطوط کو گھر کا بھیدی بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ ان کی زندگی کے وہ گوشے جو شعر کے پردوں میں چھپ جاتے ہیں وہ ان کے خطوط میں عیاں ہیں۔ دلّی کا آنکھوں دیکھا حال بالکل ایسا لگتا ہے کہ ایک ویڈیو فلم ہمارے

آنکھوں کے سامنے چل رہی ہے اور تبصرہ میرزا کی زبان میں ہے۔ غدر کے مظالم۔ دلی کی تباہی۔ امرا کی بدحالی، بدنظمی، طوائف الملوکی، انگریزوں کی ہندوستانیوں کے ساتھ زیادتیاں۔ مظالم اور جدید طرز زندگی کی آمد، ایک خط میں میر فراز حسین کو لکھتے ہیں:

"کتابیں کہاں سے چھپواتا۔ روٹی کھانے کو نہیں، شراب پینے کو نہیں، جاڑے آتے ہیں، لحاف توشک کی فکر ہے۔ کتابیں کیا چھپواؤنگا میاں! میں بڑی مصیبت میں ہوں۔ محلسرا کی دیواریں گر گئی ہیں۔ پاخانہ ڈھے گیا ہے، چھتیں ٹپک رہی ہیں۔ دیوان خانہ کا حال محلسرا سے بدتر ہے... ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے اگر تم سے ہو سکے تو مجھ کو وہ حویلی جس میں میر حسن رہتے ہیں میرے رہنے کو دلوادو، برسات گذر جائے گی۔ مرمت ہو جائے گی پھر صاحب اور میم اور بابا لوگ اپنے قدیم مسکن میں آرہیں گے"[۲۲]

اس میں مردانہ کے لیے دیوان خانہ، زنانہ کے لے محلسرا، اپنے لیے صاحب، بیگم کے لیے میم اور بچوں کے لیے بابالوگ، بہت ہی دلچسپ ہے۔

ایک اور خط میں میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں:

'بھائی کیا پوچھتے ہو، کیا لکھوں، دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع جامع مسجد کا، ہر ہفتہ سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا، یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو دلی کہاں۔

ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔ اہل اسلام میں
صرف تین آدمی باقی ہیں۔ میرٹھ میں مصطفیٰ خاں،
سلطان جی میں مولوی صدرالدین خاں، بلی ماروں میں
سگ دنیا موسوم بہ اسد تینوں مردود و مطرود و محروم و
مغموم... تم آتے ہو چلے آؤ۔ جاں نثار خاں کے چھتے
کنے خانچند کے کوچے کی سڑک دیکھ جاؤ۔ بلاقی بیگم کے
کوچے کا ڈھینا، جامع مسجد کے گرد ستر ستر گز میدان کا
نکلنا سن جاؤ۔"

۷/دسمبر ۱۸۵۸ء کو میرزا تفتہ کو لکھتے ہیں:

"مبالغہ نہ جاننا۔ امیر غریب سب نکل گئے۔ جو رہ گئے
تھے وہ نکالے گئے۔ جاگیردار، پنشن دار، دولتمند، اہل
حرفہ کوئی بھی نہیں۔ مفصل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔
ملازمان قلعہ پر شدت ہے اور باز پرس اور دار و گیر میں
مبتلا ہیں"

غالب کے اردو خطوط اس حیثیت سے بھی بہت ہی اہم مواد سماجی تاریخ کے مطالعے کے لیے فراہم کرتے ہیں۔ یہ درجہ و مقام کسی دوسرے مکتوب نگار کو حاصل نہیں ہوا۔ اس عہد کی تاریخ میں وہ کڑیاں جو سیاسی اور اقتصادی زندگی کے مطالعے میں گم ہیں اس میں یہ خطوط اہم، وقیع اور معتبر مواد فراہم کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں جب غالب کے فارسی خطوط پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ کچھ زیادہ مدد نہیں کرتے۔ اصل میں ان میں غالب کی توجہ زیادہ زبان و بیان پر رہی اور وہ اس بے ساختہ پن سے محروم ہیں۔ بس اتنا ضرور ہے کہ غدر سے پہلے جو میرزا کے احباب سے مکاتبت ہوئی ان

کے بارے میں ضرور کچھ معلومات ہو جاتی ہے۔ ایک تو پنج آہنگ میرزا نے میرزا علی بخش خان کی فرمائش پر ترتیب دینی شروع کی۔ ایک طرح سے ان کے ذہن میں یا ان کے سامنے جو نمونے تھے وہ عام انشاء کی کتابوں کے تھے۔ اول اور پانچویں آہنگ کو سامنے رکھا جائے تو غالب نے اپنے بتائے ہوئے اصولوں کی پیروی نہیں کی اور اسی وجہ سے شیخ محمد اکرام نے غالب کے خطوط پر نقد و تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے فارسی خطوط ان کے اردو خطوط کے مرتبے کو نہیں پہنچتے۔ ان میں وہ شگفتگی اور بے تکلفی نہیں ہے جو اردو خطوط میں ہے اور جو شوخی اور ظرافت بعد کے خطوط کا طرۂ امتیاز ہے، ان خطوط میں سراسر مفقود ہے[۵]۔

ایک یا دو نمونے اگر فارسی خطوں کے بھی دیے جائیں تو فیصلہ کرنے میں اور نتیجہ پر پہنچنے میں دیر نہیں لگے گی:

''حضرت سلامت، می دانند کہ غالب صافی مشرب را چون دیگران دل بہ ساختگی آشنا و زبانی بہ تکلف زمزمہ سرا نیست۔ زبانش را دلی دادہ اند کہ از آزادگی فرجام آرایش گفتار ندارد، دلش را زبانی بخشیدہ اند کہ از سادگی تاب رنگ آمیزی افسانہ و افسون نیارد۔ واگرنہ این چنین بودی من دانم و دل کہ در این چشم روشنی کہ پیش آوردۂ دولت و ساز کردہ اقبال است، از اقسام سخن چہ ہا بہ کار رفتی''۔

تقریباً ایک صفحے کی تمہید کے بعد آخر میں منشی احمد حسن کی شادی کے موقعہ پر منشی محمد حسن کو بھیجے گئے خط میں اصل مطلب اس طرح بیان کیا گیا ہے:

''یارب این کتخدایی از سازگاری بہ جاودانہ

کامرانی ارزانی باد و نوید شادمانیہای تازہ و فیروزیہای بی اندازہ رساناد۔

ایک اور خط جو میرزا علی بخش خان بہادر کو لکھا گیا ہے:

کار برادر بہ برادر نکوست
بہ ز برادر نتوان یافت دوست

ہر چند شیوۂ من نیست در گفتن اندوہ درازنفسی کردن، وشنوندہ را دل بہ درد آوردن، لیکن چون شما ہم برادرید و ہم دوست، ناچار بہ شما می گویم۔

خدارا، طرح آن افگنید کہ میر امام علی زود برگردند و بہ من بہ پیوندند تا دوستان ناصح را خیر باد گویم بہ سروبرگی کہ ندارم بہ شرق پویم والسلام۔

غالب نے اپنی شخصیت کے اردگرد ایک ایسا ہالہ بنالیا ہے کہ ان کو سمجھنے میں پوری کامیابی کسی کو بھی حاصل نہیں ہوئی ہے۔ان کے مطالعے میں فارسی سے ان کا گہرا تعلق اور اس کلچر سے ان کی عقیدت اور تعلق خاطر، جب تک ایک ایسی بھرپور مشترکہ کوشش نہیں کی جائے گی اس وقت محققین دبیز پردے پلٹتے رہیں گے اور غالب شناسوں، ان کے مداحوں اور چاہنے والوں کا حلقہ بڑھتا جائے گا۔

ای کاش! غالب اپنے اردو خطوط کی تکرار یا تو اردفارسی میں بھی کرتے تو وہ یقیناً قائم مقام فراہانی اور امیر کبیر سے پہلے ہی فارسی نثر میں جدیدیت کے علمبردار ہوتے اور انیسویں صدی میں جدید فارسی کے آغاز اور کوشش کا سہرا بھی انہی کے سر باندھا جاتا۔

میں اپنی بات کو علی اصغر حکمت کی اس رباعی پر ختم کرتا ہوں جو انہوں نے غالب کے مزار پر بیٹھ کر کہی تھی:

غالب کہ شہاب شعر او ثاقب شد
استاد ہزار صائب و طالب شد
بر ملک سخن چون اسد اللہی یافت
بر جملہ شاعران از آن غالب شد

حوالہ:

۱۔ نظام اردو خطبات، از پروفیسر رشید احمد صدیقی، دہلی یونیورسٹی، دہلی۔ ۱۹۶۹، ص ۲۴
۲۔ ایضاً، ص ۲۴
۳۔ غالب اردوے معلی
۴۔ غالب۔ اردوے معلی
۵۔ غالب نامہ، شیخ محمد اکرام، ص ۵۴

علی احمد فاطمی

سر سیّد کے خطوط۔ایک عمومی جائزہ

خط لکھنا عموماً ایک ذاتی عمل ہوتا ہے جس میں انفرادی، باطنی اور بے تکلف مزاجی کام کرتی دکھائی دیتی ہے اسی لیے ادبی اعتبار سے ہمارے لیے وہ خطوط زیادہ کام کے ہوتے ہیں جو بے تکلف دوستوں کو تخلیقی انداز میں لکھے گئے ہوتے ہیں۔ غالب کے خطوط کی کامیابی کا بڑا راز اگرچہ ان کا مخصوص اسلوب تو ہے ہی لیکن اس کامیاب اسلوب کے پیچھے دوستوں، عزیزوں سے بے تکلف اور پیار بھرے رشتے بہر حال کام کرتے رہے ہیں جن میں مکتوب نگار واشگاف انداز میں اپنے دل و دماغ، دکھ سکھ اور ظاہر و باطن کی باتیں لکھتا ہے اور افکار و خیالات، مکالمات و اسلوبیات کی ایک فطری اور بے تکلف دنیا آباد کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ خط نویسی کے اس تصور کے پیش نظر وہ خطوط ہمارے کام کے اتنے نہیں ہوتے جو سرکاری، دفتری یا روکھے پھیکے نوعیت کے ہوتے ہیں۔ اردو خط نویسی کے تعلق سے سب سے پہلے اور شاید سب سے آخر بھی تنہا غالب کا نام آکر رہ جاتا ہے اس لیے ادبی نقطۂ نظر سے خط نویسی کے جو بھی

بُرے معیار بنے ان میں غالب کے خطوط ہی غالب رہے۔ ایسا ہر بڑے فنکار کے ساتھ ہوا کرتا ہے اس کی ہر چیز بڑی ہوتی ہے اور اکثر سمجھ بھی لی جاتی ہے۔

انیسویں صدی میں غالب کے بعد دوسری بڑی شخصیت سر سیّد کی ہے. جن کے خطوط کے کئی مجموعے شائع ہوئے ہیں لیکن ان میں زیادہ تر خطوط کلکٹر، پرنسپل، رجسٹرار، سکریٹری، ایڈیٹر یا سرکاری و نیم سرکاری اداروں وافسروں کو لکھے گئے ہیں ظاہر ہے ان میں وہ کیفیت، دلچسپی او راثر آفرینی ممکن نہیں جو غالب کے خطوط میں ہے۔ پھر 'غالب' غالب ہیں اور سر سیّد۔ سر سیّد۔ ایک شاعر دوسرا ادیب، ایک بے باک اور لا اُبالی دوسرا محتاط اور ڈپلومیٹ، ایک فنکار، دوسرا معمار اور بھی بہت کچھ بدلا بدلا سا اس لیے فرق تو ہونا ہی چاہیے لیکن اس فرق اور ایسے خطوط کو ہم کسی طرح نظر انداز نہیں کرسکتے، اس لیے کہ یہ ایک بڑے معمار قوم اور تحریک کے بانی کے خطوط ہیں بقول خلیل الرحمٰن اعظمی:

> ''سر سیّد کے خطوط کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جن کی حیثیت ذاتی خطوط کی نہیں بلکہ وہ علی گڑھ تحریک اور اس زمانہ کے دیگر قومی و تمدّنی مسائل سے متعلق ہیں۔ سر سیّد چونکہ ایک ادیب اور انشا پرداز ہی نہیں بلکہ ایک تحریک کے بانی اور معمار بھی تھے، اس لیے ان کے غیر ذاتی خطوں کی دستاویزی اہمیت زیادہ ہے۔''

میرے سامنے مکاتیب سر سید احمد خاں کا جو نسخہ ہے وہ بظاہر ان کے خطوں کا چوتھا مجموعہ ہے۔ پہلا مجموعہ وحید الدین سلیم نے شائع کیا تھا جس میں صرف پچپن خطوط تھے۔ دوسرا مجموعہ راس مسعود نے ترتیب دیا جس میں انہوں نے سلیم کے مجموعے کے تمام خطوط شامل کر لیے۔ یہ مجموعہ نظامی پریس بدایوں سے ۱۹۲۴ء میں

شائع ہوا تھا۔ تیسرا مجموعہ شیخ اسماعیل پانی پتی نے لاہور سے ۱۹۵۹ء میں شائع کیا۔
زیر نظر مجموعہ مشتاق حسین نے ترتیب دیا جو ۱۹۶۰ء میں دہلی سے شائع ہوا۔
اس مجموعہ کی نوعیت کے بارے میں مرتب رقمطراز ہیں:

''میں نے پیش نظر مجموعہ کو دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصّہ میں وہ خطوط شامل کیے ہیں جو اول الذکر تینوں مجموعوں میں نہیں ہیں اور دوسرے حصّہ میں مشترک خطوط ہیں جو شیخ صاحب موصوف کے مجموعے میں ہیں۔''

مزید لکھتے ہیں:

''پیش نظر مجموعہ کے تمام خطوط مطبوعہ ہیں جو مختلف اخبارات، رسائل اور کمیاب و نایاب کتابوں سے فراہم کیے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی انفرادیت، اہمیت اور افادیت کا فیصلہ ناظرین کریں گے لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا کہ کچھ نئی باتیں اس سے ضرور معلوم ہوں گی۔''

مرتب نے نئی باتوں کے حوالے سے مذہبی تعلیم، فراہمیِ چندہ، سائنٹفک سوسائٹی کی مالی دقتیں، مذہبی چھیڑ چھاڑ، مسلم اوقاف وغیرہ کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ سرسیّد کے علمی موضوعات و معاملات کا ذکر کم سے کم کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان خطوط کی ادبی حیثیت پر کم از کم گفتگو کی گئی ہے۔ ظاہر ہے سرسیّد کی حیثیت بھی ایک عملی انسان، قوم کے معمار، تحریک کے بانی کی زیادہ ہے اس لیے تمام مرتبین کی ان امور پر نظر زیادہ رہی ہے۔ سرسیّد ایک بڑے ادیب اور انشا پرداز بھی تھے لیکن ان خطوں میں اس حیثیت کی تلاش جتنی مشکل ہے ایک باعمل مفکر اور دانشور کی اتنی ہی آسان بھی۔

اس لیے ان خطوں کو اسی تناظر میں لینا چاہیے۔ ان کے مشن، مقصد، کوشش اور عمل کو ذہن میں رکھے بغیر ان خطوں کی تفہیم و تعبیر مشکل ہے اور بے سود بھی البتہ انہیں حوالوں سے ہی دوسرے حوالے یا شاخیں پھوٹتی ہیں۔

اس مجموعہ کا پہلا ہی خط جو اگست ۱۸۵۷ء کا لکھا ہوا ہے اور جو نواب محمد محمود خاں کے نام ہے جو نجیب الدولہ کے پوتے تھے۔ اس خط میں بجنور کے منتشر حالات پر روشنی پڑتی ہے کہ ایک طرف سرسید اینڈ کمپنی شر و فساد بچانے کے لیے عوام کو یقین دہانی کے بعد منتشر کرتے ہیں تو دوسری طرف صاحبانِ اقتدار کو بھی لکھتے ہیں کہ سنا ہے کہ آپ کا ارادہ بجنور، تاجپور اور ہلدو پر یورش کا ہے اور آپ فوج و جمعیت جمع کرتے ہیں اور تیاری توپوں میں مصروف ہیں اور پھر جرأت کے ساتھ یہ بھی لکھتے ہیں کہ دیہات اور قرب و جوار نجیب آباد آپ نے پھونک دیے تو انجام کو خرابی ہوگی اور آگے لکھتے ہیں۔ پورینی میں جمعیت جمع ہونے کا سبب یہ بیان کرتے ہیں کہ تھو خان اور مینڈو خاں ملازمان آپ نگینہ میں مفسدہ کرتے ہیں اور ایک توپ کلاں واسطے لے جانے نجیب آباد تیار کرواتے ہیں۔ سرسید کے اس پورے خط میں نجیب آباد نگینہ یعنی بجنور کے ان علاقوں میں جو حالات اور فسادات برپا تھے ان کی فرسٹ ہینڈ اطلاعات اس خط سے ملتی ہے اور اس بات کا بھی صاف اندازہ ہوتا ہے کہ لڑائی محض انگریز اور ہندوستانیوں کے درمیان نہ تھی بلکہ نوابین، امرا، رؤسا اور عام آدمیوں کے درمیان بھی تھی کہ یہ بڑا طبقہ ہمیشہ کی طرح اربابِ اقتدار کا ساتھ دے رہا تھا۔ پورے خط میں طرفین کو رضامند کرنے اور امن و امان قائم کرنے کی انتھک کوشش کے اشارے ملتے ہیں حالانکہ بعض حادثات میں خود سرسید بھی شکار ہوئے، بجنور سے پا پیادہ نکلے اور بہ ہزار دقت و خرابی میرٹھ پہونچے۔ کچھ دنوں کے بعد جب حالات نسبتاً قابو میں آئے تو پھر واپس بجنور آئے اور حالات کا جائزہ لیا اور مزید امن و امان قائم کرنے کی جو

کوششیں کیں یہ خط اس کی مثال ہے جو سرکشیٔ بجنور کی تاریخی دستاویز بن کر ہمارے سامنے آتا ہے۔

۱۵/اکتوبر ۱۸۶۹ء میں لکھے ہوئے طویل خط کا ذکر بہت ضروری ہے۔ یہ خط انہوں نے اپنے لندن کے قیام کے دوران سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ راجہ جے کشن داس کو لکھا ہے۔ جس میں سفر کے حالات اور لندن کی معاشرتی زندگی کی چمک دمک اور نفاست سے اس قدر متاثر ہوئے ہیں کہ یہاں تک لکھ بیٹھتے ہیں:

''ان سب باتوں کا جو نتیجہ حاصل ہو وہ یہ ہوا کہ ہم جو ہندوستان میں انگریزوں کو بداخلاقی کا ملزم ٹھہرا کر یہ کہتے تھے کہ انگریز ہندوستانیوں کو بالکل جانور سمجھتے ہیں اور نہایت حقیر جانتے ہیں، یہ ہماری غلطی تھی بلکہ درحقیقت ہم ایسے ہی ہیں، میں بلا مبالغہ نہایت سچے دل سے کہتا ہوں کہ تمام ہندوستانیوں کو اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک، امیر سے لے کر غریب تک، سوداگر سے لے کر اہلِ حرفہ تک، عالم فاضل سے لے کر جاہل تک انگریزوں کی تعلیم و تربیت اور شائستگی کے مقابلے میں درحقیقت ایسی ہی نسبت ہے جیسی نہایت لائق اور خوبصورت آدمی کے سامنے نہایت میلے کچیلے وحشی جانور کو۔ پس تم کسی جانور کو قابلِ تعظیم یا لائقِ ادب خیال کرتے ہو، ہرگز نہیں کرتے۔ پس ہمارا کچھ حق نہیں ہے کہ انگریز ہم ہندوستانیوں کو ہندوستان میں کیوں نہ وحشی جانور کی طرح سمجھیں۔''

اسی خط میں اور آگے وہ لکھتے ہیں:

''میں ان باتوں پر مطلق خیال نہیں کرتا جو بسبب خاصیت ملک کے ایک دوسرے میں مختلف ہیں بلکہ میں صرف اخلاقی اور تعلیمی اوصاف انسانی اور صفائی اور خوش سلیقگی اور ہنر و کمال کا ذکر کرتا ہوں جو تعلیم و تربیت سے علاقہ رکھتی ہے۔ اگر ہندوستان کے لوگ بھی تعلیم و تربیت پا جاویں تو ہندوستان بسبب اپنی بعض قدرتی اوصاف کے انگلستان سے زیادہ نہیں تو یقینی طور پر قریب قریب گلزار ہو جاوے۔''

آگے اور لکھتے ہیں:

''جو لوگ حقیقت میں ہندوستان کی بھلائی اور ترقی چاہتے ہیں وہ یقینی جان لیں کہ ہندوستان کی بھلائی صرف اسی پر منحصر ہے کہ تمام علوم اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک انہی کی زبان میں ان کو دیے جائیں۔ میری رائے ہندوستان کے ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی پر بڑے بڑے حرفوں میں آیندہ زمانہ کی یادگاری کے لیے کھود دیے جائیں۔ اگر تمام علوم ہندوستان کو اسی کی زبان میں نہ دیے جاویں گے کبھی ہندوستان کو شائستگی و تربیت کا درجہ نصیب نہیں ہونے کا۔ یہی سچ ہے۔ یہی سچ ہے۔ یہی سچ ہے۔''

اس خط میں کچھ سوالات بھی اٹھائے گئے ہیں:

کیا یہ تعجب خیز بات نہیں ہے کہ مغرب میں ایک عورت
حالتِ بیماری میں کتاب پڑھنے سے دل بہلاوے۔
آپ نے ہندوستان میں کسی امیر، کسی نواب، کسی راجہ،
کسی مرد اشراف کو ایسی خصلت میں دیکھا ہے؟

اس طویل خط کے بعض پہلوؤں سے، انگریزی تہذیب کے تئیں ان کی خوش خیالی اور ہندوستانی جہالت اور غیر مہذبانہ رویّوں کی بعض صداقتوں کو اور سرسیّد کی بیزاری کو لے کر اختلاف کیا جاسکتا ہے اور اختلاف کیا ناراضگی اور دشمنی تک ہوئی لیکن اس تلخ حقیقت پر پردہ نہیں ڈالا جاسکتا کہ مشرق و مغرب کے مابین تہذیبی و تعلیمی تفریق کیا تھی اور ہنوز کیا ہے؟ ان تحریروں سے سرسید کی دردمندی تو جھلکتی ہے ان کی صاف گوئی اور بے باکی بھی عیاں ہوتی ہے۔ خط کی ابتدا میں ہی وہ لکھتے ہیں:

''آپ کی سوسائٹی کے بعض ممبر میری آزادانہ تحریر کو
ناپسند کرتے ہیں اور ناراض ہوتے ہیں۔ مجھ سے یہ
تو نہیں ہوسکتا کہ جو کیفیت اس سفر میں میرے دل پر
گزرتی ہے اور سچائی میرے دل میں آتی ہے اس
سوسائٹی کے ممبروں کے ڈر سے چھپاؤں اور جس گناہ کا
الزام میں اپنے ہم وطن ہندوستانیوں پر دیتا ہوں خود
بھی اسی گناہ کا مرتکب ہوں۔''

خط کے آخر میں لکھتے ہیں:

''حضور نواب لفٹنٹ گورنر بہادر نے سوسائٹی کی بڑی
دست گیری کی ہے۔ اعانت اور پرورش فرمائی ہے۔
نہایت خوشی ہوئی مگر مائی ڈیر راجہ اپنی سوسائٹی اور اخبار

کی آزادی کو ہرگز ہاتھ سے مت جانے دینا۔ سررشتۂ
تعلیم کی بھلائی اور برائی پر تمام ہندوستان کی زندگی اور
موت منحصر ہے۔ ہمیشہ نہایت غور کی مگر منصفانہ نگاہ سے
اس کو دیکھتے رہنا۔ صرف سچائی اور عام بھلائی کو اپنا
دوست جاننا۔"

ان ابتدائی اور انتہائی تحریروں سے سرسید کے خیال کی جرأت مندی، پاکیزگی اور آزادی صاف جھلکتی ہے اور علم کے تئیں ان کی سنجیدگی کا سچا اظہار ہوتا ہے۔ وہ منصفانہ طور پر مشرق و مغرب دونوں کی اچھائیوں اور برائیوں پر روشنی ڈالتے ہیں لیکن ان کی زیریں لہروں میں ہندوستانیوں کے تئیں ہمدردی اور ترقی ہی نظر آتی ہے۔

راجہ جے کشن داس کے نام دوسرا خط جو ۱۸۷۲ء میں بنارس سے لکھا گیا ہے۔ اس میں صحافت کی ذمہ داریوں کے بارے میں عمدہ اور اہم باتیں ملتی ہیں۔ صحافت کی آزادی و نیز ذمہ داری۔ خیال کی آزادی اور غیر ضروری بحث و مباحثہ سے گریز کرنے کی ہدایت کرتے ہوئے وہ سکریٹری سے کہتے ہیں۔ "ایڈیٹر صاحب کو بالکل آزادی ہے کہ جو مضمون اور رائے اور خیال چاہیں بے تکلف لکھیں جب دوسرے اخبار والے اس سے اختلاف کریں یا ان کے مطلب اور خوبی تحریر کو سمجھنے میں لوگ غلطی کریں تو اصول مذکورہ بالا کے لحاظ سے کسی خاص شخص یا خاص اخبار سے مباحثہ نہ کریں۔"

اسی طرح سکریٹری کے نام تیسرے خط میں سائنٹفک سوسائٹی کی ذمہ داریوں سے متعلق بڑی کارآمد باتیں لکھی ہیں:

"آپ کو معلوم ہے کہ یہ سوسائٹی اسی مقصد سے قائم
ہوئی تھی کہ انگریزی کتابوں کے اردو کتابوں میں ترجمہ

کر کے چھاپے اور اس کے اخراجات کے لیے ممبروں
سے چندہ لے اور بعض اس کے جو کتابیں چھاپے
بلا قیمت ان کو دے۔ چند سال تک یوں ہی کام چلا لیکن
جو علمی کتابوں کے ترجموں سے ممبروں کو دلبستگی نہ تھی اور
جو زمانہ کہ کتابوں کے ترجمے اور چھاپنے میں صرف
ہوتا تھا وہ زمانہ ممبروں کے لیے نہایت پھیکا۔ بدمزہ اور
سنسان ہوتا تھا اس لیے ممبروں کی دلبستگی کے لیے
اخبار جاری ہوا وہ اخبار بھی بلا قیمت ان کو ملنے لگا''۔

ان تحریروں سے یہ اندازہ ہوتا ہی ہے کہ سوسائٹی کے ممبران کی اصل دلچسپی و وابستگی کس نوعیت کی تھی اور یہ بھی سچ تھا کہ سرسید کی بنائی ہوئی سوسائٹی میں اشرافیہ، جاگیردار اور زمیندار طبقہ کے لوگ زیادہ تھے اور ان میں سے بیشتر کی دلچسپی علمی کتابوں میں کم اخبار اور اخبار بازی میں زیادہ تھی چنانچہ سرسید نے اخبار کیوں نکالا، اس کا جواب اور جواز بھی ان تحریروں میں ملتا ہے۔

سرسید قوم کی نبض پہچانتے تھے وہ ان کی جہالت سے تو واقف تھے ہی اشرافیہ طبقہ کی کمزوریوں سے بھی واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ لندن سے لکھے ہوئے خطوط میں وہاں کی عورتوں کی تعلیم سے متاثر ہونے کا صاف اندازہ ہوتا ہے۔ عورتوں کی تعلیم کے بارے میں علی گڑھ کے گزٹ کے ایڈیٹر کو ایک مضمون کی تعریف کرتے ہیں اور یہ بھی لکھتے ہیں:

''ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو کون منع
کرتا ہے کہ خود بلا مداخلت لڑکیوں کے پڑھانے کا
انتظام کریں اور تمام مذہبی اخلاق اپنے اپنے مذہب

کے موافق تعلیم دیں کیا ہندوستان ایسا نہیں
کرسکتا۔ صرف شوق ہمت اور ارادہ چاہیے۔"

۱۸ راگست ۱۸۷۱ء کے ایک مختصر سے خط میں وہ لکھتے ہیں:

"میں آپ کی خدمت میں ایک لیڈی صاحبہ کی چٹھی
کا خلاصہ جو عورتوں کی تعلیم سے متعلق ہے، ارسال کر رہا
ہوں از راہِ عنایت اخبار میں درج فرمادیں۔"

ان خطوط سے تعلیم نسواں کی ضرورت پر سرسیّد کی حمایت کا صاف اندازہ ہوتا ہے اور غلط فہمی بھی دور ہوتی ہے کہ سرسیّد عورتوں کی تعلیم کے خلاف تھے لیکن یہ سوال ہنوز برقرار ہے کہ وہ اپنے سامنے اپنے مدرسہ میں عورتوں کی تعلیم کا انتظام کیوں نہ کر سکے، عمرِ آخر یعنی ۱۸۹۶ء میں کسی طرح شعبہ نسوان کھل تو گیا لیکن ان کی زندگی میں کام نہ کر سکا، ان کی موت کے بعد ۱۸۹۹ء کے آس پاس عبداللہ اور ان کی بیگم کی کوششوں سے ہی چل سکا، ایسا کیوں ہوا جبکہ سرسید کے پاس شوق، ہمت اور ارادہ کی کمی نہ تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کے پیچھے جاگیردار طبقہ کی مردانہ رعونت اور نخوت اور اس کے پیچ وخم کام کر رہے تھے اور سرسید اس طبقہ کے تعاون سے صرف مدرسہ ہی نہیں پورا کاروبارِ شوق چلا رہے تھے۔ یہ ان کی مجبوری تھی۔ ۱۸۷۳ء میں خان بہادر برکت علی خاں کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میرا ارداہ ہے کہ لاہور آؤں اگر کوئی صاحب جلسہ جمع
کرنے کا اہتمام کریں اور تمام روساء شہر کو جمع کریں تو
میں وہاں بھی روبرو بزرگانِ لاہور سے کچھ گفتگو کروں
اور چند رئیسوں کو بھی اپنے ساتھ شریک فرمالیویں تو یہ
امر ہونا کچھ مشکل نہیں..."

کچھ لوگ اسے سرسیّد کی کمزوری بھی مانتے ہیں اور انہیں خود جاگیردارانہ تہذیب و معاشرت کا حصّہ قرار دیتے ہیں۔ وہ حصّہ تو ضرور تھے لیکن بعض خطوط میں انہوں نے یہ بھی لکھا کہ جو کچھ آپ میری مہمان داری یا دعوت میں خرچ کرتے وہ ازراہِ عنایت نقد فرمادیں کہ اس سے ہمارے دوسرے کام حل ہو جائیں گے۔ سرسیّد کے سامنے ایک بڑا مشن تھا۔ بڑے کام تھے جن کے لیے بڑی سے بڑی رقم درکار تھی اس لیے نوابوں اور جاگیرداروں سے رسم وراہ رکھنا ان سے مدد حاصل کرنا ان کی مجبوری تھی تنگ نظری نہیں۔

قوم پرستی اور قوم پروری کے انیک روپ ہوتے ہیں اور متعدد فکری زاویے خاص طور پر بُحرانی دور میں ان کے تضادات و تصادمات بھی بڑے فطری ہوتے ہیں جس کا شکار اکثر و بیشتر سرسیّد ہوئے لیکن بعض خطوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ معمولی اور غیر اہم باتوں کو نظر انداز کرنے کے قائل تھے۔ غیر ضروری اور فضول بحث سے گریز کرتے تھے اور اسے وقت اور ذہن کی بربادی تصور کرتے تھے۔ اسی طرح ان خطوں میں اپنے اور اپنی ذات کے بارے میں کم سے کم لکھتے ہیں تاہم بعض خطوں میں ایسی تحریریں مل جاتی ہیں جہاں سرسید اپنی فکر اور کام کے بارے میں لکھنے پر مجبور ہوئے۔ ۱۸۸۹ء میں نواب انتصار جنگ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

> "مجھے یقین ہے کہ جو کام میں نے صرف خالص نیت اور صرف قومی بھلائی کے لیے کیا ہے اس کی نسبت لوگ اور بہت مقدس لوگ کیا کیا کچھ کہتے ہیں۔ کیسے کیسے مقدس لوگ مجھے خود غرض، بددیانت، تعمیراتِ مدرسہ میں غبن اور چوری کرنے والا وغیرہ وغیرہ بیان کرتے ہیں اور مقدس ہاتھوں سے جو پانچ وقت وضو سے

دھوتے ہیں ایک سلسلہ آرٹکلوں، پمفلٹوں کا چھپ

رہا ہے اور مشتہر ہو رہا ہے۔''

اسی طرح ایڈیٹر شمس الاخبار کو ۱۸۸۳ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میری عادت کسی کی تحریر کے جواب دینے کی نہیں ہے۔ البتہ جو لوگ درحقیقت بلاتعصب اور بلانفسیات صرف قومی بھلائی کی غرض سے کچھ کہتے ہیں، ان کا جواب دینے میں اپنی عزت سمجھتا ہوں۔''

سردار محمد حیات خاں کے نام کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میں نے اپنا جان و مال واسطے بھلائی مسلمانوں کے وقف کر دیا ہے۔ میں کسی مخالف کی بدگوئی سے رنجیدہ نہیں ہوتا اور اپنے کام کاج میں دل و جان سے مشغول ہوں''۔

تہذیب نسواں کے مدیر مولوی ممتاز علی کو جنہیں سرسید کافی پسند کرتے تھے، کھل کر ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میری یہ آرزو ہے کہ ہماری قوم لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر یقین رکھے اور ترقی پاوے، اگر یہ یقین جاتا رہا تو وہ ہماری قوم نہیں رہی۔ پھر اگر وہ آسمان کے تارے ہو جاویں تو ہم کو کیا۔ ایک محض حماقت کی سمجھ ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ میں کوئی علیحدہ فرقہ قائم کرتا ہوں۔ یہ تو میرے مقصد کے خلاف ہے جو فرقے اسلام سے باہر جانا چاہتے ہیں ان کو ملا رکھنا

چاہتا ہوں۔"

سر سید کے خلاف صدہا خطوط مختلف اخبار ور سائل میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ ذاتی طور پر سرسیّد کو بھی لکھے جاتے تھے جن میں سے اکثر کا وہ جواب ہی نہ دیتے لیکن جب کوئی خاص دوست اعتراض کرتا تو ضرور جواب دیتے۔ بدایوں کے مولوی علی بخش شؔرر سر سید کے دوستوں میں تھے لیکن ان کے علم وعمل کے مخالف بھی۔ ۱۸۷۴ء کے ایک خط میں سرسیّد اپنے دوست کو لکھتے ہیں:

"اگر میرے عقائد جیسا کہ آپ خیال فرماتے ہیں، کفر وضلالت ہیں تو قومی محبت اور ہمدردی کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اپنے اوقاتِ خاص میں میرے حق میں دُعا فرمادیں کہ خداتعالیٰ مجھ کو گمراہی سے نکالے اور راہِ راست پر لاوے اور جو کہ آپ بزرگ ہیں اور حاجی ہیں امید ہے کہ خداتعالیٰ آپ کی دُعا قبول کرے گا"۔

جہاں جہاں سرسید کو بعض بے تکلف دوستوں کو خط لکھنے اور کھُلنے کا موقع مل گیا ان کے اندر کی انشاپردازی کام کر جاتی اور جا بجا معنی خیز وفکر انگیز جملے نکل گئے۔ اپنے دوست اور رقیب امداد علی کے نام خطوں میں اکثر شوخی اور سادگی جھلکی پڑتی ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میں سنتا ہوں کہ ممدوح بڑی دھوم دھام سے کچہری فرماتے ہیں اور اگلوں کی نیک نامی مٹانا چاہتے ہیں۔"

اپنے ایک اور دوست مولوی ممتاز علی کو لکھتے ہیں:

جو بات خدا نے ہم کو داڑھی سفید ہوجانے کے بعد دی وہ خدا نے تمکو اس عمر میں دیدی کہ شاید ابھی پوری

داڑھی بھی نہ نکلی ہوگی۔ معلوم نہیں کہ تمہاری شادی ہوگئی یا نہیں۔ اگر نہ ہوئی ہو تو جلدی مت کرنا۔ یہ ایسا پیچ ہے کہ انسان کو مشکلات میں پھنسا دیتا ہے۔''

ایک خط کے یہ جملے بھی ملاحظہ کیجیے:

آدمی اس واسطے پیدا نہیں ہوا کہ تمام عمر غلامی میں بسر کرے اور کسی وقتِ خاص میں اپنے دل کی خوشی اور آزادی میں اپنے تئیں نہ ڈالے۔ تابعداری خاص دلی حرکتوں پر پردہ ڈالے رکھتی ہے۔ میں اس شخص کو نہایت بدنصیب سمجھتا ہوں جس کے دل پر تا بہ مرگ وہ پردہ پڑا رہے اور خاص دل کی حرکتوں کو جو بجز آزادی کے اور کسی حالت میں اُبھرتی نہیں، ابھرنے نہ دے۔''

--

جیسا کہ شروع میں عرض کیا گیا ان کے اکثر خطوط ایسے ہیں جن میں وہ حکومت اور اربابِ حکومت کو اپنی اور اپنے ادارے کی تعلیمی پالیسی پر توجہ دلانے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ بھی یقین دلایا گیا ہے کہ سرسیّد انگریزی گورنمنٹ کے سچے خیر خواہ ہیں۔ کلکٹر، مجسٹریٹ وغیرہ کے نام خطوں کو ختم کرنے کے بعد وہ اپنے آپ کو وفادار، تابعدار، عقیدت گزیں لکھنے سے گریز نہیں کرتے۔ بعض خطوط ایسے بھی ہیں جن میں سرسید اپنے مذہبی نقطۂ نظر کو واضح کرتے نظر آتے ہیں۔ ایک خط میں یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ۔ ''جو مسلمان کسی ایک گورنمنٹ کی امن وحمایت میں رہتے ہوں جس کا مذہب ان کے خلاف ہو اس پر جہاد کرنا حرام ہے۔''

دلچسپ بات یہ ہے کہ اسی قسم کے خیالات جب کوئی غیر مسلم پیش کرتا ہے تو

سرسیّد اسلام اور مسلمانوں کی حمایت میں جواب دینے لگتے ہیں۔ اس مجموعہ میں ایسے نجانے کتنے خطوط ہیں جو کسی نہ کسی خط، مضمون کے جواب میں یا وضاحت میں لکھے گئے ہیں خاص طور پر انگریزی اخبار پایونیئر کے مدیر کے نام زیادہ خطوط ملتے ہیں۔

چونکہ سرسید کے خطوط ایک خاص مقصد، حقیقت، واقعیت اور وضاحت کے زیر اثر لکھے گئے ہیں اس لیے ان کے اسلوب میں سادگی، صفائی اور پیغام رسانی کے عناصر بہر حال کام کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ وضاحت اکثر پر وقار علمی لب ولہجہ سے پُر ہے اور دوستوں اور خوردوں کے خطوط میں قدرے شوخی و مزاح کے پہلو کے ساتھ اس لیے اس میں غالب کی مکتوب نگاری والی کیفیت اور اسلوب کی تلاش بے سود ہوگی البتہ یہ ضرور ہے کہ کہیں کہیں ان کے خطوں میں جو بے ساختہ پن اور بے تکلفی نظر آتی ہے وہ غالب کی دین ہو سکتی ہے مثلاً محسن الملک کے نام اس خط کی تحریر دیکھیے:

> تبدیلِ وضع کے باب میں جو کچھ آپ نے لکھا ہے وہ بہت بجا ہے بشرطیکہ میرا جادو توبہ توبہ۔ میرا معجزہ نعوذ باللہ۔ میری کرامت لاحول ولاقوۃ الّا باللہ۔ میری حماقت بھی تم پر اثر نہ کرے گی۔ ذرا صبر کرو۔ تین مہینے خیر سے گزر جاویں۔ جب الہ آباد اسٹیشن پر گلے ملو گے اور چھاتی سے چھاتی ملے گی اس وقت پوچھیں گے کہ جانِ من قبلۂ من اب کیا ارشاد ہوتا ہے۔"
>
> (۱۰/ مئی ۱۸۷۰ء)

ڈاکٹر سید عبداللہ نے سرسید کی خطوط نویسی کے بارے میں مناسب بات لکھی ہے:

> سرسیّد کی ادبی تحریک اور ان کے شخصی رنگِ خط نگاری نے بھی خاص حد تک اردو خط و کتابت پر اثر ڈالا۔

سر سید جس طرح نثر میں مدعا اور مقصد کے داعی ہیں اسی طرح خط نگاری میں بھی مقصد کے ہی علمبردار ہیں۔ انہوں نے اپنے مضامین تہذیب الاخلاق میں خود اس کا ذکر کیا ہے کہ وہ صرف کام کی باتیں کہنا چاہتے تھے اور عبارت آرائی، تکلف اور اطناب بے مقصد سے احتراز کرتے ہیں۔ ان کے خط ان کی عام نثر کے مقابلہ میں زیادہ شگفتہ ہیں.... بہر حال یہ مسلّم ہے کہ سر سید نے اردو خطوط نگاری کو مضمون کی قطعیت، زبان کی سادگی اور تخاطب سے آشنا کیا۔"

(میر امن سے عبدالحق تک)

یہ سچ ہے کہ غالب اپنے مخصوص رنگ خط نویسی کے موجد ہیں اور خاتم بھی۔ اس ضمن میں ان کا اپنا منفرد دبستان ہے جو انہیں پر ختم ہے لیکن سر سید کے خطوں سے تو خط نویسی کے ایک نئے دبستان کی شروعات ہوتی ہے جس کے سلسلے محسن الملک، حآلی، شبلی، آزاد، اکبر الہ آبادی اور آگے بڑھ کر عبدالحق تک دیکھے جا سکتے ہیں۔ پروفیسر ثریا حسین نے اپنی کتاب سر سید اور ان کا عہد میں سر سید کے خطوط کے ضمن میں تو یہاں تک کہہ دیا:

"اردو مکتوب نگاری میں علی گڑھ تحریک سے ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ اس نے اردو ادب کی دیگر اصناف کی طرح خط نویسی کا رنگ بھی بدل دیا اور تاریخ، سوانح، تنقید و تبصرہ، ناول و افسانہ، طنز و مزاح اور صحافت نے بھی مراسلہ کو فروغ دیا۔"

کہا جاتا ہے کہ غالب نے مراسلہ کو مکالمہ بنادیا۔ سرسیّد نے مکالمہ کو مجاہدہ میں تبدیل کردیا اور اس کے رشتے جرأت اظہار، حقیقت کی پیکار اور تاریخ کے آزار و آثار سے اس طرح جوڑ دیے کہ انیسویں صدی کے تمام عوامل و محرکات کو سرسیّد کے بغیر سمجھا نہیں جاسکتا اور اصل سرسیّد اور ان کے مشن کو ان کے خطوط کے بغیر سمجھ پانا ناممکن نہ سہی تو مشکل ضرور ہے۔

نقد قاطع برہان

(مع ضمائم)

پروفیسر نذیر احمد

مرزا غالب کی مشہور تصنیف، قاطع برہان، ایک زمانے تک اہل علم کے درمیان موضوع بحث رہی ہے۔ اس کتاب سے لغت نگاری کے سلسلے میں کئی اہم مباحث سامنے آئے ہیں۔

فارسی اور اردو کے معروف وممتاز محقق پروفیسر نذیر احمد نے غالب کی اس کتاب کے بعض مندرجات کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھا ہے۔

غالب شناسی کے سلسلے کی ایک اہم اور فکر انگیز کڑی۔

صفحات : ۴۲۲

قیمت : ۶۰ روپے

مہیا عبدالرحمٰن

غالبؔ کے خطوط کا لسانیاتی اور اسلوبیاتی جائزہ

میرے لیے شروع ہی میں اس بات کا اعتراف ضروری ہے کہ نہ میں غالب شناس ہوں اور نہ ہی نقاد۔ اردو زبان کی ایک ادنیٰ طالبہ ہوں اور اس شیرین زبان سے محبت کرتی ہوں۔ میں نے Ph.d. کرنے کے بعد دو سال قبل اپنے ڈی۔لٹ کے کام کے لیے مرزا غالب کا انتخاب کیا۔ ان کی اردو شاعری میرا موضوع ہے۔ یہ انتخاب میں نے اس لیے کیا کہ غالب ایک تو عظیم شاعر تھے دوسرے یہ کہ نسبی اعتبار سے ان کا تعلق میرے وطن ازبکستان سے تھا۔ میں قاضی عبدالودود صاحب اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی اس رائے سے اتفاق کرتی ہوں کہ غالب نسلاً ازبیک تھے۔ حضرت امیر خسرو اور مرزا بیدل کے اجداد بھی ترک وطن کر کے ازبکستان کی سرزمین سے ہندوستان آئے تھے۔ ان دونوں باکمال شاعروں کے بارے میں ازبیک اور تاجک عالموں نے قابلِ قدر تحقیقی کام کیا ہے۔ لیکن مرزا غالب کے بارے میں جن کی شاعرانہ عظمت پر اہل ہند کو ہی نہیں ہمیں بھی ناز ہے ابھی تک

ازبکستان میں کوئی اہم کام نہیں ہوسکا ہے۔ صرف ان کے صد سالہ جشن کے موقع پر میرے اساتذہ رحمٰن بیردی، محمد جانوف مرحوم نے پروفیسر قمر رئیس کے مقدمہ کے ساتھ ان کے اردو کلام کا انتخاب ازبکی میں شائع کیا تھا۔ جس کے دو اڈیشن شائع ہوکر مقبول ہوئے۔ مجھے امید ہے کہ میرا یہ تحقیقی کام مکمل ہوگیا تو ازبیک زبان میں مرزا غالب کے کارناموں کا زیادہ مکمل تعارف ہوسکے گا۔

جہاں تک غالب کے مکاتیب کا تعلق ہے میں نے ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کے مرتبہ غالب کے خطوط کی چار جلدوں کا مطالعہ کیا ہے۔ ان میں غالب کی شاعری ان کے احباب اور ان کی زندگی کے بارے میں قابلِ قدر مواد ملا ہے۔ جہاں تک ان خطوط کی نثر کا تعلق ہے میں جانتی ہوں کہ اس کی خوبصورتی اور ادبی خوبیوں کی داد جس طرح آپ دے سکتے ہیں میں نہیں دے سکتی۔ اس لیے میرے سامنے ایک بڑا سوال یہ تھا کہ میں اس کے بارے میں کیا لکھوں؟ مجھے ایسا لگا کہ ان خطوں میں کچھ ایسی لسانیاتی خوبیاں ضرور ہیں جو دوسرے مکتوب نگاروں میں ان کی الگ پہچان بناتی ہیں اور غالب کی نثر کی انفرادیت کو قائم کرتی ہیں۔ اس لیے میں نے میر مہدی مجروح کے نام غالب کے ۵۰ خطوط کا انتخاب کیا۔ ان کے لسانیاتی اور اسلوبیاتی پہلوؤں کو ذرا قریب سے سمجھنے کی کوشش کی، آپ حضرات مجھے معاف فرمائیں اگر آپ کو انگریزی اصطلاحات کا استعمال زیادہ نظر آئے۔

یہ صحیح ہے کہ غالب کے خطوں میں بے حد سادگی اور صفائی ہے لیکن ان کو پڑھتے ہوئے صوتیاتی phonetic سطح پر جگہ جگہ مقفٰی نثر کا بھی احساس ہوتا ہے۔ یہ اسلوبیاتی خوبی نثر میں آہنگ پیدا کرکے اکثر اس کے حسن کو بڑھاتی ہے۔ غالب کی لفظیات بہت وسیع تھی اس لیے اپنے خطوں میں جگہ جگہ اس سے کام لیا ہے۔ چند مثالیں دیکھیے:

۱۔ میر مہدی دہلوی اردو بازار کے مولوی

۲۔ جب آؤ گے مجھ کو جیتا پاؤ گے

۳۔ یائے دلی وائے دلی، بھاڑ میں جائے دلی

۴۔ الور کی ناخوش راہ کی محنت کش، تپ کی حرارت رمی کی شرارت، یاس کا عالم، کثرت اندوہ وغم

۵۔ او میاں سید نادۂ آزادہ دلی کے عاشقِ دلدادہ ڈھے ہوئے اردو بازار کے رہنے والے حسد سے لکھنو کو برا کہنے والے

۶۔ ایک آزردہ سو خاموش دوسرا غالب وہ بے خود مدہوش

۷۔ دوست ہوں عاشقِ نار نہیں بندۂ مہر و وفا یوں گرفتار نہیں

۸۔ یہاں کا حال سب طرح خوب اور صحبت مرغوب ہے

۹۔ یہاں کا نقشہ ہی کچھ اور ہے سمجھ میں کسی کے نہیں آتا کہ کیا طور ہے۔

اسی طرح hon،ophonic حالت بھی ملتی ہے جیسے:

فیض خاص نہیں لطف عام ہے یعنی شراب نہیں آم ہے

اب ذرا نحوی syntactic سطح پر دیکھیں۔ اس کا تعلق کئی طرح کی ترکیبوں پر ہے مثلاً عبارت کی منطقی ترتیب میں کچھ ضروری حصوں کا غائب ہونا۔ جملوں کا نامکمل ہونا لیکن اس کے باوجود ان میں خاص طرح کا expressive potential یعنی ترسیلی قوت کا موجود ہونا۔ اسے اختصار یا اجمال کا ہنر بھی کہتے ہیں۔ یہ صرف ذہین اور خلاق نثر نگاروں کا ہی شیوہ ہوتا ہے۔ دیکھیے غالب کے یہ جملے:

۱۔ خط بھیجنے میں تردد نہ کرو اور ڈاک میں بے تامل بھیجا کرو۔ زیادہ زیادہ (بھیجا کرو)

۲۔ تمہارا خط آئے اور میں جواب نہ لکھوں تو گناہگار "ہونگا" ہونا چاہیے

۳۔ برس چھ مہینے تک اپنا دبا ہوا روپیہ مسترد کرنا ہوگا۔ نوکری مفت میں (ملے گی)

۶۔ نہ تم مجرم (ہو) نہ میں گنہگار (ہوں)

۵۔ میر سرفراز حسین کو دعا (کہو)۔ میر نصیر الدین کو پہلے بندگی پھر دعا (پہنچے)

مندرجہ بالہ جملوں میں predicate موجود نہیں۔ لیکن جملے کا غیر موجود عنصر بڑی آسانی سے context میں بحال ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے ellipsis جملے زبان میں dynamizm اور اعتماد بھری سادگی پیدا کرتے ہیں۔

اسلوبیاتی خصوصیات میں ایک تکرار بھی ہے۔ اس سے زبان کی معنی خیزی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

ا۔ جواب ترک ترک، جواب عربی عربی

۲۔ کتنے اوچھے ہو مصطلحات الشعرا، مصطلحات الشعرا بھئی!

غالب میں تکرار کی زیادہ تر epiphora کی شکل ملتی ہے یعنی مکرر الفاظ جملے کے آخر میں آتے ہیں:

ا۔ مجتہد العصر کو بندگی لکھوں دعا لکھوں کیا لکھوں

۲۔ اجی وہ یوسف ہند نہ سہی یوسفِ دہر سہی یوسفِ عصر سہی، یوسفِ ہفت کشور سہی

۳۔ خوب آدمی ہیں اور کام کے آدمی ہیں۔

۴۔ بھائی! خوب چھان کر لکھ اور جلد لکھ

۵۔ نہ عرف لکھنے کی حاجت نہ محلے کی حاجت

۶۔ اس شخص کا حال از روئے تحقیق مشرح اور مفصل لکھو۔ قوم کیا ہے عمر کیا ہے، معاش کیا ہے، طریق کیا ہے۔

نحوی ساختوں کی تکرار جو متوازی ہوں بہت مستعمل ہیں۔

ا۔ کوئی انگریزی کاغذ دکھایا کوئی فارسی خط پڑھوایا

۲۔ نثر کیا لکھونگا اور نظم کیا کہونگا۔

۳۔ مجھ کو دیکھو کہ میں کب سے دلی میں رہا ہوں۔ نہ کوئی اپنا ہم نام ہونے دیا، نہ کوئی اپنا ہم عرف بننے دیا نہ اپنا تخلص بہم پہنچایا۔ فقط۔ متوازیت

زبان میں pazalelizm اکثر ملنے والی اسلوبی شکل ہے جس کے مطابق پاس پاس آنے والے word combinations یا جملے میں سے ایک الٹی سلسلہ آوری میں ہوتا ہے۔

اب کچھ ذکر phraseology کے اسلوب functions کا:

ان میں stylictic رنگ کی وجہ سے جملے میں بہت موثر ہوتے ہیں مثال کے طور پر:

۱) کیسا پنسن اور کہاں اس کا ملنا۔ یہاں تو جان کے لالے پڑے ہیں۔ یہ محاورہ ہے یعنی جینے کی امید نہ ہونا۔

۲) آئندہ خدا رزاق ہے کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے۔ ''غم کھانا، محاورا ہے صدمہ اٹھانا، رنج سہنا کے معنی میں۔

۳) میں تو اس سے ہاتھ دھوئے بیٹھا ہوں۔ یہ بھی محاورہ ہے ''مایوس ہو جانا، ناامید ہونا''۔

۴) تم نے جلے پھپھولے پھوڑے۔ محاورہ: ''شکوے شکایت سے دل کا غبار نکالنا''

کلمۂ دعا بھی ملا: خانہ آباد دولت زیادہ یعنی دولت وافر اور گھر بھرا رہے۔

اس طرح کے محاورے غالب کے خطوط میں کسی خیال یا اہم بات کو زیادہ اجاگر کرنے کے لئے مستعمل ہوئے ہیں۔ یہ واقعات کو موثر بنانے کرداروں کے nature یا character کو کھولنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ implications کو ظاہر کرنے میں کافی مدد دیتے ہیں۔ Inversion اسلوبی بیان سے متعلق شکل سمجھی جاتی ہے۔ جملے میں ہر ایک part of speech کی اپنی مقررہ جگہ ہوتی ہے۔ اگر یہ ترتیب بدل جائے تو جملے کا کوئی عنصر متمائز ہو جاتا ہے اور

expressiveness کا رنگ حاصل کر لیتا ہے، زیادہ تر جملے کا ایک رکن Inversion میں ہوتا ہے جیسے:

۱) یار تیری جواب طلبی نے مار ڈالا

۲) بعد ثبوت افلاس چھ مہینے یا برس دن کا روپیہ علی الحساب پانے کا مستحق ٹھہرونگا

۳) کیوں یوسف مرزا کے خطوط کے نہ آنے سے تعجب کرتے ہو

۴) تمہارے اس سوال کا یہ جواب ہے کہ جو پہلے خط میں تم نے لکھا تھا۔

اوپر کے جملوں سے ظاہر ہے کہ اردو میں زیادہ تر inversion predicate میں ملتا ہے۔ اس سے کم مبتدا کا Inversion آتا ہے:

۱) شاید نئے بندوبست میں کوئی نوکری کی صورت نکل آئے۔

۲) انہوں نے لکھا ہوا ۱۵ جمادی الثانی کا تمہارا خط دیا۔

دوسرے جملے نہ صرف ایک مبتدا کا بلکہ ترکیب لفظی Inversion ملتا ہے۔

استفہامیہ مخاطب بھی اسلوبیاتی مطالعہ میں اہمیت رکھتا ہے۔ بعض سوال چونکہ جواب کے محتاج نہیں ہوتے اس لیے ان کا مقصد سننے والے کو متوجہ کر لینا یا زیادہ اثر ڈالنا ہوتا ہے۔ ساتھ ساتھ emotional tone کو بڑھانا، متن میں eleratid پیدا کرتا ہے۔ وہ سامع کو زیادہ سوچ وچار میں یا بحث میں کھینچتا ہے۔ زیادہ سرگرمی پیدا کر کے اس کے اپنے طور پر نتیجے نکالنے پر مجبور کرتا ہے۔

مثلاً:

۱) بھلا یہ ہو سکتا ہے کہ تمہارا خط آئے اور میں اسے پھیر دوں؟

۲) کیا وہ میرے بابا کے نوکر تھے کہ میں ان کو بلاتا؟

۳) کیوں ایسے شہر میں رہتے ہو جہاں دوسرا امیر مہدی بھی ہو

۴) میں کتاب کہاں سے چھپواتا؟ روٹی کھانے کو نہیں شراب پینے کو نہیں۔ جاڑے

آتے ہیں۔

۵) حضور میں کیا منع کرتا ہوں میں نے تو یہ عرض کیا تھا کہ اب وہ تندرست ہو گئے ہیں۔

مندرجہ بالا سوال استہزا، طنز، غصہ تشیش کا اظہار کرتے ہیں۔ ایک اور قسم کے chetorical ہوتے ہیں جن میں سننے والا مصنف کے ساتھ کسی معین مسئلے پر ساتھ غور کرنے پر مجبور ہوتا ہے:

۱) مہاراج اگر دورے کو گئے تو کیا اندیشہ ہے، گرمی کا موسم، لمبا چوڑا سفر کیوں کریں گے۔

۲) برن صاحب کو دعا، زیادہ کیا لکھوں؟

۳) میں ایسے خط کا جواب کیوں لکھوں۔ میری بلا لکھے۔

کسی نثر پارہ میں فجائیہ حرف جذبے کی ترسیل میں بہت رول ادا کرتے ہیں۔ یہ الفاظ ایسے part of speech ہیں جو جذبات اور جوش کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن ان کے گرنے سے جملے کی ساخت میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ ایسے الفاظ کو خود جذبات کا نام دینے والے الفاظ جیسے حیرت، ڈر، شبہ، رحم سے متمائز کرنا چاہیے۔ یہ بالکل الگ گروپ ہے۔ اسلوب بیان میں ایسے الفاظ پر غور کرنا اس لیے اہم ہے کہ وہ متن میں معین موڈ پیدا کرتے ہیں۔ دیکھیے:

a) تعریف، تحسین، داد اور طنز کے محل پر:

۱) جیتے رہو آفریں، صد ہزار آفرین (کلمۂ فجائیہ۔ دعا کے معنوں میں)

۲) واہ واہ سید صاحب! تم تو بڑی عبارت آرائیاں کرنے لگے شاید اس میں تعریف اور طنز دونوں پہلو پوشیدہ ہیں

۳) کبھی جو جی میں آتا ہے تو وقت صوم مہتاب باغ میں جا کر روزہ کھولتا ہوں اور

سرد پانی پیتا ہوں۔

واہ واہ! کیا اچھی طرح عمر بسر ہوتی ہے۔ اظہار مسرت، طنز شاید ہے

۴) قطعہ تم نے دیکھا، واہ! کیا شاعری رہ گئی! طنزیہ اظہار

b) افسوس، تاسف، آہ و بکا

نقشِ ناطقہ کو تواجد بہم پہنچا۔ ساقی کوثر کا بندہ اور تشنہ لب! ہائے غضب! یائے غضب

(کیا برا ہوا، کیا ستم، ہوا)

۲) جب اکیجا ہوں گے تو انتقام کیا جائے گا، ہے ہے کیوں ایک جا ہوں گے

دیکھیے، خوشی اور محرومی وغیرہ

یا یا یا میرا میر مہدی آیا آؤ بیٹھو!

اگر میں غلطی پر نہیں ہوں غالب پہلے ادیب ہیں جنہوں نے خطوں میں مکالماتی شکل کو کامیابی سے رواج دیا۔ اس سے ان کے خطوں میں جیسا کہ ناقدین نے لکھا ہے ایک ڈرامائی کیفیت پیدا ہوگئی ہے جو ان کی نثر کے ادبی حسن میں اضافہ کا باعث بھی ہے۔ اس کے ساتھ ان کی بات کی ترسیل زیادہ گہری ہو جاتی ہے۔ یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ مکالمے کی وجہ سے جملے کی نحوی ساخت سادہ اور مختصر ہو جاتی ہے۔ چند مثالیں:

۱) ''پھر پوچھا: تم نے کتاب کیسی لکھی ہے؟ کہا: ایک میکلوڈ صاحب نے دیکھنے کو مانگی ہے اور ایک ہم کو دو۔ میں نے عرض کیا: کل حاضر کرونگا''۔

۲) ''پھر مجھ سے کہا ہم نے تمہارے پنشن کے باب میں اجرٹن صاحب کو کچھ لکھا، تم ان سے ملو۔ عرض کیا: بہتر۔''

اسلوبیاتی مطالعے میں تجسیم کاری کی بھی خاص اہمیت ہے۔ اس کے مطابق جاندار اشیا کی خصوصیات بے جان چیزوں سے منسوب کی جاتی ہیں:

''پہلے یہ سمجھو کہ قسم کیا چیز ہے؟ قد اس کا کتنا لمبا ہے؟ ہاتھ پاؤں کیسے ہیں؟ رنگ کیسا ہے؟''

عبارت میں مضاد معنوی فضا بھی لطف پیدا کرتی ہے جس میں دو تصور، دو کردار ایک دوسرے کے مقابل ہوتے ہیں؛ جیسے: ''حاسدوں کو موت آ گئی، دوست شاد ہوئے۔

غالب کے خطوں کی زبان میں جو زور، روانی اور فطری پن ہے او emotionaly ان کی عبارت میں الفاظ کا استعمال جتنا برمحل، چست اور درست ہے اگر غور سے دیکھا جائے تو اس کے پیچھے ان کی پر خلوص شخصیت کام کرتی نظر آئے گی۔ بے شک ان کا نثری اسلوب اپنی سادگی میں تو باغ و بہار اور وہ جذبہ ہے جو تقریباً ہر خط میں رو بن کر دوڑتا ہے۔ مرزا غالب کی شاعری کی طرح ان کے خطوں کی نثر بھی ان کو پہچان دیتی ہے۔

توضیحی اشاریۂ غالب نامہ

(ابتدا سے جولائی ۱۹۹۳ء تک)

مرتب: فاروقی انصاری

ادبی مجلّہ ''غالب نامہ'' غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کا ترجمان ہے۔ غالب نامہ میں غالبیات کے علاوہ دیگر موضوعات پر لکھے گئے مقالوں کو بھی شامل کیا جاتا رہا ہے لیکن بیشتر مقالے یا مضامین غالب اور عہدِ غالب سے متعلق ہی ہیں۔ ابتدا سے لے کر جولائی ۱۹۹۳ء تک شامل تمام مقالات اور غالب انسٹی ٹیوٹ کی ادبی سرگرمیوں کا ایک بھرپور اشاریہ اس کتاب میں شامل ہے۔

عمدہ طباعت، خوبصورت گٹ اپ۔

صفحات : ۱۳۴

قیمت : ۶۰ روپے

ابن کنول

خطوطِ غالبؔ میں مرقع نگاری

تحریر کی خوبی یہ ہے کہ وہ تصویر بن جائے۔ مصور رنگ و روغن کی مدد سے اس طرح کی تصویر کشی کرتا ہے کہ اس پر حقیقت کا گمان ہو، قلم کار اپنی قوتِ بیان اور وسعت نظری کے سبب تحریر میں اِس قدر جزئیات کو پیش کرتا ہے کہ وہ تصویر بن جاتی ہے۔ افسانوی ادب کی قدیم ترین صنف داستان کا خالق بھی مرقع نگار ہوتا ہے۔ داستانوں میں قلمی تصاویر کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ داستان گو کو زبان و بیان پر اس قدر قدرت حاصل ہوتی ہے کہ وہ اپنے مطالعے اور مشاہدے کی بنیاد پر اپنی قوت متخیلہ کی مدد سے اپنے عہد کا عکس پیش کر دیتا ہے، بلاشبہ داستانیں اپنے عہد کی معاشرت کی عکاس ہیں۔ غالب داستان پسند تھے، داستان سننا اور داستان پڑھنا اُن کے شوق میں شامل تھا، ایک خط میں لکھتے ہیں:

''مولانا غالب علیہ الرحمۃ ان دنوں بہت خوش ہیں،
پچاس ساٹھ جزو کی کتاب امیر حمزہ کی داستان کی اور اسی

قدر حجم کی ایک جلد بوستان خیال کی آ گئی ہے سترہ بوتلیں
بادۂ ناب کی توشک خانہ میں موجود ہیں۔ دن بھر کتاب
دیکھا کرتے ہیں۔ رات بھر شراب پیا کرتے ہیں"
(خطوطِ غالب، ص۲۹۶، بنام میر مہدی مجروح)

غالب نے تحریر کا فن داستانوں سے سیکھا، داستان وہی شخص بیان کر سکتا ہے جسے زبان و بیان پر بے پناہ قدرت حاصل ہو، غالب فارسی اور اردو دونوں زبانوں پر قدرت رکھتے تھے۔ اسی لیے انہیں اپنے مشاہدات اور احساسات کا اظہار بازیچۂ اطفال معلوم ہوتا تھا۔ داستان تحریر کا نہیں، سنانے کا فن ہے۔ اِس ہنر سے غالب واقف تھے، غالبؔ خط لکھتے نہیں، سناتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

"میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ
بنادیا ہے۔ ہزار کوس سے بہ زبانِ قلم باتیں کیا کرو، ہجر
میں وصال کے مزے لیا کرو"
(خطوطِ غالب، ص۲۱۹، بنام حاتم علی بیگ مہر)

ہجر میں وصال کے مزے اُسی وقت حاصل ہو سکتے ہیں جب جزئیات کے بیان میں تصویر ابھر آئے۔ داستان گو الفاظ کے دروبست سے تصویر بنا دیتا ہے اور غالب جیسا کہ میں نے کہا داستان پسند تھے، تحریر کا فن انہوں نے داستانوں سے سیکھا، لکھتے ہیں:

"یہاں کا حال کیا لکھوں؟ بقول سعدی علیہ الرحمہ (نہ
ماند آب جز چشم در یتیم) شب و روز آگ برستی ہے یا
خاک۔ نہ دن کو سورج نظر آتا ہے، نہ رات کو تارے،
زمین سے اٹھتے ہیں شعلے، آسمان سے گرتے ہیں

شرارے۔ چاہا تھا کہ کچھ گرمی کا حال لکھوں، عقل نے کہا
کہ دیکھ نادان! قلم انگریزی دیا سلائی کی طرح جل
اٹھے گی اور کاغذ کو جلادے گی'' (خطوط غالب، ص ۱۵۱،
بنام نواب امین الدین احمد خاں)

غالب کے مذکورہ بیان سے تپش کا احساس ہوتا ہے اور جس تحریر سے تپش محسوس ہونے لگتی ہے، وہ تحریر تصویر بن جاتی ہے۔ غالب نے جس وقت اردو میں خطوط لکھنا شروع کیے، اُس وقت تک اردو کو سادگی اور سلاست کا اسلوب مل چکا تھا۔ فورٹ ولیم کالج کی داستانیں مقبولِ عام ہو چکی تھیں۔ سر سید احمد خاں کی تصانیف منظرِ عام پر آ چکی تھیں اور شاید اردو خطوط نویسی کا سبب غالب کی ضعیفی نہیں بلکہ اردو نثر کی مقبولیت تھا۔ شمالی ہند میں اٹھارہویں صدی میں باقاعدہ اردو شاعری کی ابتدا ہوتی ہے لیکن نثر کی طرف چند ایک کے سوا کوئی متوجہ نہیں ہوتا۔ اردو کے شاعر بھی فارسی نثر ہی لکھنا پسند کرتے تھے لیکن فورٹ ولیم کالج کے قیام نے اردو نثر کو ایک خاص اسلوب و وقار دیا، جس کے سبب اردو نثر کو بھی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا اور ''نوطرز مرصع'' کا اسلوب سلاست اور سادگی میں تبدیل ہو گیا۔

غالب نے جس عہد میں ہوش سنبھالا، وہ میر و مرزا کا عہد دیکھ چکا تھا اور میر و مرزا کا عہد اردو شاعری کا اہم دور تھا۔ اس کے باوجود غالب اپنی فارسیت پر ناز کرتے ہوئے فارسی میں شعر کہتے ہیں اور فارسی ہی میں نثر لکھنا پسند کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۸۴۸ء میں بہ سبب ضعیفی غالبؔ نے اردو میں خطوط لکھنا شروع کیے۔ یہ بات کچھ غیر فطری سی معلوم ہوتی ہے کہ ایک شخص تقریباً پچاس سال تک جس زبان کے گیسو سنوارتا رہا ہو، اچانک اس سے کنارہ کر لے یا ایک شخص اپنی مادری زبان کو اس وقت ذریعۂ اظہار بنائے جب اس کی عمر کی نصف صدی گزر جائے۔ ترک و آغاز

کا بیان محض غالب کا انداز ہے۔ دراصل اردو زبان کی مقبولیت، لطافت، شگفتگی اور بے تکلفی نے غالب کو مجبور کیا کہ اس کو اختیار کریں۔ ممکن ہے کہ انہوں نے ۱۸۴۸ء سے قبل بھی اردو میں خطوط تحریر کیے ہوں جو کسی وجہ سے دستیاب نہ ہوئے ہوں یا ان کا انداز روایتی ہو اور غالب نے خود انہیں نا قابلِ انتخاب سمجھ کر حاصل کرنے کی سعی نہ کی ہو۔

بہر حال غالب کے موجود اردو خطوط نے انہیں اردو نثر کی تاریخ میں بھی ایک نمایاں مقام دلا دیا ہے، بقول رشید احمد صدیقی ''ان کے رقعات نے یقیناً ان کو محبوبِ خلائق بنا دیا۔'' یوں تو خطوطِ غالب کی مقبولیت اور اہمیت کی بہت سی وجوہات ہیں مثلاً روشِ عام سے ہٹ کر انفرادی انداز بیان، اور اس کے ساتھ سادگی، سلاست، بے ساختگی، بے تکلفی اور ظرافت و شوخی کی شمولیت۔ ان خصوصیات کے علاوہ جو چیز ان خطوط کی اہمیت میں اضافہ کرتی ہے وہ اپنے عہد کی عکاسی ہے۔ غالب اپنے خطوط میں اپنے عہد کی حقیقی تصاویر کو جا بجا پیش کرتے ہیں۔ ایک روزنامچہ اگر انہوں نے ''دستنبو'' کے نام سے تحریر کیا تو دوسرا ان کے خطوط میں موجود ہے۔ جس طرح داستانوں کی مدد سے اس عہد کی تہذیبی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے، اسی طرح غالب کے خطوط سے ان کے عہد کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات سے واقفیت حاصل کی جاسکتی ہے۔ خطوطِ غالب محض خطوط نہیں اپنے عہد کے حقیقی مرقعے ہیں۔ غالب کی شاعری غالب کا نامکمل تعارف ہے لیکن غالب کے خطوط انہیں مکمل طور سے ہمارے سامنے لا کر کھڑا کر دیتے ہیں۔ غالب کے خطوط سے نہ صرف دلّی کا احوال معلوم ہوتا ہے بلکہ قرب و جوار کے حالات سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔ وہ اپنی شوخی و ظرافت کے پردے میں اپنی ذہانت اور دور بینی کا اظہار کر جاتے ہیں۔ ان کے خطوط سے ان کی زندگی کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے بلکہ ان کے عزیز و اقارب، دوست واحباب

بھی ارد گرد موجود نظر آتے ہیں۔ غالب کی زندگی جس کرب سے گزری، اس کی عکاسی ان کے خطوط کرتے ہیں۔ خطوط میں غالب ہنستے، مسکراتے، کھلکھلاتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں اور آہ و فریاد کرتے ہوئے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے ردِ عمل سے جو تباہی دلّی اور دلّی والوں کی خصوصاً مسلمانوں کی ہوئی، اس کرب کی مرقع کشی میں غالب کی انگلیاں خونِ دل میں ڈوبی نظر آتی ہیں۔ دلّی اور دلّی والوں کی بربادی ان کی اپنی بربادی تھی۔ ۲۸ر نومبر ۱۸۵۹ء کو ایک تفصیلی خط میں یوسف مرزا کو لکھتے ہیں:

> ''میرا حال سوائے میرے خدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا۔ آدمی کثرتِ غم سے سودائی ہو جاتے ہیں، عقل جاتی رہتی ہے۔ اگر اس ہجوم غم میں میری قوتِ متفکرہ میں فرق آ گیا ہو تو کیا عجب ہے، بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے۔ پوچھو کہ کیا غم ہے، غم مرگ، غم فراق، غم رزق، غم عزت۔ غمِ مرگ میں قلعہ نامبارک سے قطع نظر کر کے اہل شہر کو گنتا ہوں: مظفر الدولہ، میر ناصر الدین، میرزا عاشور بیگ، میرا بھانجا، اس کا بیٹا احمد میرزا، انیس برس کا بچہ، مصطفٰے خاں ابن اعظم الدولہ، اس کے دو بیٹے ارتضٰی خاں اور مرتضٰی خاں، قاضی فیض اللہ کیا میں ان کو اپنے عزیزوں کے برابر نہ جانتا تھا؟ اے لو، بھول گیا حکیم رضی الدین خاں، میر احمد حسین میکش، اللہ اللہ ان کو کہاں سے لاؤں؟ غم فراق۔ حسین مرزا، میر مہدی، میر سرفراز حسین، میرن

صاحب، خدا ان کو جیتا رکھے، کاش یہ ہوتا کہ جہاں
ہوتے، وہاں خوش ہوتے، گھر ان کے بے چراغ، وہ
خود آوارہ، سجاد اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں،
کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔ کہنے کو ہر کوئی ایسا کہہ
سکتا ہے۔ مگر میں علیؑ کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ ان اموات
کے غم میں اور زندوں کے فراق میں عالم میری نظر میں
تیرہ و تار ہے" (خطوط غالب، ص ۴۰۳)

یہاں غالب کی تحریر میں ایک درد کا احساس ہوتا، ان کے ایک ایک لفظ سے کرب کی فضا بنتی چلی جاتی ہے۔ تباہی کا وہ منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ لکھتے ہیں:

ہزار ہا دوست مر گئے، کس کس کو یاد کروں اور کس سے
فریاد کروں، جیوں تو کوئی غمخوار نہیں اور مروں تو کوئی
عزادار نہیں"

غالب اپنے خطوط میں بار بار اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ اتنے یار مرے کہ جو اب میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا۔ غالب نے اپنی تحریروں میں اس قدر درد و غم جمع کیے ہیں کہ لفظوں سے اشک ٹپکتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ دلّی جو ایک تہذیب کا نام تھا، اس کی تباہی کا منظر غالب جیسے حسّاس شخص کو دیکھنے کو ملا، وہ اس اجڑتی اور لٹتی ہوئی تہذیب کو دیکھ کر تڑپ اٹھتے ہیں، علاء الدین احمد خاں علائی کو ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں:

"اے میری جان! یہ وہ دلّی نہیں، جس میں تم پیدا
ہوئے ہو، وہ دلّی نہیں ہے جس میں تم نے علم تحصیل
کیا ہے، وہ دلّی نہیں ہے جس میں تم شعبان بیگ کی

حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے، وہ دلّی نہیں ہے،
جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں، وہ دلّی
نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں، ایک
کنپ ہے، مسلمان اہلِ حرفہ یا حکّام کے شاگرد
پیشہ، باقی سراسر ہنود"
(غالب کے خطوط مرتبہ خلیق انجم، ص ۳۸۳)

دلّی کا مرثیہ غالب کے خطوط میں دکھائی دیتا ہے۔ مغل سلطنت کے خاتمہ کے بعد انگریزوں کے غیض و غضب کی شکار دلّی کی تصویر غالب کی تحریر میں یوں ابھرتی ہے:

"اے بندہ خدا اردو بازار نہ رہا، اردو کہاں، دلّی کہاں، واللہ اب شہر نہیں، کنپ ہے، چھاؤنی ہے، نہ قلعہ، نہ شہر، نہ بازار، نہ نہر" (خطوط غالب، ص ۲۹۳)

"پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔ جامع مسجد ہوتا ہوا راج گھاٹ کے دروازے کو چلا، مسجد جامع سے راجھ گھاٹ دروازے تک بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں، وہ اگر اٹھ جائیں تو ہُو کا مکان ہو جائے، یاد کرو مرزا گوہر کے باغیچے کے اس جانب کوئی بانس نشیب تھا وہ اب باغیچے کے صحن کے برابر ہو گیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ فصیل کے کنگورے کھلے رہے ہیں، باقی سب اَٹ گیا۔ کشمیری

دروازے کا حال تم دیکھ گئے ہو، اب آہنی سڑک کے
واسطے کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک میدان
ہوگیا، پنجابی کٹرا، دھوبی واڑہ، رامجی گنج، سادت خاں کا
کٹرہ، جرنیل کی بی بی کی حویلی، رام جی داس گودام
والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ، حویلی، ان میں
سے کسی کا پتہ نہیں، قصہ مختصر شہر صحرا ہوگیا تھا"

(خطوط غالب، ص ۲۹۳)

مذکورہ خط ۱۸۶۰ء کا ہے جو انہوں نے میر مہدی مجروح کو لکھا، یعنی انگریزوں کے دہلی پر قابض ہونے کے تین سال بعد جو دلّی کی کیفیت ہے وہ غالب کو رُلا رہی ہے۔ غالب بظاہر انگریزوں کے طرفدار ہیں لیکن ان کے ساتھ آنے والی سائنسی ایجاد کی وجہ سے انہدامی کاروائی سے ناخوش دکھائی دیتے ہیں۔ انہیں دلّی کے گلی کوچوں، حویلیوں، کٹروں اور باغوں سے محبت ہے۔ ان کی تباہی کا حال دوستوں اور عزیزوں کو سنا سنا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان
نکلے گا، دکانیں، حویلیاں ڈھائی جائیں گی، دارالبقا
فنا ہوجائے گی، رہے نام اللہ کا۔ خان چند کا کوچہ شاہ
بولا کے بڑ تک ڈہے گا۔ دونوں طرف پھاوڑہ چل
رہا ہے"

(خطوط غالب، ص ۲۸۴، بنام میر مہدی مجروح)

غالب کی دلّی وہ تھی جہاں قلعہ کی رونق تھی، چاندنی چوک اور جامع مسجد کے بازاروں کی چہل پہل تھی، جمنا کے پُل کی سیر اور پھول والوں کا میلہ تھا لیکن سیاسی انقلاب

میں یہ سب ختم ہوگیا اسی لیے وہ دلّی کو موجود نہیں بلکہ تاریخ کا گزرا ہوا شہر مانتے ہیں اور اظہار افسوس کرتے ہیں:

> ''لو سنو! اب تمہاری دلّی کی باتیں ہیں چوک میں بیگم کے باغ کے دروازے کے سامنے حوض کے پاس جو کنواں تھا اس میں سنگ و خاشاک ڈال کر بند کر دیا۔ بلی ماروں کے دروازے کے پاس کئی دکانیں ڈھا کر راستہ چوڑا کر دیا''
>
> (خطوط غالب، ۱۷۲، بنام سرفراز حسین)
>
> ''صاحب کیسی صاحبزادوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ دلّی کو ویسا ہی آباد جانتے ہو جیسی تھی، قاسم جان کی گلی خیراتی کے پھاٹک سے فتح اللہ بیگ خاں کے پھاٹک تک بے چراغ ہے... لال کنوئیں کے محلّے میں خاک اڑتی ہے، آدمی کا نام نہیں'' (خطوط غالب، ص ۵۸، بنام عزیز الدین)

غالب اپنے عہد کی دلّی کی تباہی و بربادی کی پوری تصویر پیش کر دیتے ہیں۔ ان کے الفاظ میں درد بھی ہے اور جھنجھلاہٹ بھی۔ ان کی جزئیات ہمیں ایک ایک منظر کا نظارا کراتی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''مرزا تفتہ تم بڑے بے درد ہو، دلّی کی تباہی پر تم کو رحم نہیں آتا، بلکہ تم اس کو آباد جانتے ہو، یہاں نیچہ بند تو میسر نہیں، صحاف اور نقاش کہاں؟ شہر آباد ہوتا تو میں تم کو تکلیف دیتا'' (خطوط غالب، ص ۱۵۹)

ایک اور خط میں جو ۵ر دسمبر ۱۸۵۷ء کو منشی ہر گوپال تفتہ کو لکھا ہے، لکھتے ہیں:

''میں جس شہر میں ہوں، اس کا نام دلّی اور اس محلے کا نام بلّی ماروں کا محلّہ ہے لیکن ایک دوست اِس جنم کے دوستوں میں نہیں پایا جاتا۔ واللہ ڈھونڈنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر، کیا غریب، کیا اہلِ حرفہ، اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں''

(خطوط غالب، ص ۱۴۴)

غالب اپنی بے بسی، بے کسی اور تنہائی پر نہ صرف روتے ہیں بلکہ جھنجھلاتے بھی ہیں۔ ان کی جھنجھلاہٹ کا اظہار جگہ جگہ ملتا ہے۔ مثلاً:

''کیوں میں دلّی کے ویرانہ سے خوش نہ ہو، جب اہل شہر ہی نہ رہے، شہر کو لے کے کیا چولھے میں ڈالوں''

''اے میر مہدی تجھے شرم نہیں آتی... ارے اب اہل دہلی ہندو ہیں یا اہل حرفہ ہیں یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں یا گورے ہیں۔ ان میں سے تو کس کی تعریف کرتا ہے''

(خطوطِ غالب، ص ۲۹۲)

غالب کے خطوط ہمیں ان کے عہد کی ایک ایک بات کا پتہ دیتے ہیں اگر چہ غالب تمام تفصیل لکھنے میں محتاط بھی رہتے ہیں کیونکہ انہیں جان بھی عزیز ہے۔ وہ مغل سلطنت یا بہادر شاہ ظفر کی تباہی پر افسوس کا اظہار مصلحتاً نہیں کرتے لیکن مٹتی ہوئی دلّی اور اُجڑتی ہوئی اِس کی تہذیب کو دیکھ کر لہو کے آنسو ضبط کرتے ہیں۔ انگریز دہلی کی جامع مسجد پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ کیا اس کا قلق غالب جیسے حساس شخص کو نہ ہوگا۔ ایک خط میں تحریر

کرتے ہیں:

"مسجد کے باب میں کچھ پرسشین لاہور سے آئی ہیں یقین ہے کہ واگزاری کا حکم آئے اور وہ مسلمانوں کو مل جائے۔ ہنوز بہ دستور پہرہ لگا ہوا ہے اور کوئی جانے نہیں پاتا" (خطوط غالب، بنام سیاح)

یہ اہل دہلی کے مسلمانوں کے لیے کتنا تکلیف دہ لمحہ اور منظر ہوگا کہ وہ شاہ جہانی مسجد جو مغل سلطنت اور مسلمانوں کی عظمت کی گواہی دیتی تھی، نہ صرف غیر قوم کے قبضہ میں ہے بلکہ اذانوں اور سجدوں سے محروم ہے۔ غالب جامع مسجد کے واگزاشت ہونے پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے جامع مسجد کی سیڑھیوں کے منظر کی مرقع کشی یوں کرتے ہیں:

"مسجد جامع واگزاشت ہوگئی۔ چتلی قبر کی طرف سیڑھیوں پر کبابیوں نے دکانیں بنالیں، انڈا، مرغی، کبوتر بکنے لگا" (خطوط غالب، بنام میر مہدی)

غالب کی شخصیت اور غالب کے عہد کے بیشتر پہلو ہمیں ان کے خطوط کے ذریعے معلوم ہوتے ہیں۔ خطوط کو پڑھ کر ایک خاص دلّی کی تصویر نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ غالب خطوط کی بدولت ہم سے بہت قریب آجاتے ہیں۔ ان کی زندگی اور ان کے عہد کی تصویر خطوط کی مدد سے مکمل ہوجاتی ہے۔ غالب کی زندگی کے بعض ایسے رموز ونکات کا علم ہوتا ہے، جو پردۂ خفا میں رہتے اگر خطوط کی اشاعت نہ ہوتی۔ غالب نے اپنی زندگی یا عہد سے متعلق جو باتیں خطوط میں بلاخوف وخطر لکھ دی ہیں، وہ کسی اور تحریر میں نہیں ملتیں۔ رشید احمد صدیقی غالب کے خطوط پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''غالب کا ہر خط ان کی شخصیت کے کسی نہ کسی پہلو کی ترجمانی کرتا ہے زندگی کی معمولی سے معمولی باتوں کو اکثر اس انداز سے پیش کیا ہے جیسے زندگی کے بڑے بڑے حقائق انہیں معمولی باتوں کی کھلی چھپی یا بدلی ہوئی شکلیں ہوں، جن کو ہنسی خوشی انگیز کرنے اور کرتے رہنے میں انسان کی بڑی جیت ہے.... وہ اپنے اشعار سے زیادہ اپنے خطوط میں ہم سے قریب معلوم ہوتے ہیں۔ اشعار میں وہ کبھی کبھی ہم سے دُور بہت دُور نظر آتے ہیں۔ خطوط میں نزدیک سے نزدیک تر۔ کبھی کبھی ہم ان کے خطوط سے جتنا متاثر ہوتے ہیں، اتنا ان کے اشعار سے نہیں.... غالب کے خطوط ان کے اشعار سے زیادہ گھر کے بھیدی ہیں۔''

(غالب کی شخصیت اور شاعری، ص ۲۸، ۲۷، ۲۶)

بلاشبہ غالب کے خطوط گھر کے بھیدی ہیں۔ خط بالکل ذاتی تحریر ہے۔ بہت سی باتیں خطوط میں ایسی قلمبند کی جاتی ہیں جن کا صرف مکتوب الیہ تک پہنچانا مقصود ہوتا ہے۔ غالب کے خطوط سے ان کے ذاتی حالات منکشف ہوتے ہیں وہ اپنے خطوط میں اپنے عزیزوں اور دوستوں کو جو دل پر گزرتی ہے۔ رقم کر دیتے ہیں۔ زندگی کے نشیب وفراز کا اور نامرادیوں کا مفصل اظہار ان کے خطوط میں موجود ہے۔ وہ اپنے غم کو چھپاتے نہیں، ہر بہی خواہ کو بے جھجک اپنا دکھڑا سنا دیتے ہیں، یہاں تک کہ بعض دوستوں کو غلّہ کی گرانی یعنی دال آٹے تک کا بھاؤ لکھ دیتے ہیں۔

غالب اپنے دوستوں یا شاگردوں کو نہایت بے تکلفی سے تفصیلی خط لکھتے

ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی تباہی کے علاوہ دلّی اور دلّی والوں پر یکے بعد دیگر کئی مصیبتیں نازل ہوتی ہیں۔ ان کا ذکر غالب نے ایک خط میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''پانچ لشکر کا حملہ پے در پے اس شہر پر ہوا۔ پہلا باغیوں کا لشکر، اس میں اہل شہر کا اعتبار لُٹا، دوسرا خاکیوں کا اس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکیں زمین و آسمان و آثار ہستی سراسر لٹ گئے، تیسرا لشکر کال کا، اس میں ہزار ہا آدمی بھوکے مرے۔ چوتھا لشکر ہیضے کا، اس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے، پانچواں لشکر تپ کا اس میں تاب وطاقت نہ پائی''

غالب کا بیان نہ تاریخ ہے اور نہ اخبار کی خبر، لیکن ان کی تحریر سے ہمیں ان کے عہد کے تمام حالات کا علم ہو جاتا ہے۔ وہ داستان گو کی طرح سب کچھ دلچسپ انداز میں بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ غالب کی مرقع کشی کی مثالیں بے شمار ہیں، اس مختصر سے مقالے میں سب کا بیان کرنا ناممکن ہے۔ ان کا ایک ایک جملہ مکمل تصویر کی حیثیت رکھتا ہے۔ لفظی تصویر اصل تصویر کی بہ نسبت زیادہ تفصیل پیش کرتی ہے۔ الفاظ سے منظر بھی نمایاں ہو جاتا ہے اور احساس کو بھی بیدار کیا جا سکتا ہے۔ غالب مکاتیب کو تحریر نہیں مکالمہ سمجھتے ہیں ایسا مکالمہ، ایسا بیان جو تصویر کشی کرتا ہے۔ جس طرح نظیر اکبر آبادی نے موسموں کی منظر کشی کی ہے، اسی دلچسپ انداز میں مکاتیب غالب میں موسموں کا حال موجود ہے۔ ایک خط میں گرمی کا بیان یوں کرتے ہیں:

> ''کوٹھری میں بیٹھا ہوں، ٹٹی لگی ہوئی ہے۔ ہوا آ رہی ہے، پانی کا جھجھر دھرا ہے۔ حقہ پی رہا ہوں۔ یہ خط لکھ رہا ہوں۔''

موسمِ سرما سے متعلق انتہائی پُر معنی جملہ تحریر کیا ہے:

''جاڑا پڑ رہا ہے، تو انگر غرور سے، مفلس سردی سے اکڑ رہا ہے''

(خطوط غالب، ص ۳۷۷، بنام حکیم نجف خاں)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''صبح کا وقت ہے، جاڑا خوب پڑ رہا ہے، انگیٹھی سامنے رکھی ہے۔ دو حرف لکھتا ہوں، ہاتھ تاپتا جاتا ہوں۔ آگ میں گرمی سہی، مگر ہائے وہ آتشِ سیال کہاں کہ جب دو جرعے پی لیے، فوراً رگ و پے میں دوڑ گئی، دل توانا ہو گیا، دماغ روشن ہو گیا، نفس ناطقہ کو تواجد بہم پہنچا۔ ساقی کوثر کا بندہ اور تشنہ لب! ہائے غضب! ہائے غضب!

(خطوط غالب، ص ۲۸۶، بنام میر مہدی)

غالب کے خطوط میں برسات کی منظر کی مرقع کشی انتہائی دلچسپ انداز میں کی گئی ہے۔ پوری تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ برسات کا ذکر غالب نے کئی خطوط میں کیا ہے۔ غالب کرایے کی حویلی میں رہتے تھے، جس کی حالت بہتر نہیں تھی، ۲۸ رجولائی ۱۸۶۲ء کو نواب علاء الدین خاں علائی کو لکھتے ہیں:

''میاں میں بڑی مصیبت میں ہوں۔ محل سرا کی دیواریں گر گئی ہیں۔ پاخانہ ڈھ گیا۔ چھتیں ٹپک رہی ہیں۔ تمہاری پھوپی کہتی ہیں: ہائے دبی، ہائے مری۔ دیوان خانہ کا حال محلسرا سے بد تر ہے۔ میں مرنے سے

نہیں ڈرتا، فقدانِ راحت سے گھبراتا ہوں۔ چھت چھلنی
ہے۔ ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔"

(خطوط غالب، ص ۸۱)

غالب کے مکان کی حالت بہتر نہیں ہوئی۔ دو سال بعد مرزا ہر گوپال تفتہ کے نام ایک خط میں برسات کی کیفیت کی مرقع کشی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"جولائی سے مینہ شروع ہوا، شہر میں سینکڑوں مکان
گرے اور مینہ کی نئی صورت۔ دن میں دو چار بار
برسے، ہر بار اس زور سے کہ ندی نالے بہہ نکلیں۔
بالاخانے کا جو دالان میرے اٹھنے، بیٹھنے، سونے،
جاگنے، جینے، مرنے کا محل ہے، اگرچہ گرا نہیں لیکن
چھت چھلنی ہو گئی۔ کہیں لگن، کہیں چلمچی، کہیں اُگالدان
رکھ دیا۔ قلمدان توشے خانے کی کوٹھری میں دیے۔
مالک مرمت کی طرف متوجہ نہیں۔ کشتی نوح میں تین
دن رہنے کا اتفاق ہوا"

(خطوط غالب، ص ۱۹۸)

برسات میں جو حال ٹپکنے والے گھروں کا ہوتا ہے اس کی پوری تصویر مذکورہ خط سے سامنے آجاتی ہے۔ جس طرح غالب کے خطوط میں انگریزوں کے ہاتھوں دلّی کی تباہی کا جگہ جگہ ذکر ہے، اسی طرح بار بار انہوں نے مختلف خطوط میں برسات کی تباہی کا نقشہ کھینچا ہے۔ غالب برسات کی تباہی کو کالوں اور گوروں کے ہنگامے سے کم نہیں سمجھتے۔ برسات میں مکانوں کا گرنا، آدمیوں کا دب کر مرنا، گلی کوچوں میں پانی کا بہنا، چوروں کا فعال ہو جانا، سب کچھ غالب تحریر میں لے آتے ہیں۔ ایک اور خط میں

میر مہدی کو لکھتے ہیں:

''برسات کا حال نہ پوچھو، خدا کا قہر ہے۔ قاسم خاں کی گلی، سعادت خاں کی نہر ہے میں جس مکان میں رہتا ہوں، عالم بیگ خاں کے کٹہرے کی طرف کا دروازہ گر گیا۔ مسجد کی طرف کو جاتے ہوئے جو دروازہ تھا، گر گیا، سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔ صبح کے بیٹھنے کا حجرہ جھک رہا ہے، چھتیں چھلنی ہو گئی ہیں، مینہ گھڑی برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے، کتابیں، قلمدان سب توشے خانے میں۔ فرش پر کہیں لگن رکھا ہوا، کہیں چلمچی دھری ہوئی۔ خط لکھوں کہاں بیٹھ کر؟'' (خطوط غالب، ص۳۰۴)

غالب اس انداز سے کسی بھی منظر کو الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں کہ وہ محض خبر نہیں رہتی بلکہ طنز و مزاح کی تحریر کی خوبصورت مثال بن جاتی ہے۔ غالب سنجیدہ سے سنجیدہ بات کو غیر سنجیدگی سے بیان کرتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی تباہی کا بیان ہو یا برسات کا، کسی کے باپ کی موت کا ذکر ہو یا کسی کے بیٹے یا بیوی کے انتقال کا نا قابلِ برداشت حادثہ، اس انداز سے اظہارِ تعزیت کرتے ہیں کہ مکتوب الیہ کچھ دیر کے لیے ہی سہی غم بھول کر تحریر سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ لفظی مرقع کشی میں غالب کو مہارت حاصل ہے۔ وہ اپنے بڑھاپے کی تصویر بھی لفظوں میں بیان کر دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''بوڑھا، اپاہج، پورا بہرہ، آدھا اندھا، دن رات پڑا رہتا ہوں، حاجتی پلنگ کے تلے دھری رہتی ہے، تشت، چوکی پلنگ کے پاس لگا رہتا ہے، سو تشت چوکی پر

تیسرے چوتھے دن اتفاق جانے کا ہوتا ہے" (خطوط غالب، ص ۴۵۰، بنام میاں داد خاں سیاح)

مکاتیب غالب سے نہ صرف غالب کی ظاہری اور باطنی تصویر ابھر آتی ہے بلکہ زندگی کے مختلف حالات، واقعات یعنی مکمل سوانح ترتیب دی جا سکتی ہے، یہ واقعہ ہے کہ اگر غالب کے خطوط منظر عام پر نہ آتے تو ان کے بارے میں بہت سی باتوں کا علم نہیں ہوتا اور نہ ان کے عہد سے متعلق اس قدر تفصیل سامنے آتی۔ غالب نے جس قدر بھی اپنے عہد کی مرقع کشی اپنے خطوط میں کی ہے، وہ اس عہد کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ انہوں نے کم الفاظ میں زیادہ مطلب بیان کر کے اپنے عہد کو زندہ جاوید کر دیا ہے۔

مشیر احمد

غالب کے خطوط میں معاشرتی عناصر

غالب کی عظمت اگر چہ ان کی شاعری کی وجہ سے ہے لیکن ان کی نثری تحریروں میں خطوط کا سرمایہ بھی گراں قدر ہے اور اردو نثر کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے یہ خطوط اگر ایک طرف ان کی شخصیت کی نمائندگی کرتے ہیں تو دوسری طرف تاریخی، سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کے آئینہ دار بھی ہیں مزید یہ کہ غالب کے مخصوص اسلوب کی وجہ سے ان کے خطوط اور بھی دلچسپ ہو جاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں فکر کا عنصر، تخیل کی کارفرمائی اور فلسفیانہ رنگ غالب ہے جب کہ خطوط میں وہ بے تکلف باتیں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ عام طور پر خطوط خیر و عافیت دریافت کرنے یا اپنی خیریت سے مکتوب الیہ کو باخبر کرنے کے لیے لکھے جاتے ہیں، لیکن غالب نے اس میں جدت پیدا کی ان کے خطوط میں ادبی، علمی اور لغوی مباحث کی کثرت ہے۔ انہوں نے اپنے معاصرین کا ذکر بھی بہت اہتمام سے کیا ہے۔ شعرا کے کلام پر رائے اور مشکل اشعار کی تشریح ان کے خطوط میں بکثرت موجود ہے۔

اس کے علاوہ ان کے خطوط سے اپنے زمانے کی تہذیب و معاشرت کی عکاسی بھی ہوتی ہے جس سے اُس دور کی معاشرت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس مضمون میں ان معاشرتی امور کے بعض اہم پہلوؤں کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

وقت کی تحدید کے پیش نظر ''غالب کے خطوط'' جلد اوّل مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم جس میں تفتہ اور علائی کے نام خطوط شامل ہیں انہی کو بنیاد بنا کر عہدِ غالب کی معاشرتی زندگی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ عہدِ غالب میں ڈاک کے نظام کی تفصیلات کو مضمون میں شامل نہیں کیا گیا ہے کیوں کہ اس پر ایک مفصل اور جامع مضمون ''پروفیسر حنیف نقوی صاحب کا'' پہلے ہی شائع ہو چکا ہے اگرچہ یہ بھی عہدِ غالب میں معاشرتی صورتِ حال کا اہم پہلو ہے۔

کسی بھی ادیب یا شاعر کی تخلیقات میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس دور کی معاشرت کسی نہ کسی شکل میں موجود ہوتی ہے۔ بسا اوقات وہ اپنے خیالات کو اپنے ہی گرد و پیش کی چیزوں سے متاثر ہو کر اپنی تحریر میں ظاہر کرتا ہے اس طرح اس کی تخلیق میں زمانہ کا رنگ بھی شامل ہو جاتا ہے۔ یہ خوبی غالب کے خطوط میں بھی ہے۔ اس میں جا بجا معاشرتی رنگ بکھرا ہوا ہے۔ ان کے خطوط کے مطالعے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم غالب ہی کے زمانے میں زندگی گذار رہے ہیں۔

سب سے پہلے خطوط غالب میں امرا و شرفا کی معاشرت پر نظر ڈالتے ہیں کہ عہدِ غالب میں ان کے طور طریقے کیا تھے۔ اُس معاشرت میں شرفا کی زندگی عوام سے مختلف تھی۔ ان کے رہنے سہنے، ملنے جلنے اور اٹھنے بیٹھنے کا انداز جدا تھا۔ ایک عام طریقہ یہ تھا کہ اگر کوئی عالی مرتبت شخص ان کے یہاں ملنے آتا تھا تو میزبان کا فرض تھا کہ وہ باز دید کو جاتا اور اگر اسے کوئی عذر در پیش ہوتا تو وہ اپنے کسی آدمی کے ذریعے سے اس کی مزاج پُرسی کرتا۔ اس طرح کا ایک واقعہ غالب کے ساتھ بھی پیش آیا۔

رائے امید سنگھ بہادر جو سکریٹری مغربی وشمالی کے دفتر میں فارسی کے ترجمان اور مترجم ہونے کے علاوہ فارسی اور اردو میں اچھی استعداد رکھتے تھے جب غالب کے یہاں تشریف لائے تو غالب اپنی بیماری کی وجہ سے ان کی بازدید کو نہیں جاسکے۔ اس کا ذکر انہوں نے تفتہ کے نام خط میں اس طرح کیا ہے:

''بہر حال، میرے پھوڑے نکل رہے ہیں۔ میں بازدید کو نہیں گیا۔'' (ص ۳۱۴)

اسی طرح جب کوئی شخص کسی کے یہاں جاتا تو جانے سے قبل اپنے آنے کی اطلاع دے دیتا تھا اگر کبھی بغیر بتائے کوئی شخص کسی کے یہاں چلا جاتا تو یہ بات خلاف معمول ہوتی۔ اس کی مثال بھی غالب کے خطوط میں ملتی ہے یہ واقعہ بھی راجا امید سنگھ ہی کے ساتھ پیش آیا کہ وہ اچانک غالب کے یہاں تشریف لائے۔ چنانچہ تفتہ کو لکھتے ہیں:

''آج چوتھا دن ہے یعنی منگل کے دن، کوئی پہر دن چڑھا ہوگا کہ راجا امید سنگھ بہادر ناگاہ میرے گھر تشریف لائے۔'' (ص ۳۱۳)

اُس عہد کے آداب معاشرت میں ایک بات یہ بھی تھی کہ شرفا کو اپنی عزت وآبرو کا بہت پاس رہتا تھا، کوئی ایسی بات جو اُن کے یا اہل خانہ کے شایانِ شان نہ ہو اس سے احتراز کرتے تھے۔ مثال کے طور پر وہ بازار میں یا سرِ راہ گفتگو کرنے کو معیوب سمجھتے تھے، ان کے یہاں کی نوکرانیاں بھی اگر راستے میں کسی سے ہم کلام ہوتی تو اسے بھی عیب سمجھا جاتا۔ غالب کی ایک نوکرانی بی وفادار تھی اس سے متعلق علائی کو نہایت دلچسپ پیرائے میں لکھتے ہیں:

''بی وفادار، جن کو تم کچھ اور بھائی خوب جانتے ہیں۔

اب تمہاری پھوپھی نے انہیں وفادار بیگ بنادیا ہے۔
باہر نکلتی ہیں، سودا تو کیا لائیں گی مگر خلیق اور ملنسار ہیں۔
رستہ چلتوں سے باتیں کرتی پھرتی ہیں۔" (ص ۳۹۹)

اسی ضمن میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس عہد میں حفظ مراتب کا بہت خیال رکھا جاتا تھا۔ اگر کوئی عمر میں چھوٹا ہے تو اسے دعا دینے کا رواج تھا، اگر کوئی برابر عمر کا ہے یا دوست ہے تو اس کے لیے سلام تھا اور استاد کے لیے بندگی کہی جاتی، اگر کوئی سیّد ہوتا تو اس کے لیے لفظِ درود تھا۔ غالباً سید کے لیے درود کا لفظ صرف غالب کے یہاں ہی استعمال ہوا ہے کسی اور ادیب کے یہاں یہ لفظ اس مفہوم میں استعمال نہیں ہوا۔ ان تمام مراتب کا ذکر مجموعی طور پر غالب نے علائی کے نام اپنے ایک خط میں کیا ہے اور یہ استاد میر جان کے لیے لکھا ہے جو دور کے عزیز بھی تھے اور غالب کا ان سے چھیڑ چھاڑ کا رشتہ تھا۔ انداز بیان ملاحظہ ہو:

"استاد میر جان کو اس راہ سے کہ میری پھوپھی ان کی چچی تھیں اور یہ مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں دعا، اور اس رُو سے کہ دوست ہیں اور دوستی میں کم و بیشی سن و سال کی رعایت نہیں کرتے سلام اور اس سبب سے کہ استاد کہلاتے ہیں بندگی اور اِس نظر سے کہ یہ سیّد ہیں درود۔" (ص ۳۷۹)

غالب کا مقصود یہ تھا کہ وہ جو چاہیں قبول کرلیں۔

مراتب سے ہی ملتی جلتی اُس دور میں ایک چیز خطاب بھی تھی۔ مغلیہ سلطنت میں خطابات کا طریقہ مختلف تھا اور خطابات الگ الگ نام سے دیے جاتے تھے۔ غالب کے خطوط میں تین طرح کے خطابات کا ذکر ملتا ہے۔ اوّل تو "خانی" کا خطاب

تھا جسے کم درجہ کا سمجھا جاتا تھا اور اس کی اہمیت بھی کم تھی۔ دوسرا مرتبہ ''بہادری'' کا ہوتا تھا یہ ''خانی'' سے اعلا تھا۔ تیسرا درجہ دونوں میں افضل اور سب سے بڑھا ہوا تھا یعنی ''دولگی'' کا خطاب۔ غالب نے ان تینوں خطابات کو اپنے مخصوص انداز بیان میں اس طرح یکجا کیا ہے۔ تفتہ کو لکھتے ہیں:

> ''مثلاً ایک شخص کا نام ہے: ''میر محمد علی'' یا ''شیخ محمد علی'' یا ''محمد علی بیگ'' اور اس کو خاندانی بھی ''خانی'' نہیں حاصل۔ پس جب اس کو بادشاہِ وقت ''محمد علی خاں'' کہہ دے تو گویا اس کو ''خانی'' کا خطاب ملا اور جو شخص کہ اس کا نامِ اصلی ''محمد علی خاں'' ہے یا وہ قوم افغان سے ہے یا ''خانی'' اس کی خاندانی ہے۔ بادشاہ نے اس کو ''محمد علی خاں بہادر'' کہا۔ پس یہ خطاب ''بہادری'' کا ہے۔ اِس کو ''بہادری'' کا خطاب کہتے ہیں اس سے بڑھ کر خطاب ''دولگی'' کا ہے۔ یعنی مثلاً ''محمد علی خاں بہادر''، اس کو منیر الدولہ محمد علی خاں بہادر'' کہا۔ اب یہ خطاب ''دولگی'' کا ہوا۔'' (ص ۲۳۸)

یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ خطاب آخر کس کو دیے جاتے تھے اس کی وضاحت بھی غالب کے خطوط میں ملتی ہے۔ عہدِ مغلیہ میں ''خطاب'' سلاطین کی طرف سے امراء کو دیے جاتے تھے اور ایک رواج ''عرف'' کا بھی تھا یعنی لڑکوں کا پیار سے کوئی نام رکھا جاتا تھا۔ 'خطاب' اور عرف سے متعلق غالب تفتہ کو تحریر کرتے ہیں:

> ''ایک تو خطاب'' کہ جو سلاطین، امرا کو دیں، اور دوسرے وہ نام جو لڑکوں کا پیار سے رکھیں، یعنی

"عرف"۔" (ص ۲۹۸)

جس طرح خطابات سلاطین کی طرف سے امرا کو دیے جاتے تھے اسی طرح اہل دولت وثروت بھی شعراء وادبا کو ان کی بہتر کارکردگی پر انعام واکرام سے نوازتے تھے۔ اگر کوئی صاحب استطاعت اپنے لڑکے کی تاریخ ولادت کسی شاعر سے لکھواتا تو اس کے بدلے میں اسے انعام دیتا تھا، اسی طرح اگر کوئی کسی شاعر کی شاگردگی اختیار کرتا تو وہ اپنے استاد کو بطور شاگردی کچھ نذرانہ پیش کرتا۔ مثال کے طور پر جانی بانکے لال جی رند (جنہیں غالب بقول غلام رسول مہر اپنے خطوط میں بابو صاحب کے نام سے یاد کرتے تھے، یہ راجا بھرت پور کے وکیل تھے اور غالباً جے پور سے کچھ تعلق تھا) نے غالب کے پاس سو روپیہ کی رقم نذرانہ کیطور پر بہ طریق شاگردی بھیجی تھی، اسی طرح راجہ بھرت پور نے میر احمد حسین میکش سے کنور صاحب کی تاریخ تولد لکھوائی تھی اس کے لیے بھی سو روپیہ کی رقم غالب کو ارسال کی گئی تھی، ان دونوں کی اطلاع غالب نے تفتہ کو اس طرح دی:

> "بابو صاحب نے پہلی بار تو مجھ کو دو ہنڈیاں بھیجی ہیں سو سو روپے۔ ایک میر احمد حسین میکش کے واسطے، راجا صاحب کی طرف سے، تاریخ تولد کنور صاحب کے انعام میں اور ایک اپنی طرف سے مجھ کو، بہ طریقِ نذرِ شاگردی"۔ (ص ۲۵۶)

انعام واکرام سے مماثلت رکھتی ہوئی ایک چیز دربار وخلعت بھی ہوتی تھی۔ عام طور پر دربار سے ہی انعام واکرام دیا جاتا تھا اس وجہ سے اس کا ذکر بھی موزوں معلوم ہوتا ہے۔ جب مغلیہ عہد ختم ہوا اور انگریز ہندوستان پر قابض ہوگئے تو انہوں نے بھی مغلیہ سلطنت کی پیروی میں اپنے یہاں دربار لگانے شروع کیے۔ ان کے دربار کا انداز

قدرے مختلف تھا، صوبے کے حاکموں کا دربار الگ لگتا تھا اور گورنر جنرل اور لفٹنٹ گورنر کا دربار جدا ہوتا تھا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ یہ دربار مختلف علاقوں میں ہوتا، ضروری نہیں تھا کہ جہاں دارالحکومت ہو یا حاکم کا قیام ہو وہیں دربار لگے بلکہ مختلف مقامات پر ان کے دورے ہوتے تھے اور انہیں جگہوں پر دربار بھی لگتا تھا اور وہیں خلعت وغیرہ تقسیم ہوتی تھی۔ غالب نے ۴ / مارچ ۱۸۶۳ء کے ایک خط میں تفتہؔ کو لکھا کہ انہیں نواب گورنر جنرل کی سرکار سے دربار میں خلعت ملتا تھا لیکن لارڈ کیننگ صاحب کا جب دور آیا تو انہوں نے یہ سلسلہ بند کر دیا۔ اتفاق سے ایک دن لفٹنٹ گورنر پنجاب، دہلی آئے انہوں نے غالب سے کہا کہ لارڈ صاحب دلّی میں دربار نہ کریں گے بلکہ میرٹھ اور اس سے متعلق علاقہ داروں اور مال گذاروں کا دربار کرتے ہوئے انبالہ جائیں گے اور دلّی کے لوگوں کا دربار بھی وہیں ہوگا۔ انہوں نے غالب سے کہا کہ تم بھی انبالہ جاؤ اور دربار میں شریک ہو کر خلعت لے آؤ۔ یہ سن کر غالب کو بہت خوشی ہوئی اور حسب دستور ایک قصیدہ لکھا اور وہاں جانے کی تدبیر کرنے لگے۔ غالب لفٹنٹ گورنر کا قول نقل کرتے ہوئے تفتہؔ کو تحریر کرتے ہیں:

> "لارڈ صاحب دلّی میں دربار نہ کریں گے، میرٹھ ہوتے ہوئے اور میرٹھ میں ان اضلاع کے علاقہ داروں اور مال گذاروں کا دربار کرتے ہوئے، انبالے جائیں گے؛ دلّی کے لوگوں کا دربار وہاں ہوگا۔ تم بھی انبالے جاؤ، شریکِ دربار ہو کر خلعتِ معمولی لے آؤ۔"
> (ص ۳۳۹)

عہدِ غالب میں غربا و مساکین کا بھی بہت خیال رکھا جاتا تھا۔ اہل ثروت ان کے لیے وجہ معاش مقرر کر دیتے تھے اور ان سے دعائے خیر کے طالب رہتے۔ غالب نے

ظرافت کے انداز میں اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا ہے۔ پیرایۂ بیان بھی منفرد ہے۔ غالب کو رام پور سے کچھ وظیفہ مقرر تھا اور حسب عادت وقت مقررہ پر پہنچ جایا کرتا تھا۔ غالب نے اپنے مخصوص انداز میں اس وظیفے کی کیفیت تحریر کی ہے۔ غالب کا یہ خط ان کی شگفتہ مزاجی کی عمدہ مثال ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''رئیس کی طرف سے بہ طریق وکیل محکمۂ کمشنری میں معین نہیں ہوں۔ جس طرح امرا واسطے فقرا کے وجہ معاش مقرر کر دیتے ہیں، اسی طرح اُس سرکار سے میرے واسطے مقرر ہے۔ ہاں فقیر سے دعائے خیر اور مجھ سے اصلاحِ نظم مطلوب ہے۔ چاہوں دلّی رہوں، چاہوں اکبرآباد، چاہوں لاہور، چاہوں لوہارو''۔ (ص ۳۷۶)

یہ بات غالب نے اس وقت لکھی جب نواب علاء الدین خاں علائیؔ نے ان کو لوہارو آنے کی دعوت دی اور غالب کسی مجبوری کی وجہ سے نہ جاسکے اس پر غالباً علائی نے طنز کیا کہ رام پور کا وظیفہ مانع ہے اگر چلے آئیں گے تو رام پور سے وظیفہ ملنا بند ہو جائے گا۔ اس پر غالب نے جھنجھلاہٹ کے انداز میں علائی کو خط لکھا اور صورتِ حال کی وضاحت فرمائی۔

عہدِ غالب میں تفنّنِ طبع کی خاطر رقص و سرور کی محفلیں بھی آراستہ کی جاتی تھیں اور ناچ گانے کا عام رواج تھا۔ عوام کے علاوہ امرا و نوابین بھی اس میں دلچسپی لیتے تھے۔ نوابین اپنی پسند کے شعرا کا کلام کسی قوال یا گویے سے پڑھوا کر سنتے تھے چنانچہ غالب کے سسرالی رشتے کے ایک صاحب نواب امین الدین احمد خاں جو رشتے کے بھائی تھے انہیں غالب کا کلام بے حد پسند تھا وہ غالب سے اچھے اور تازہ کلام کی

وقتاً فوقتاً فرمائش کیا کرتے تھے اس سے ان کے اور اس معاشرت میں لوگوں کے ذوق کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ غزلوں میں فارسی اور اردو دونوں کلام شامل ہوتا تھا۔ مثلاً غالب علائی کو لکھتے ہیں:

> ''گانے میں غزل کے سات شعر کافی ہوتے ہیں۔ دو فارسی غزلیں دو اردو غزلیں اپنے حافظے کی تحویل میں سے بھیجتا ہوں، بھائی صاحب کی نذر''۔ (ص ۳۷۲)

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ مُطرب مختلف شعراء کے کلام کو خلط ملط کر کے گاتے تھے جس کا سب سے بڑا نقصان یہ تھا کہ اچھے اور برے کلام کا امتیاز ختم ہو جاتا تھا۔ غالب کے ساتھ بھی اس طرح کا ایک معاملہ پیش آیا کہ ان کا مقطع اور بیت الغزل کسی دوسری غزل میں شامل کر کے مُطرب نے اپنے طور پر ایک غزل بنالی۔ شاعر کی زندگی میں بھی اس طرح کی باتیں پیش آجاتی تھیں اور مرنے کے بعد تو لازمی تھا ہی۔ ان دونوں صورتوں کا خوبصورت امتزاج غالب کے خط سے ملاحظہ ہو۔ علائی کو تحریر کرتے ہیں:

> ''جب شاعر کی زندگی میں گانے والے، شاعر کے کلام کو مسخ کر دیں تو کیا بعید ہے کہ وہ شاعر متوفی کے کلام میں مُطربوں نے خلط کر دیا ہو''۔ (ص ۳۹۵)

اسی خط میں ایک جگہ اور لکھتے ہیں:

> ''اب میں دیکھتا ہوں کہ مطلع اور چار شعر کسی نے لکھ کر اُس مقطع اور اس بیت الغزل کو شامل اُن اشعار کے کر کے، غزل بنالی ہے اور اس کو لوگ گاتے پھرتے ہیں مقطع اور ایک شعر میرا اور پانچ شعر کسی الو کے''۔ (ص ۳۹۵)

غالب کے خطوط میں مُطرب اور گویّے کے علاوہ بعض دوسرے پیشے کے لوگوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اُس معاشرت میں حقّہ کا استعمال خاص طور پر امرا و شرفا کے یہاں ہوتا تھا۔ باقاعدہ طور پر حقّہ کی نلیاں بنانے والے پیشہ ور بھی بازار میں موجود تھے جنہیں نیچہ بند کہا جاتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد دہلی سے ان کا وجود ختم ہو چکا تھا۔ غالب نے ایک خط میں ضمناً اس کا ذکر کیا ہے۔ تفتہ نے غالباً لکھا ہوگا کہ دستنبو کی جلد سازی اور نقاشی دلی میں ہو جائے گی اس پر غالب نے ستمبر ۱۸۵۸ء میں تفتہ کو لکھا:

> ''مرزا تفتہ! تم بڑے بے درد ہو، دلی کی تباہی پر تم کو رحم نہیں آتا بلکہ تم اُس کو آباد جانتے ہو۔ یہاں نیچہ بند تو میسر نہیں، صحاف اور نقاش کہاں!''۔ (ص ۲۸۹)

بازاری پیشہ وروں میں ایک پیشہ بھاٹ کا بھی تھا جو گیت سناتا اور دَر دَر جا کر اور جھوٹی تعریف کر کے لوگوں سے پیسے وصول کرتا۔ بھاٹ کی صفت خوشامد ہے اسی خوشامد کا ذکر غالب نے کیا ہے لیکن اپنی ذات کے لیے۔ علائی نے حسبِ عادت ان سے تازہ کلام کی فرمائش کی اس پر غالب نے طنزیہ پیرایہ میں علائی کو ۲ر جولائی ۱۸۶۰ء میں لکھا:

> ''اشعارِ تازہ مانگتے ہو، کہاں سے لاؤں؟ عاشقانہ اشعار سے مجھ کو وہ بُعد ہے جو ایمان سے کفر کو۔ گورمنٹ کا بھاٹ تھا، بھٹئی کرتا تھا، خلعت پاتا تھا۔ خلعت موقوف، بھٹئی متروک۔'' (ص ۳۶۶)

بازار میں ہی پھیری والے ہوتے تھے اور وہ کتابیں لے کر گھومتے رہتے، اہلِ ذوق ان سے خریدتے۔ غالب کے بعض خطوط سے اس عہد میں کتابوں کی خرید و فروخت

سے متعلق اہم باتوں کا علم ہوتا ہے۔ تفتہ کو لکھتے ہیں:

"دوپہر کو رضی الدین نیشاپوری کا کلام ایک شخص بیچتا ہوا لایا۔ میں تو کتاب کو دیکھ لیتا ہوں، مول نہیں لیتا۔" (ص ۲۸۳)

بازار سے متعلق افراد کے علاوہ درونِ خانہ سے متعلق مختلف پیشوں کے لوگوں کی تفصیلات بھی غالب کے خطوط میں موجود ہیں۔ عہدِ غالب میں ایک ہرکارہ بھی ہوتا تھا جو چھوٹے موٹے کام کے لیے عام طور پر گھروں میں رکھا جاتا تھا۔ لفظ ہرکارہ سے ظاہر ہے کہ ایسا شخص جو ہر کام پر تیار ہو جائے۔ غالب کے پاس بھی شاید اس طرح کا کوئی ہرکارہ تھا اور اس سے وہ ذاتی کام لیا کرتے تھے۔ تفتہ کو لکھتے ہیں:

"تمہارا دیوان بہ طریق پارسل میرے پاس آیا۔ میں نے ہرکارے کو راجا امید سنگھ بہادر کے گھر کا پتا بتا کر وہاں بھجوا دیا"۔ (ص ۳۱۲)

اسی سے ملتا جلتا ایک پیشہ کہار کا بھی تھا یہ ایک ایک خدمتی فرقہ ہے جس کا کام پانی بھرنا، ڈولی یا پالکی اٹھا کر چلنا وغیرہ ہے، اسے بھی گھروں کے اندر رکھا جاتا تھا جو مختلف کاموں کے علاوہ سفر میں ساتھ ساتھ رہتا۔ کہار بازاروں میں کرایہ پر بھی ملتے تھے اور ان کا ٹھیکہ بھی ہوتا تھا۔ غالب ایک جگہ علائی کو لکھتے ہیں:

"بھائی سچ تو یوں ہے کہ ان دنوں میں میرے پاس ٹکٹ نہیں اگر بیرنگ بھیجوں تو کہار ماندہ، اٹھ نہیں سکتا۔ ڈاک گھر تک جائے کون؟"۔ (ص ۳۶۵)

علائی نے جب غالب کو لوہارو آنے کی دعوت دی، اس سفر کے لوازمات کے سلسلے میں علائی کو لکھتے ہیں جس میں کہار کا ذکر کیا ہے:

"ایک گاڑی کپڑوں کے واسطے کرایہ کروں..... آٹھ کہار ٹھیکے کے لوں"۔ (ص ۳۷۶)

گھروں کے اندر نوکرانیاں بھی ہوتی تھیں اور وہ نوکرانیاں مختلف کاموں کی مناسبت سے مختلف ناموں سے جانی جاتی تھیں مثلاً لونڈی جو متعدد کام کرتی، دوسری کاچھن یعنی مالی یہ گھر کی تزئین کاری میں مصروف رہتی، تیلن اور تنبولن جن کا کام تیل اور پان بیچنا ہوتا تھا ان کو بھی گھروں کے اندر رکھا جاتا تھا، ایک پنسہاری جو آٹا پینے کے کام پر مامور ہوتی تھی۔ ان پیشہ وروں اور خادماؤں سے بھی اس دور کی معاشرت کی تصویر سامنے آتی ہے۔ غالب نے ان تمام نوکرانیوں کا ذکر اپنی اس حویلی کے لیے کیا ہے جو علائی کے توسط سے غالب کو ملی تھی۔ علائی کو لکھتے ہیں:

"یہ سمجھ کر خلوت خانے کو محل سرا بنایا چاہتا تھا کہ گاڑی، ڈولی، لونڈی، اصیل، کاچھن، تیلن، تنبولن، کہاری، پنسہاری، ان فرقوں کا مَمَر وہ دروازہ رہے گا"۔ (ص ۳۹۹)

اندرونِ خانہ سے متعلق ایک پیشہ مولوی کا بھی تھا جو بچوں کو درس دیتا تھا۔ اُس دور کی معاشرت میں یہ بات بھی شامل تھی کہ گھروں کے اندر مکتب کے لیے بھی کوئی جگہ مخصوص ہوتی اور مولوی صاحب مالک کے لڑکوں اور نوکرانیوں کے بچوں کو وہاں پڑھاتے۔ شرفا میں علم کا ذوق تھا ساتھ ہی انہیں نوکرانیوں کی ذمہ داری کا بھی احساس تھا۔ مثال غالب کے خط سے ملاحظہ ہو جس میں غالب نے اپنے اسی مکان (جو علائی کے توسط سے ملا تھا) کے اندرونی حصے کی نوعیت کا ذکر کیا ہے۔ علائی کو لکھتے ہیں:

"معہذا اُس سہ دری کو اپنے آدمیوں کے اور لڑکوں کے مکتب کے لیے ہرگز کافی نہ جانا"۔ (ص ۴۰۰)

عہد غالب میں مکان عام طور پر دو حصوں میں منقسم ہوتا تھا پہلا حصہ دیوان خانہ جس میں مرد رہتے اور دوسرا حصہ محل سرا جو عورتوں کے لیے مخصوص تھا۔ امرا و شرفا کے یہاں کے مکانات بڑی بڑی حویلیوں کی شکل میں ہوتے تھے، نوکرانیوں اور خادماؤں کی ضرورت تو ناگزیر تھی اس لیے ان کے رہنے کے لیے بھی مکان میں علاحدہ انتظام ہوتا، اور ان کی گذرگاہ بھی علاحدہ ہوتی، اس کے علاوہ مکان میں ایک حصہ بالاخانے کے نام سے بھی ہوتا تھا جس میں ایک دالان ہوتا تھا عام طور پر غالب بالاخانے کے دالان میں ہی قیام کرتے تھے اور ایک توشہ خانہ جس میں خانہ داری کے سامان اور لباس وغیرہ رہتا تھا۔

کرایہ کے مکان میں بھی لوگ ان تمام باتوں کی رعایت ملحوظ رکھتے تھے۔ کرایہ کا مکان مشکل سے ملتا تھا گر ملتا بھی تو پسند کے مطابق نہیں ہوتا، کبھی محل سرا ہے تو دیوان خانہ نہیں یا دیوان خانہ ہے تو توشہ خانہ نہیں، دوسرے یہ کے مکان مالک اور کرایہ دار کے مابین آج کی طرح اس وقت بھی جھگڑے ہوا کرتے تھے کبھی تو مکان کی مرمت کے مسئلے پر اور کبھی مکان کو خالی کرانے کے سلسلے میں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ کرایہ دار کو بغیر اطلاع دیے ہوئے مکان مالک مکان بیچ دیتا اس کا خریدار آ کر کرایہ دار کو برا بھلا کہتا یہ تمام تفصیلات خطوط غالب میں موجود ہیں۔ علائی کو تحریر کرتے ہیں:

> ''اب مجھے فکر پڑی کہ کہیں دو حویلیاں قریب ہمد گر ایسی ملیں کہ ایک محل سرا اور ایک دیوان خانہ ہو، نہ ملیں''۔
>
> (ص ۳۶۷)

تفتہ کو لکھتے ہیں:

> ''بالاخانے کا جو دالان میرے بیٹھنے اٹھنے، سونے

جا گئے، جینے مرنے کا محل ہے: اگرچہ گرا نہیں، لیکن
چھت چھلنی ہوگئی۔ کہیں لگن، کہیں چلمچی، کہیں اگالدان
رکھ دیا۔ قلم دان، کتابیں اٹھا کر توشے خانے کی کوٹھری
میں رکھ دیے۔ مالک مرمّت کی طرف متوجہ نہیں''۔
(ص ۳۴۵)

۲۰ر جولائی ۱۸۶۰ء میں تفتہ کو اپنی پریشانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میں دس گیارہ برس سے اس مکان میں رہتا تھا اب اسے مالک نے بیچ دیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''دس گیارہ برس سے اس تنکنا میں رہتا تھا۔ سات برس
تک ماہ بہ ماہ چار روپیہ دیا گیا۔ اب تین برس کا کرایہ کچھ
اوپر سو روپیہ یک مُشت دیا۔ مالک نے مکان بیچ ڈالا
جس نے لیا ہے، اس نے مجھ سے پیام بلکہ ابرام کیا کہ
مکان خالی کردو۔ مکان کہیں ملے تو اٹھوں۔ بے درد
نے مجھ کو عاجز کیا اور مدد لگا دی۔'' (ص ۳۲۴)

نوکرانیوں کی گذرگاہ سے متعلق علائی کو لکھتے ہیں:

''گاڑی، ڈولی، لونڈی، اصیل، کاچھن، تیلن، تنبولن،
کہاری، پسنہاری، ان فرقوں کا ممر وہ دروازہ رہے گا۔
میرے اور میرے بچوں کی آمد و رفت دیوان خانے میں
سے رہے گی''۔ (ص ۳۹۹)

غالب کے زمانے میں جب کوئی سفر پر جاتا تو عموماً کم دوری کا سفر پیدل ہی طے کرتا تھا مگر امرا و شرفا جب سفر کرتے تو ان کے ساتھ بڑے لوازمات ہوتے۔ غالب

نے ایسے ہی ایک سفر کا ذکر کیا ہے۔ علائی نے انہیں لوہارو آنے کی دعوت دی مگر وہ اپنی بیماری اور کمزوری کی وجہ سے لوہارو نہیں جا سکے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علائی نے اصرار کیا اس پر غالب نے اپنی مجبوری علائی کے سامنے اس طرح بیان کی:

> ''ایک گاڑی کپڑوں کے واسطے کرایہ کروں، کپڑوں کے صندوق میں آدھی درجن شراب دھروں، آٹھ کہار ٹھیکے کے لوں، چار آدمی رکھتا ہوں، دو یہاں چھوڑوں، دو ساتھ لو، چل دوں.... گاڑی ہو سکتی ہے، شراب مل سکتی ہے، کہار بہم پہنچ سکتے ہیں۔ طاقت کہاں سے لاؤں؟''۔ (ص ۳۷۶)

سفر میں مختلف قسم کی سواریاں استعمال کی جاتی تھیں مثلاً سانڈنی یعنی سواری کی اونٹنی، اونٹ، ٹٹو اور گاڑیاں۔ ڈاک کی سواریاں بھی معزز اور سربرآوردہ لوگوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی تھیں، اس کے علاوہ پالکی اور ڈولی کا بھی استعمال ہوتا تھا۔ غالب کے ایک خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بارش کے دنوں میں عام طور پر اونٹ اور ٹٹو کا استعمال کم ہوتا تھا، گاڑیاں زیادہ استعمال کی جاتیں۔ مثال کے طور پر ۲۷/جولائی ۱۸۶۲ء کے آس پاس علائی نے غالب کے ایک شاگرد شمشاد علی بیگ رضوان کو لوہارو آنے کی دعوت دی تھی اور وہ برسات کا موسم تھا تو غالب نے اونٹ یا ٹٹو کے بجائے گاڑی سے سفر کرنے کی تجویز رکھی۔ غالب بارش کے ذکر کے بعد رضوان کا قول نقل کرتے ہوئے علائی کو لکھتے ہیں:

> ''مرزا شمشاد علی بیگ کو تمہارا خط پڑھوا دیا۔ انہوں نے کہا کہ غلام حسن خاں کی معیت پر کیا موقوف ہے، مجھے آج سواری مل جائے، کل چل نکلوں۔ اب میں کہتا

ہوں کہ اونٹ ٹٹو کا موسم نہیں، گاڑی کی تدبیر ہو جائے،

بس۔" (ص ۳۹۵)

غالب کے خطوط میں خورد و نوش کی اشیاء کا ذکر بھی اس عہد کی معاشرت کا ایک اہم پہلو واضح کرتا ہے۔ اُس معاشرت میں کھانے کی مختلف چیزیں استعمال ہوتی تھیں۔ خود غالب کے دستر خوان پر متعدد چیزیں ہوتی تھیں۔ خطوط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر مصری بہت پسند کی جاتی تھی۔ غالب کو بیکانیر کی مصری بہت مرغوب تھی۔ اس پس منظر میں غالب کا ایک خط جو علائی کے نام ہے ملاحظہ فرمائیں جس میں کھانے کی مختلف اشیاء کے ساتھ ساتھ مصری کا بھی ذکر آ گیا ہے:

"خصّی بکروں کے گوشت کے قلیے، دو پیازے، پلاؤ، کباب جو کچھ تم کھا رہے ہو، مجھ کو خدا کی قسم اگر اس کا کچھ خیال بھی آیا ہو، خدا کرے بیکانیر کی مصری کا کوئی ٹکڑا تم کو میسر نہ آیا ہو، کبھی یہ تصور کرتا ہوں کہ میر جان صاحب اُس مصری کے ٹکڑے چبا رہے ہوں گے تو یہاں میں رشک سے اپنا کلیجا چابنے لگتا ہوں"۔

(ص ۳۷۹)

اس کے علاوہ اس عہد میں آم، انگور، املی اور کریلے کا ذکر بھی ملتا ہے جو اس دور کی خاص چیزیں ہیں اور جنہیں عام طور پر لوگ کھانے میں استعمال کرتے تھے۔

نشہ آور اشیاء کا استعمال بھی کیا جاتا تھا۔ عہدِ غالب میں افیون کا استعمال خاص طور پر ملتا ہے بالخصوص امرا و نوابین اس کا استعمال کرتے تھے۔ غالب نے نواب امین الدین خاں (جن کا ذکر اوپر گذر چکا ہے) کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ افیون کا استعمال کرتے تھے جس کی وجہ سے وہ مختلف بیماریوں میں مبتلا رہے۔ علائی کے نام

غالب کے خط کا ایک حصہ ملاحظہ ہو:

> ''اب بھائی کے بیان سے یاد آ گیا کہ بارہ تیرہ برس پہلے ایک دن ناگاہ یہ حالت طاری ہوگئی تھی۔ وہ موسم جوانی کا تھا اور حضرت عادی بہ افیون نہ تھے۔''
> (ص ۳۸۲)

عہد غالب میں علاج کا طریقہ دور حاضر سے مختلف تھا۔ اس دور میں مسہل عام طور پر لیا جاتا تھا کبھی ایسا نہیں ہوتا بغیر کسی بیماری کے یوں ہی مسہل لیا جاتا۔ ایسا اتفاق غالب کے ساتھ بھی ہوا انہوں نے بغیر بیماری کے مسہل لیا تو اس کی اطلاع تفتہ کو ان الفاظ میں دیتے ہیں:

> ''میں مسہل میں ہوں، یہ نہ سمجھنا کہ بیمار ہوں۔ حفظ صحت کے واسطے مسہل لیا ہے''۔ (ص ۲۶۶)

علاج کا جو طریقہ اس دور میں رائج تھا آج وہ دیکھنے کو نہیں ملتا مثلاً جونکیں لگوائی جاتی تھیں اور اس سے فاسد خون باہر نکالا جاتا تھا ساتھ ہی دست آور دوا بھی استعمال کرائی جاتی تھی تا کہ معدے کا فساد باہر نکل جائے۔ ایک مرتبہ نواب مصطفیٰ خاں اپنے علاج کے سلسلے میں دلی آئے ہوئے تھے اور انہیں بھی غالباً خون کی ہی کوئی بیماری تھی۔ غالب، تفتہ کو اس کی اطلاع دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''پرسوں سے نواب مصطفیٰ خاں صاحب یہاں آئے ہوئے ہیں ایک ملاقات ان سے ہوئی ہے۔ ابھی یہیں رہیں گے، بیمار ہیں.... فصد ہو چکی ہے، جونکیں لگ چکی ہیں، اب مسہل کی فکر ہے''۔ (ص ۳۴۶)

بیماری اور اس کے علاج ہی کے ضمن میں فن طبابت کا ذکر بھی ضروری ہے عہد غالب

میں حکما کا اثر و رسوخ بہ نسبت ڈاکٹر اور بید کے زیادہ تھا۔ طب یونانی کا عام چلن تھا۔ غالباً ۱۸۵۷ء کی تباہی کے بعد دہلی سے نامور حکیم اور بید گمنام یا گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ حکماء نے دوسری جگہوں پر اپنا ٹھکانہ بنالیا تھا۔

نواب امین الدین خاں ایک مرتبہ بیمار ہوئے تو ان کا علاج دہلی میں حکما کے ذریعے ہو رہا تھا اور طب یونانی کی مختلف دوائیں ان کے لیے تیار کی گئی تھیں۔ علائی کو پریشانی لاحق تھی کہ میرے والد کا علاج بہتر جگہ ہو جائے اس لیے غالب سے بار بار اصرار کر رہے تھے کہ کسی بہتر حکیم کو دکھا دیں۔ غالب، امین الدین خاں کے علاج سے متعلق علائی کو اطلاع دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''حکیم محمود خاں کے طور پر معالجہ قرار پایا ہے۔ یعنی انہوں نے نسخہ لکھ دیا ہے، سو اس کے موافق جُلّوب بن گئی ہیں۔ نقوع کی دوائیں آج آ کر بھیگیں گی''۔
>
> (ص ۳۸۳)

عہد غالب میں میلوں، ٹھیلوں کی کیفیت اور اس کی تفصیلات بھی اس عہد کی معاشرت کو سمجھنے میں بہت مددگار ہیں۔ میلے، ٹھیلے کا رواج تو ہر دور میں رہا ہے کچھ تیوہار تو رسمی ہیں اور کچھ کا تعلق مذہب اور تاریخ سے ہوتا ہے۔ غالب کے زمانہ کا معاشرہ بھی اس سے مختلف نہ تھا مثلاً ان کے خطوط میں ایک جگہ دسہرا اور دیوالی کا ذکر ملتا ہے۔ غالب کی کتاب (دستنبو چھپ رہی تھی انہیں فکر تھی کہ کتاب جلد از جلد چھپ کر آ جائے اس وجہ سے تفتہ کو لکھتے ہیں کہ بھائی منشی نبی بخش صاحب کو کاپی کی تصحیح سے فراغت ہو گئی یا نہیں۔ مرزا حاتم علی صاحب نے جلدیں بندھنے کو دیں یا ابھی نہیں۔ اضطرابی کیفیت میں یہ بھی پوچھتے ہیں کہ میں ان کتابوں کا آنا کب تک تصور کروں، دسہرے کی چھٹی ہوئی ہو گی کہیں دیوالی کی چھٹی تک نہ کھینچ جائے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلم

حضرات اپنے کاروبار وغیرہ کے سلسلے میں دسہرے اور دیوالی میں یقیناً تعطیل کرتے رہے ہوں گے۔ غالب، تفتہ کو لکھتے ہیں:

"دسہرے میں ایک دو دن کی تعطیل مقرر ہوئی ہوگی، کہیں دوالی کی تعطیل تک نوبت نہ پہنچ جائے"۔ (ص ۳۰۰)

ہولی کا تیوہار بھی اس زمانے میں منایا جاتا تھا ضمنی طور پر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ غالب میں ہولی پھاگن کے مہینے میں ہی ہوتی تھی۔ تفتہ کو لکھتے ہیں:

"پھاگن، چیت؛ بیساکھ؛ نہیں معلوم ہولی کس مہینے میں ہوتی ہے؟ آگے تو پھاگن میں ہوتی تھی"۔ (ص ۲۵۶)

ہولی کے ساتھ دھلینڈی بھی منائی جاتی تھی۔ دھلینڈی ہولی کے دوسرے دن منائی جاتی ہے جس میں ہندو دھول اڑاتے ہیں۔ ایک مرتبہ علائی آنے والے تھے اور غالب انتظار کرتے کرتے عاجز آ گئے تھے اس پر انہوں نے لکھا کہ اب ہولی اور دھلینڈی کا موسم آ گیا ہے خیر میں چند روز اور تیرے دیدار کا مشتاق رہوں۔

ہولی اور دھلینڈی کے ساتھ ساتھ پارسیوں کے ایک جشن کا ذکر بھی غالب نے کیا ہے جسے "کوسہ برنشین" کے نام سے جانا جاتا تھا، اتفاق سے ان دونوں کا موسم ایک ساتھ پڑ گیا اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے غالب نے علائی کو لکھا:

اس ماہِ مبارک میں امضائے حکم سرکار کا وہ ہنگامہ گرم ہو کہ پارسیوں کی "عید کوسہ برنشیں" کا گماں گذرے، دور کیوں جاؤ ہولی کی دھلینڈی کا سماں لوہارو میں بندھ جائے۔ ایک خرسوار کی سواری بڑی دھوم سے نکلے۔ حسنِ اتفاق یہ کہ یہ وہی موسم ہے۔ "ہولی" اور "عید

کوسہ نشین'' کا زمانہ باہم ہے...تو کوسہ برنشین اور ہولی
کی رنگ رلیاں منالے اور خرسوار کو بہ خربِ تازیانہ
دوڑالے''۔ (ص ۴۱۸)

کوسہ برنشیں پارسیوں کا ایک جشن تھا جو بڑے ہی جوش وخروش کے ساتھ منایا جاتا تھا۔ یہ بہت ہی دلچسپ اور عجیب وغریب جشن تھا مولانا غلام رسول مہر ''خطوط غالب'' میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کوسہ برنشین پارسیوں کا ایک جشن تھا جس کی کیفیت
یہ ہے کہ ایک کوسہ، یعنی ایسے آدمی کو جس کے بڑے عمر
تک ڈاڑھی نہ نکلے، تلاش کر کے گدھے پر سوار کرتے۔
ایک ہاتھ میں پنکھا اور دوسرے ہاتھ میں کوڑا دے
دیتے، اس کے بدن پر گرم دوائیں مل دیتے اور وہ ہائے
گرمی ہائے گرمی کہتا پھر تیزی سے پنکھا جھلنے لگتا۔
امیر، غریب سب اس کے گرد جمع رہتے۔ کوئی اس
پر پانی ڈالتا، کوئی برف پھینکتا، جب وہ سردی کے مارے
کانپنے لگتا تو کوڑا گھماتا، لوگ اس کی چوٹیں کھاتے اور
ہنستے، جس دکان سے جو چیز چاہتا اٹھالیتا، بلکہ لوگ
نذرانے لے کر دروازوں پر کھڑے رہتے''۔
(ص ۹۸)

(علمی پرنٹنگ پریس ہسپتال روڈ، لاہور)

جشن کے ہی ضمن میں ایک جشن جو نواب وغیرہ کی جانشینی کے وقت منایا جاتا تھا اور اس جشن میں دل کھول کر رقم لٹائی جاتی تھی اور بڑا اہتمام کیا جاتا تھا اس میں حکام اور

عہدیداران بھی شامل ہوتے تھے۔ غالب نے اس طرح کے ایک جشن کا ذکر کیا ہے۔ نواب یوسف علی خاں ناظم کے انتقال کے بعد نواب کلب علی خاں مسند نشین ہوئے تو بڑے اہتمام سے جشن منایا گیا یہ جشن شہر سے دوکوس دور آغاز پور نام کی بستی میں منایا گیا تھا۔ ہفتوں پہلے سے اس کی تیاریاں چل رہی تھیں۔ اس جشن کی تفصیلات غالب کی زبانی ملاحظہ ہو۔ ۶ ر دسمبر ۱۸۶۵ء کو علائی کے نام خط میں لکھتے ہیں:

"یہاں جشن کے وہ سامان ہو رہے ہیں کہ جمشید اگر دیکھتا تو حیران رہ جاتا۔ شہر سے دوکوس پر آغاز پور نامی ایک بستی ہے آٹھ دس دن سے وہاں خیام برپا تھے..... بارہ پر دو بجے گئے اور شام کو پانچ بجے خلعت پہن کر آئے۔ وزیر علی خاں خانساماں خواصی میں سے روپیہ پھینکتا ہوا آتا تھا۔ دوکوس کے عرصے میں دو ہزار روپے سے کم نہ نثار ہوا ہوگا"۔ (ص ۴۱۹)

جس طرح تیوہار اور جشن کے سلسلے میں اس معاشرت کے لوگوں کا یقین تھا اسی طرح اس دور کے لوگ مختلف قسم کے اوہام میں بھی مبتلا تھے۔ کسی حادثے یا واقعے کی ایسی توجیہ کرتے کہ عقل اسے قبول نہ کرتی۔ مثال کے طور پر توہمات میں سے ایک وہم سعادت کا بھی رائج تھا۔ بادل چھایا ہوا ہے اور ہوا سرد چل رہی ہے تو لڑکے کا سعید ازلی ہونا خیال کر لیا گیا ہے۔ غالب نے علائی کے پاس لکھا:

"یہ لڑکا سعید ازلی ہے۔ ابر کا محیط ہونا اور ہوا کا سرد ہو جانا خاص اس کی آسائش کے واسطے ہے"۔ (ص ۳۷۱)

لوگ جادو ٹونے پر بھی یقین رکھتے تھے۔ نواب امین الدین خاں ایک مرتبہ سخت بیمار

ہوئے۔ علاج و معالجہ چلتا رہا اسی دوران علائی کو یہ گمان ہوا کہ میرے والد پر کسی نے سحر کرا دیا ہے اس لیے ان کی بیماری ٹھیک نہیں ہو رہی ہے اس کا ذکر انہوں نے غالب سے بھی کیا۔ غالب جواب میں علائی کو لکھتے ہیں:

> "اسما و آیات شفا بخش مقرر ہیں۔ ردِ سحر و دفعِ بلا ان کے ذریعے سے متصور ہے، لیکن ان ملاؤں اور عزائم خوانوں نے تہہ توڑ دی ہے کچھ نہیں جانتے اور باتیں بکھانتے ہیں۔ تمہارے باپ پر کوئی سحر کیوں کرے گا، بے چارہ الگ ایک ایسے گوشے میں رہتا ہے کہ جب تک خاص وہاں کا قصد نہ کرے، کبھی کوئی وہاں نہ جائے۔ یہ خیال عبث"۔ (ص ۳۸۳)

اس دور میں کتابوں کی چھپائی کے وقت بڑا اہتمام کیا جاتا تھا۔ غالب نے "دستنبو" کی چھپائی کے سلسلے میں تفتہ کو کچھ ضروری ہدایات دی ہیں کہ کتاب کے پہلے اور دوسرے ورق کی نوعیت کیا ہوگی۔ انہوں نے تفتہ کو لکھا:

> "ورنہ رسم تو یوں ہے کہ پہلے صفحے پر کتاب کا نام اور مصنف کا نام اور مطبع کا نام چھاپتے ہیں اور دوسرے صفحے پر لوح سیاہ قلم سے بنتی ہے اور کتاب لکھی جاتی ہے"۔ (ص ۲۹۲)

عہد غالب میں کتابوں کے آخر میں قطعۂ تاریخ بھی ہوتا تھا اور کبھی کبھی تو کئی قطعات ہو جاتے تھے۔ غالب نے دستنبو کے لیے ایک قطعہ مرزا حاتم علی مہر کے پاس لکھ کر ارسال کیا اور تفتہ کے پاس لکھا کہ ایک قطعہ مہر صاحب کا، ایک قطعہ تمہارا اور ایک قطعہ نبی بخش حقیر سے بھی لکھواؤ۔ یہ تمام قطعات غالب نے دستنبو میں شامل کرنے

کے لیے کہا ہے۔ تفتہ کو لکھتے ہیں:

> ''بھائی مرزا تفتہ! کل کے مرزا صاحب کے خط میں سے اس مادۂ تاریخ کا قطعہ لکھ لینا۔ تم کو لکھ چکا ہوں، ایک قطعہ مرزا صاحب کا، ایک قطعہ تمہارا، بلکہ ایک قطعہ مولانا حقیر سے بھی لکھواؤ''۔ (ص ۲۹۹)

کاغذ بھی مختلف قسم کے ہوتے تھے مثلاً فرنچ کاغذ، شیورام پوری، نیلے کاغذ وغیرہ غالب کے خطوط سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ فرنچ کاغذ سب سے اعلا قسم کا ہوتا تھا۔ غالب نے اس کی اہمیت کا ذکر کیا ہے۔ دستنبو کی چھپائی کی سلسلے میں تفتہ سے اس بات پر بھی اصرار کیا ہے کہ فرنچ کاغذ پر دستنبو کی ان کاپیوں کو چھاپا جائے جو حکام یا عہدیداران کے لیے ہیں باقی کاپیوں کو شیورام پوری یا نیلے کاغذ پر چھاپنے کو کہا ہے۔ تفتہ کو لکھتے ہیں:

> ''کاغذ کے باب میں یہ عرض ہے کہ فرنگ کاغذ اچھا ہے۔ چھے جلدیں جو نذرِ حکام ہیں وہ اس کاغذ پر ہوں اور باقی چاہو شیورام پوری پر اور چاہو نیلے کاغذ پر چھاپو''۔ (ص ۲۹۲)

طباعت کے بارے میں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اگر پتھر چھوٹا ہوتا تھا تو آٹھ آٹھ صفحے اور پتھر اگر بڑا ہوتا تو بارہ بارہ صفحے چھاپے جاتے، طباعت کا طریقہ آج کے زمانے سے مختلف تھا، غالب نے تفتہ کو دستنبو کی چھپائی سے متعلق لکھا:

> ''کاپی لکھی جائی اور چھاپا ہونا شروع ہو گیا ہوگا؛ اگر پتھر بڑا ہے تو چاہیے آٹھ آٹھ صفحے بلکہ بارہ بارہ صفحے چھاپے جائیں اور کتاب جلد منطبع ہو جائے۔'' (ص ۲۹۰)

جب کتاب چھپ چکی تو اسے فروخت کرنا اہم مسئلہ تھا۔ عہد غالب میں بھی کتابوں کے فروخت کے سلسلے میں اس کا اشتہار اخبار میں چھاپا جاتا اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا کہ بہت ساری درخواستیں اس کتاب کی خریداری کے سلسلے میں موصول ہو جاتی تھیں اور کتاب بآسانی خریداروں کے پاس ارسال کردی جاتی تھی۔ جب دستنبو چھپ چکی تو غالب نے تفتہ کو لکھا کہ منشی شیونرائن سے کہہ دو کہ اپنے اخبار ''آفتاب عالمتاب'' میں اس کا اشتہار چھاپیں۔ ''آفتاب عالمتاب'' شیونرائن کے مطبع مفید الخلائق سے نکلتا تھا۔ غالب کے خط کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''ہمارے منشی شیونرائن صاحب اپنے مطبع کے اخبار میں
اس کتاب کے چھاپے کا اشتہار کیوں نہیں چھاپتے
تاکہ درخواستیں خریداروں کی فراہم ہو جائیں''۔
(ص۲۹۴)

کتابوں کو ایک دوسرے تک پہنچانے کے سلسلے میں ایک طریقہ یہ بھی رائج تھا کہ اس کی نقل کرا کر بھیج دیا جاتا تھا۔ غالب کو دساتیر کی فرہنگ (پارسیوں کی مذہبی کتاب) کی ضرورت تھی جو بگمان غالب علائی کے پاس تھی۔ غالب نے علائی کو لکھا کہ وہ اس کی نقل بھیج دیں ملاحظہ ہو:

''حق یوں ہے کہ بعض لغات کے اعراب یاد نہیں، اس
واسطے فرہنگ کی خواہش ہے۔ اگر اُس فرہنگ کی نقل
بھیج دو گے تو مجھ پر احسان کرو گے''۔ (ص۳۷۰)

الغرض خطوط غالب کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس زمانے کی معاشرت اور اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں جتنی اور جیسی معلومات ان خطوط سے حاصل ہو جاتی ہے دوسرے ذرائع سے حاصل نہیں ہوتی۔ غالب نے

ان خطوط سے حاصل ہو جاتی ہے دوسرے ذرائع سے حاصل نہیں ہوتی۔ غالب نے تہذیبی اداروں اور معاشرتی کوائف کو اپنے خطوط میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔ اسے خطوط غالب کا ایک بڑا امتیاز سمجھنا چاہیے۔

غالبؔ کی شناخت

مصنف: ڈاکٹر کمال احمد صدیقی

ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے اس کتاب میں کلام غالب کی تدوین تاریخی اعتبار سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ کلامِ غالب کے ارتقاء کو اچھی طرح سے سمجھا جاسکے۔ آپ نے اس کتاب میں مآخذوں کے حوالے سے غالبؔ کے اُن اشعار کی نشاندہی کی ہے، جن کی قرآتیں نسخہ بھوپال سے نہیں بلکہ نسخہ شیرانی سے مطابقت رکھتی ہیں۔

عمدہ طباعت، خوبصورت گٹ اپ

صفحات : ۲۶۵

قیمت : ۸۰روپے

وسیم راشد

خلیق انجم کے مرتبہ خطوطِ غالب ۔ ایک تجزیہ

غالب کی شخصیت اور سیرت کو جتنا ہم نے اُن کی شاعری کے ذریعے جانا ہے اُس سے کہیں زیادہ اُن کے خطوط کے ذریعے پہچانا ہے۔ یہ اُردو کی خوش نصیبی ہے کہ غالب جیسے عظیم فن کار کو بیسویں صدی کے دو بڑے متنی نقاد نصیب ہوئے، ایک تو مولانا امتیاز علی خاں عرشی جنہوں نے غالب کا اردو دیوان مرتب کیا اور مکاتیبِ غالب کے نام سے ان خطوں کا تنقیدی ایڈیشن تیار کیا جو غالب نے نوابانِ رامپور کے نام لکھے تھے اور دوسرے ڈاکٹر خلیق انجم جنہوں نے غالب کے تمام اردو خطوط مرتب کیے۔ یوں تو غالب کی نظم و نثر کے بہت سے مختلف ایڈیشن چھپے ہیں لیکن مجھے یہ کہنے میں عار نہیں کہ عرشی صاحب اور خلیق انجم صاحب نے متنی تنقید کے جدید ترین اصولوں کی روشنی میں غالب کا دیوان اور ان کے اردو خطوط مرتب کیے ہیں۔ خلیق انجم نے بڑی تعداد میں کتابیں مرتب کی ہیں بلکہ ان کی ادبی زندگی کا آغاز ہی ترتیب و تدوین

سے ہوا۔ معراج العاشقین ان کی پہلی کتاب ہے پھر مرزا مظہر جانِ جاناں کے خطوط، غالب کی نادر تحریریں، مرزا محمد رفیع سودا، غالب اور شاہانِ تیموریہ، کربل کتھا کا لسانی مطالعہ، دلّی کی درگاہ شاہِ مرداں، آثار الصنادید، مرقع دہلی، جوش ملیح آبادی کے خطوط، انتخابِ کلام حسرت وغیرہ اور ابھی بھی ادب کا آتش جواں ہے۔

دلّی کے آثارِ قدیمہ انجم صاحب کی بہت اہم کتاب ہے۔ اس سلسلے میں ان کا اہم ترین کام سرسیّد کی آثار الصنادید کا تنقیدی ایڈیشن ہے مرقع دہلی کا خلیق صاحب نے جو تنقیدی ایڈیشن تیار کیا اس کا مقدمہ بھی اعلا تحقیق کی بہترین مثال ہے۔

متنی تنقید، خلیق صاحب کی متنی تنقید کے فن پر اردو میں پہلی کتاب ہے۔ خلیق صاحب کی متنی تنقید پر گہری نظر ہے۔ وہ متنی تنقید کے ماہر ہی نہیں انہوں نے متنی تنقید کے اعلیٰ ترین نمونے پیش کر کے اُردو ادب میں اپنے لیے ایک ممتاز مقام بنایا ہے۔

دہلی یونیورسٹی میں جب ببلیوگرافی کا کورس شروع ہوا تو پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے خلیق صاحب اور پروفیسر ظہیر احمد صدیقی سے فرمائش کی کہ وہ ان طلباء کی کلاسیں لیں، جیسا کہ خلیق صاحب نے خود لکھا ہے کہ ''چونکہ اس وقت متنی تنقید کے کورس میں شامل کرنے کے لیے کوئی نصابی کتاب نہیں تھی اس لیے خواجہ صاحب نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں اس موضوع پر کتاب لکھوں'' اس طرح اس موضوع پر پہلی کتاب تالیف ہوئی، وہ شخص جو متنی تنقید کا ماہر ہو وہ جب غالب کے خطوط مرتب کرتا ہے تو اس کی تنقیدی بصیرت، تحقیقی صلاحیت اور متنی تنقید کی بے پناہ مہارت ان خطوط کو عملی تنقید کا قابلِ تقلید کارنامہ بنا دیتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے غالب کے تمام اردو خطوط کی از سرِ نو تدوین کا بیڑا اٹھایا اور برسوں محنت کی اور یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ غالب کا کوئی خط ان جلدوں سے باہر نہیں ہے۔ اردو خطوطِ غالب کی ترتیب و تدوین اور تصحیح متن کے اس عظیم کارنامے پر اردو کے بیشتر ادیبوں اور نقادوں نے ڈاکٹر صاحب

کی بارہ سالہ کاوش کا بہت ہی دیانت داری سے اعتراف کیا ہے۔ ڈاکٹر ظ انصاری نے اپنے مضمون خطوطِ غالب ڈاکٹر خلیق انجم کا قابلِ قدر کارنامہ میں کہا ہے ''خطوطِ غالب کی یہ پہلی جلد اوّل سے آخر تک پڑھی تو دل سے بے اختیار واہ واہ نکلی، کیا عمدہ کام ہوا ہے۔ غالب خود اپنی تصانیف کی اشاعت پر جتنی دیدہ ریزی، احتیاط اور نفاست سے کام لیتے تھے، وہی یہاں بھی صرف ہوئی ہے۔ یعنی یہ مجموعہ واقعی غالب کے شایانِ شان ہے، گویا ایک قبا ہے جو اس جامہ زیب استاد کے بدن پر راست آئی ہے، شروع میں ۲۲۰ صفحے کا مقدمہ ہے جس کے کئی حصے ہیں۔ تنقیدی اور علمی متن کے اصول جو رائج ہیں جو متروک ہوئے جو کام میں لائے گئے۔ پھر خطوطِ غالب کے آج تک کے سارے ایڈیشنوں کی تنقیح اور تنقید پھر ان خطوط کی خطوط نگاری کے پس منظر میں قدر و قیمت اور خصوصیات پھر انڈکس اور متعلقہ وضاحتیں، اسی طرح یہ مقدمہ بجائے خود ایک علمی تحقیقی مقالے کا وزن رکھتا ہے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی تو خلیق انجم پہلے سے ہیں، اس مقالے پر اگر انہیں کوئی علمی ادارہ ڈی لٹ دے نکلے تو بے جا نہیں بر حق ہوگا''۔ خلیق صاحب نے جس طرح غالب کے خطوط کے تنقیدی ایڈیشن تیار کیے ہیں وہ یقیناً وہی متنی نقاد کرتا ہے جس کی خود متنی تنقید کے اصولوں پر گہری نظر ہو۔ کیونکہ متنی نقاد کو کسی بھی تحریر کا تنقیدی ایڈیشن تیار کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ وہ مصنف کی کون سی تحریر کی بازیافت کر رہا ہے، جو مصنف کے ذہن میں تھا اور جو وہ لکھنا چاہتا ہے، اس تحریر کی نہیں جو مصنف کے قلم سے نکلی یا شائع ہوئی ہو۔ متنی تنقید کے نقطۂ نظر سے خطوطِ غالب کا متن بھی دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک متن تو وہ جو غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا دستیاب ہوا ہے یعنی غالب کے اصل خطوط، خلیق صاحب نے اِس ایڈیشن میں وہ خط بھی شامل کیے ہیں جو مطبوعہ شکل میں ملے تھے لیکن بعد میں اصل خطوط بھی مل گئے ہیں۔ دوسری قسم کا متن وہ ہے جو اردوئے معلّٰی، عودِ ہندی اور نادراتِ غالب وغیرہ میں

شائع ہوئے ہیں۔ اس متن میں غالب کے وہ خطوط بھی ہیں جو اردوئے معلّٰی کے بعد کے ایڈیشنوں میں شامل کیے گئے تھے۔ خلیق صاحب نے اپنے پہلے ایڈیشن میں غالب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ان خطوط کو جن کے عکس مختلف رسالوں میں شائع ہوئے ہیں یا جو اصل شکل میں مختلف لائبریریوں میں محفوظ ہیں، بنیادی نسخے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے تمام خطوط کو تاریخ وار ترتیب دیا ہے۔ جن خطوں کی تاریخ تحریر کا پتہ نہیں ہے انہیں متعلقہ مکتوب الیہ کے نام خطوط کے آخر میں ترتیب دیا گیا ہے، اگر کسی خط کی تاریخ کا اندازہ نہ ہو سکا لیکن سنہ کا اندازہ ہو گیا ہے، تو اسی سنہ کے خطوط کے آخر میں اس خط کو ترتیب میں رکھا ہے۔

غالب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے جو خطوط ملے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب ہر خط میں تاریخ تحریر لکھتے تھے اور یہ تاریخِ تحریر مختلف طریقوں سے لکھی ہے عام طور سے خط کے آخر میں لکھتے تھے لیکن کبھی خط کے آغاز میں اور کبھی خط کے متن میں بھی لکھ دیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے تاریخِ تحریر کو خط کے آخر میں دائیں طرف ترتیب دیا ہے تا کہ قاری کو خط کی تاریخ تحریر معلوم کرنے میں آسانی ہو۔

غالب کبھی عیسوی تاریخ لکھتے تھے کبھی ہجری اور کبھی دونوں۔ انہوں نے اگر ہجری تاریخ لکھی ہے تو ڈاکٹر صاحب نے اس کی عیسوی تاریخ بھی لکھ کر حاشیے میں اُس کا حوالہ دے دیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے خطوطِ غالب کی پہلی جلد میں تنقیدی اڈیشن کے متن کے املا کی جو وضاحت کی ہے وہ کوئی وہی متنی نقاد کر سکتا ہے جسے زبان پر وہ بھی اپنے عہد اور مصنف کے عہد کی زبان پر پوری قدرت حاصل ہو۔ تنقیدی ایڈیشن کی املا میں دو ہو سکتی ہیں متنی نقاد متن کے لیے اپنے عہد کی املا کا استعمال کرتا ہے یا اُس املا کا جس میں مصنف نے متن لکھا تھا لیکن بقول ڈاکٹر صاحب کہ متن کی املا جدید ہونی چاہیے

کیونکہ ایک تو ہم متن اپنے عہد کے لوگوں کے لیے تیار کرتے ہیں اور دوسرے متنی نقاد کا مقصد متن کی بازیافت ہے، املا کی بازیافت ہرگز نہیں اس لیے ڈاکٹر صاحب نے غالب کے خطوط مرتب کرتے وقت غالب کے خطوط کا متن اپنے عہد کی املا میں تیار کیا ہے اور ہر پیراگراف نئی سطر سے شروع کیا گیا ہے۔ اوقاف کی وہ علامتیں بھی استعمال کی گئی ہیں جو ہمارے عہد میں رائج ہیں اسی طرح متن میں گنتی اور روپوں کی تعداد وغیرہ بھی لفظوں میں لکھی گئی ہے تا کہ طباعت کی غلطی اُس پر اثر انداز نہ ہو۔ غالب عام طور سے خط کے آخر میں تاریخ سے پہلے مکتوب نگار کی حیثیت سے اپنا نام لکھتے تھے ڈاکٹر صاحب نے خط کے آخر میں بائیں طرف مکتوب نگار کا نام ترتیب دیا ہے۔

غالب کے خطوط پڑھاتے وقت اساتذہ چاہے وہ اسکول کے ہوں یا یونیورسٹی، کالجوں کے اکثر اس جملہ کا استعمال کرتے ہیں ''کہ غالب نے خطوط میں القاب وآداب لکھنا ترک کر دیا تھا اور یہی نہیں اکثر کتابوں میں جب غالب کے خطوط کی خصوصیات لکھی جاتی ہیں تو اس میں بھی اس جملہ کا ہونا ضروری ہوتا ہے لیکن ڈاکٹر صاحب نے بہت ہی صاف الفاظ میں بتایا ہے کہ خطوطِ غالب کے مطالعے سے یہ بات بالکل غلط ثابت ہوتی اور اس کے جواز میں انہوں نے دلائل بھی دیے ہیں۔ ایک طویل فہرست ہے جس میں ڈاکٹر صاحب نے ان اشخاص کے نام گنائے ہیں۔ مرزا ہر گوپال تفتہ کے نام غالب کے ایک سو تیئس خطوط میں سے صرف بیس خطوط میں القاب نہیں لکھے گئے، میاں داد خاں سیّاح کے نام ۳۵ خطوط میں ایک خط بھی ایسا نہیں جن میں القاب نہ ہو۔ میر مہدی مجروح کے نام پچاس میں سے صرف چھے، چودھری عبدالغفور سرور کے نام ستائیس میں سے دو، خواجہ غلام غوث بے خبر کے نام پچیس میں سے تین اور نواب انورالدولہ شفق کے نام بیس میں سے صرف دو خط ایسے ہیں جو

القاب سے عاری ہیں۔ ہمارے نقاد شاید شفق کے نام اس خط کے حوالے سے یہ بات کہتے رہے ہیں جس میں غالب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ لمبے لمبے پرتکلف اور پُرتصنع القاب کا استعمال انہوں نے بند کر دیا ہے۔ غالب نے پنج آہنگ کے آہنگِ اوّل میں اپنا یہ موقف اس طرح بیان کیا ہے:

”مکتوب الیہ کو اس کی حیثیت کے مطابق پکارتا ہوں (یعنی القاب لکھتا ہوں) القاب اور آداب اور عافیت حشو زائد ہے“

اردو خطوط میں القاب لکھتے ہوئے غالب کا بالکل یہی رویہ ہے۔ وہ مخاطب کی حیثیت کے مطابق چھوٹا سا لقب لکھ کر مطلب کی بابت بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ایسے خطوط کی تعداد بہت کم ہے جس میں القاب نہیں لکھے گئے۔ عام طور سے صرف القاب پڑھ کر ہمیں مکتوب الیہ سے غالب کے ذہنی رشتے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ان القابوں میں بے تکلفی، بے ساختگی، اور گفتگو کا انداز ہے۔ کبھی کبھی یہ القاب خط کے مضمون کے مطابق ہوتے ہیں۔ غالب نے علائی کے نام خطوط میں اس طرح کے القاب لکھے ہیں:

”اجی مولانا علائی، مرزا علائی مولائی۔ میری جان،
صاحب جانا عالیشانا مرزا میاں سعادت و اقبال نشان،
یار بھتیجے گویا بھائی مولا علائی وغیرہ“

تفتہ کے نام خطوط کے القاب ہیں:

”مہاراج بندہ پرور، کاشانۂ دل کے ماہِ دو ہفتہ، منشی
ہرگوپال تفتہ نور نظر و لختِ جگر۔ اجی مرزا تفتہ برخوردار۔
میرے مہربان“

ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ اردو خطوط نویسی کو غالب کی دین یہ نہیں ہے کہ

انہوں نے القاب و آداب لکھنے بند کر دیے بلکہ ان کی دین یہ ہے کہ ایک تو القاب کو مکتوب الیہ سے اپنے ذہنی رشتے کے اظہار کا ذریعہ بنایا جس کی وجہ سے القاب میں تصنع اور تکلف کے بجائے ایک فطری انداز پیدا ہو گیا ہے اور یہاں سب خیریت ہے، بعد آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک مطلوب ہے، جیسے رسمی جملوں سے اردو خطوط کو نجات دلائی۔

جس طرح القاب و آداب کے بارے میں ناقدین نے غلط فہمی پیدا کی ہے اسی طرح غالب کے خطوط میں مکالمہ نویسی کے بارے میں ناقدین غلط رائے رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے جس طرح غالب کے خطوط کی ایک ایک سطر اور ایک ایک لفظ کو پڑھا ہے، اس سے ان کی دیدہ ریزی اور جگر کاوی کا اندازہ ہوتا ہے اور غالب کے خطوط سے متعلق نئی نئی باتیں سامنے آتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے غالب کے خطوط میں جو مکالمہ کا لفظ استعمال ہوا ہے، اس پر بھی تنقید کے نئے زاویے پیش کیے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ لفظ 'مکالمہ' کو بعض ناقدین نے ڈرامے کے ڈائیلاگ کے مفہوم میں سمجھ کر ثابت کیا ہے کہ غالب نے خطوط نویسی کو مکالمہ یعنی ڈائیلاگ بنا دیا ہے ایسا نہیں ہے مکالمہ سے غالب کی مراد محض گفتگو ہے۔ اس بات کی وضاحت کے لیے ڈاکٹر صاحب نے غالب کے خطوط سے چند مثالیں بھی دی ہیں۔

مرزا ہر گوپال تفتہ کو جو خط ۷ ار ستمبر ۱۸۵۷ء کو لکھا ہے اس میں کہتے ہیں:

''بھائی مجھ میں تم میں نامہ نگاری کا ہے کو ہے مکالمہ ہے،

مرزا حاتم علی مہر کے نام نومبر ۱۸۵۸ء کے خط میں غالب لکھتے ہیں:

'مرزا صاحب میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے'

منشی نبی بخش حقیر کے نام ۳۱ مئی ۱۸۵۲ء کے خط میں لکھتے ہیں:

'یہ میں باتیں کر رہا ہوں خط نہیں لکھتا مگر افسوس اس
گفتگو میں وہ لطف نہیں جو مکالمۂ زبانی میں ہوتا ہے
یعنی میں ہی بک رہا ہوں تم کچھ نہیں کہتے"

یہ ٹھیک ہے کہ غالب نے خطوط میں باقاعدہ مکالمہ بھی لکھے ہیں مگر سینکڑوں خطوط میں سے صرف چار یا پانچ میں، غالب نے اپنی بات مکالمے کے انداز میں بہت ہی خوبصورت طریقے سے کہی ہے۔

خطوطِ غالب کی جلد اوّل میں ڈاکٹر صاحب نے غالب کے اسلوب پر جو عالمانہ اور تفصیلی مضمون لکھا ہے اس کو پڑھ کر غالب کے اسلوب پر جتنی باتیں کہی گئی ہیں ان سب کا نچوڑ اور ساتھ ہی غالب کے اسلوب کے گوناگوں پہلو سامنے آجاتے ہیں۔ غالب کے خطوط میں مقفّی عبارتیں، صرفی ونحوی ترتیب روز مرّہ محاوروں اور کہاوتوں کا استعمال، تشبیہوں، استعاروں، فارسی ترکیبوں اور ساتھ ہی ندائیہ الفاظ، بیانیہ اور خطیبانہ انداز اختیار کر کے جس طرح غالب نے خطوط کو تقریر اور گفتگو سے قریب کر دیا ہے، ان سبھی پر ڈاکٹر صاحب نے گہری نظر ڈالی ہے۔ ہم بار بار کہتے ہیں کہ غالب کے خطوط پڑھ کر ہمیں ایسا لگتا ہے کہ ہم نے غالب کو دیکھ لیا کیونکہ غالب اپنے خطوط میں ہنستے بولتے، بات کرتے، طنز کرتے شکوہ وشکایت کرتے نظر آتے ہیں لیکن خطوط غالب کی جلد اوّل پڑھ کر نہ صرف ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم نے غالب کو دیکھ لیا بلکہ ایسا لگتا ہے کہ غالب خود اپنے خطوط کو جانچ پرکھ رہے ہیں اور پھر اس میں خوبیاں وخامیاں تلاش کر کے کہیں اپنے اسلوب پر بحث کرتے ہیں کہیں خود کو justify کرتے ہیں۔

خطوطِ غالب، غالباً اردو کی پہلی کتاب ہے جس کی اتنے بڑے پیمانے پر پذیرائی ہوئی، صفِ اوّل کے ناقدین نے اس پر تبصرے کر کے اس کام کو سراہا۔ ریڈیو

اور ٹی وی پر اس کتاب پر تبصرے اور مذاکرے ہوئے اور غالباً یہ بات بھی پہلی بار ہوئی کہ کسی اردو کتاب پر انگریزی اور ہندی کے قومی اخباروں میں تبصرے شائع ہوئے۔ ہندوستان ٹائمز، ٹائمز آف انڈیا، Statesman، Pioneer اور Tribune وغیرہ میں زبردست تبصرے چھپے یہاں وہ سب نقل کرنا ممکن نہیں ہے۔ بس Statesman میں شائع ہونے والے تبصرے کی چند سطور ملاحظہ فرمائیں:

> "All lovers of art and letters owe a debt to Dr. Anjum for his painstaking work, he completed after years of research in India and abroad. It brings Ghalib alive to us and we see the Poet as he really was all agog with the excitement of everyday things which he transformed into momentous events.
>
> (Statesman, New Delhi, July 30 1984)

ان خطوط کی ترتیب میں خود انجم صاحب نے کیسے پاپڑ بیلے ہیں، خود ان کی زبان سے ملاحظہ ہو:

> "بہت عرصہ ہوا میں نے غالب کے خطوط مرتب کر لیے تھے جس کے متن کی بنیاد عودِ ہندی اور اردوئے معلیٰ کے پہلے ایڈیشنوں پر تھی۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری ہو جانے کے بعد میری مصروفیات کچھ اس طرح کی ہو گئیں کہ کافی عرصے تک اس کام کی طرف توجہ نہیں کر سکا اسی دوران میرے مرتبہ غالب کے اردو خطوط اور دس پندرہ بہت قیمتی کتابیں ایک ساتھ چوری ہو گئیں ان میں عودِ ہندی کا وہ پہلا ایڈیشن

بھی تھا جو میں نے پرانی کتابوں کے ایک تاجر سے
خریدا تھا۔ اس وقت میں چور کو بہت کوستا تھا لیکن اب
دعائیں دیتا ہوں کہ اگر وہ میری کتابیں چوری نہ کرتا تو
عودِ ہندی کے بارے میں ایک اہم ترین انکشاف میں
اور نہ جانے کتنا زمانہ لگتا"

عودِ ہندی چوری ہو جانے سے انجم صاحب کو سارا کام دوبارہ کرنا پڑا لیکن کام بہت اچھا ہو گیا کیونکہ غالب کے خطوط ۱۸۶۹ء سے لے کر اب تک مختلف صورتوں میں شائع ہوتے رہے لیکن جس اہتمام اور سائنٹفک انداز میں خلیق صاحب نے تنقیدی ایڈیشن مرتب کیا ہے وہ پہلی بار ہے۔ اب آپ غالب کو نہ صرف ہنستے بولتے، بات کرتے، طنز و مزاح کے تیر برساتے، اشعار پر اصلاح دیتے، سیاسی و سماجی حالات بیان کرتے، فکرِ معاش میں مبتلا دیکھتے ہیں بلکہ آپ غالب کی خلوت و جلوت دونوں کے مزے لیتے ہیں۔ خطوط کے پہلے ایڈیشن میں خطوط کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اور غالب کے تقریباً پونے دو سو اصل خطوط یا ان کے عکسوں کو بنیادی نسخے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ ہر خط کے متن کے ماخذ کی نشان دہی کی گئی ہے اہم مجموعوں کے متن کے اختلافات نسخ پیش کیے گئے ہیں۔ مکتوب الیہم کی سوانح اور بیشتر مکتوب الیہم کی تصویریں بھی شامل کی گئی ہیں غالب کے اپنے خطوط میں جن واقعات، افراد، مقامات، کتب اور رسائل وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے ان پر بڑی محنت، جستجو اور دیدہ ریزی سے تفصیلی حواشی لکھے ہیں تمام خطوط کے مکمل اور جامع اشارے تیار کیے گئے ہیں۔ پہلے ایڈیشن میں اردو خطوط کی مجموعی تعداد اور ہر مکتوب الیہ کو کتنے خط لکھے گئے ہیں ان کی باقاعدہ فہرست مرتب کی گئی ہے۔ جیسے مرزا ہر گوپال تفتہ کے نام ۱۲۳ خط ہیں اسی طرح میر مہدی مجروح کے نام خطوط ۵۰ ہیں اور اسی طرح

۹۰ لوگ ہیں جن کو غالب نے خطوط لکھے ہیں ۵۳ خط ایسے ہیں جن کے مکتوب الیہ کا نام نہیں معلوم۔

آخر میں ان تمام ایڈیشنوں کے بارے میں جو ہمارے صفِ اوّل کے محققین اور ناقدین نے رائے دی ہے ان کے کچھ اقتباسات نقل کرتی ہوں۔ رشید حسن خاں صاحب کہتے ہیں:

> ''غالب کے خطوط کی پہلی جلد اب چھپ کر سامنے آئی ہے جس کو دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے اور آنکھوں کی روشنی بڑھ جاتی ہے۔ خلیق صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان کی اس کتاب سے جہاں غالب شناسی کے ذخیرے میں اہم اضافہ ہوگا وہاں غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دلّی کی فہرست مطبوعات میں ایک ایسی کتاب کا اضافہ ہوگا جسے صحیح معنوں میں اہم کتاب کہا جا سکے گا، ایسی اہم کتاب جس کا مطالعہ ہر غالب شناس کے لیے ازبس ضروری ہے''

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی فرماتے ہیں:

> ڈاکٹر خلیق انجم نے برسوں محنت اور دیدہ ریزی کے بعد خطوط غالب کو چار جلدوں میں فراہم کیا ہے۔ غالبیات میں انہوں نے اب تک جو کام کیے تھے وہ بھی ان کی سرخروئی کے لیے کافی تھے لیکن اس کارنامے نے انہیں غالب شناسوں کی صفِ اوّل تک پہنچا دیا ہے''

آخر میں میں صرف اتنا کہنا چاہوں گی کہ ہندوستان، جیسا میں نے محسوس

کیا ہے مُردہ پرستوں کا ملک ہے۔ ہم ان مردہ لوگوں پر بڑے بڑے سیمنار کرتے ہیں اور ان پر مذاکرے کر کے ان کو زندہ جاوید بنا دیتے ہیں لیکن ان مردہ لوگوں پر زندہ لوگ جو کام کرتے ہیں ان کا اعتراف کرتے ہوئے جھجک محسوس کرتے ہیں لیکن میں اس چیز کی قائل ہوں کہ

'حق بہ حق دار رسید'

سرگرمیاں

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیرِ اہتمام سالانہ غالب تقریبات ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳ر دسمبر ۲۰۰۲ء کو منعقد

غالب انسٹی ٹیوٹ کے ذریعے منعقد ہونے والے بین الاقوامی غالب سمینار کے افتتاحی اجلاس کے موقع پر ہندوستان کے سابق وزیراعظم جناب چندر شیکھر نے کہا کہ غالب جیسے شاعر کے کلام کی موجودہ ہندوستان کو بہت ضرورت ہے کیونکہ غالب نے اپنی شاعری کے ذریعے ہمیں بھائی چارگی، انسانیت اور قومی یکجہتی کا سبق دیا ہے۔ اور غالب کی شاعری کو پڑھنے کے بعد ہمیں ہندوستان کی تہذیب کو بھی سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ غالب ہماری سیاسی زندگی میں پوری طرح رچا بسا ہے اور ہم اپنی گفتگو میں غالب کے اشعار کا کافی ذکر کرتے ہیں۔ اس موقع پر آپ نے غالب انسٹی ٹیوٹ کے بانی فخرالدین علی احمد (سابق صدرِ جمہوریہ ہند) کا بھی خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا اور کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ کی شکل میں جو پودھا وہ

لگا کے گئے تھے وہ اب تناور درخت کی شکل اختیار کر چکا ہے اور اس درخت کی شہرت اب پوری دنیا میں ہے۔ آپ نے غالب انسٹی ٹیوٹ کے کاموں کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ یہ ادارہ نہ صرف یہ کہ غالب کو پوری دنیا میں روشناس کرا رہا ہے بلکہ ہندوستانی تہذیب وثقافت کی روشنی بھی اس ادارے کے ذریعے دور دور تک پہنچ رہی ہے۔ جناب چندر شیکھر جی نے اس موقع پر اپنے ہاتھوں نے غالب انعامات کی بھی تقسیم کی انعام پانے پانے والوں میں پروفیسر حنیف نقوی (بنارس)، ڈاکٹر ریحانہ خاتون (دہلی)، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی (دہلی)، جناب ندا فاضلی (ممبئی)، جناب انیس اعظمی (دہلی)، پروفیسر امیر چند بہار (فرید آباد) تھے آپ نے انعام یافتگان کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ مجھے امید ہے کہ آنے والے دنوں میں یہ حضرات اردو اور غالب کے لئے اور کام کریں گے۔

اس سے پہلے ڈائرکٹر غالب انسٹی ٹیوٹ جناب شاہد ماہلی نے غالب انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے تمام مہمانوں کا اور سامعین کا استقبال کیا اور کہا کہ یہ غالب انسٹی ٹیوٹ کی خوش نصیبی ہے کہ جناب چندر شیکھر صاحب یہاں تشریف لائے اور انہوں نے اردو سے اپنی بے پناہ محبت کا ثبوت دیا، آپ نے اپنی تقریر میں غالب انسٹی ٹیوٹ کی سال بھر کی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ ادارہ پورے ہندوستان کا واحد ادارہ ہے جس نے غالب اور کلاسیکی ادب پر بڑا کام کیا ہے اس ادارے نے غالب کے علاوہ، حالی، سودا، میر تقی میر، خانِ آرزو، خواجہ میر درد، مومن، ذوق، ظفر، اور داغ دہلوی پر معیاری سمینار کیے ہیں اور کتابیں شائع کی ہیں اور ہمارا ارادہ بھی یہ ہے کہ ہم عہدِ غالب اور عہدِ غالب کے ہر گوشے پر سمینار کریں گے اور تحقیقی کتابیں چھاپے گے۔ سمینار کا باقاعدہ افتتاح معروف اردو اسکالر جناب محمد حسن نے کیا اور کہا کہ غالب ایسا شاعر ہے جس کی شاعری اور نثر پر کافی کاموں کی ضرورت ہے آپ نے غالب کی شعری آفاقیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ غالب کے شعری

کاموں کو ہم کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے مگر ساتھ ساتھ غالب کی نثر بھی ان کی شاعری سے کچھ کم نہیں ہے۔ کیونکہ خطوطِ غالب کے مطالعہ کے بعد ہمیں اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ غالب اپنی نثر کے ذریعے بھی اپنے چاہنے والوں کے ذہن میں ایک نقش چھوڑ گئے، آپ نے غالب انسٹی ٹیوٹ کے اراکین کو سمینار کے موضوع ''غالب کی مکتوب نگاری'' کے انتخاب پر بھی مبارک دی اور کہ اس موضوع پر کافی نئی چیزیں کھل کر سامنے آئیں گی۔ پروفیسر نذیر احمد جو سمینار کمیٹی کے چیئر مین ہیں۔ انہوں نے بھی اپنے خطبۂ استقبالیہ میں غالب کی مکتوب نگاری پر کافی اہم روشنی ڈالی آپ نے کہا کہ غالب کے فارسی اور اردو مکاتیب میں بے شمار ایسے امور ہیں جن کی وضاحت ضروری ہے۔ غالب کے اردو املا کی خصوصیت ، غالب کی اردو زبان پر فارسی اثرات، انگریزی الفاظ کا استعمال اور ان کا املا، اس طرح کی کافی باتیں ہیں جن پر اس سمینار میں بحث کی جائے گی۔ اس موقع پر غالب انسٹی ٹیوٹ کی نئی مطبوعات کا رسمِ اجراء بھی جناب چندر شیکھر کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ نئی مطبوعات میں مقالاتِ نذیر احمد (پروفیسر نذیر احمد)، کشف الالفاظ دیوانِ غالب (جمال عبدالواجد)، غالب اردو اور انگریزی (سید عبداللطیف)، نقشِ نیم رُخ (ڈاکٹر تنویر احمد علوی)، قاضی عبدالودود ایک وضاحتی اشاریہ (عطا خورشید)، الطاف حسین حالی حیات اور ادبی کارنامے (پروفیسر نذیر احمد) اور غالب نامے کے دو شمارے بھی شامل تھے۔ ایران کلچر ہاؤس کے کلچرل کاؤنسلر جناب عیسیٰ رضازادہ نے بھی اس موقع پر غالب کے حوالے سے چند اہم گفتگو کی۔ آخر میں جناب شفیع قریشی (سابق گورنر، بہار و مدھیہ پردیش) نے تمام سامعین اور خصوصاً جناب چندر شیکھر صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ جلسے کے اختتام پر مشہور گلوکار اور گلوکارہ، روپ کمار راٹھور اور سونالی نے غالب کی غزلیں اپنی خوبصورت آواز میں پیش کی۔

۲۱ ردسمبر کی صبح بین الاقوامی غالب سمینار کا پہلا اجلاس منعقد ہوا اس اجلاس

کی صدارت ڈاکٹر کمال احمد صدیقی، ڈاکٹر خلیق انجم اور نامور ایرانی ادیب پروفیسر توفیق سبحانی نے کی۔

اس اجلاس کا پہلا مقالہ ''غالب کے خطوط میں معاشرتی عناصر'' کے عنوان سے جناب مشیر احمد نے پڑھا۔ اس کے علاوہ ازبکستان سے تشریف لائی اسکالر محیی عبدالرحمٰن نے ''غالب کے خطوط کا لسانیاتی اور اسلوبیاتی جائزہ'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش فرمایا۔ ڈاکٹر ریحانہ خاتون نے باغ دودر میں شامل غالب کے فارسی خطوط کا اردو ترجمہ: ''ایک گزارش'' کے عنوان سے اپنا تحقیقی مقالہ پیش فرمایا اس اجلاس کا آخری مقالہ ایرانی اسکالر پروفیسر محمد رضا نصیری کا تھا۔ اس اجلاس کی نظامت کا فریضہ ڈاکٹر رضا حیدر نے انجام دیا۔

دوسرے اجلاس کی صدارت کے لیے پروفیسر حنیف نقوی، ڈاکٹر تنویر احمد علوی اور ایرانی اسکالر پروفیسر محمد مہدی محقق کو زحمت دی گئی تھی۔ اس اجلاس میں پروفیسر نثار احمد فاروقی نے ''غالب کے مُہر ساز بدرالدین علی خان'' ڈاکٹر خلیق انجم نے ''غالب کے جعلی خطوط'' کے عنوان سے مقالہ پیش فرمایا اس کے علاوہ پروفیسر محمد حسن، پروفیسر توفیق سبحانی، محترمہ وسیم راشد نے بھی اس اجلاس میں پرچے پڑھے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے انجام دی۔

سمینار کا تیسرا اجلاس پروفیسر صادق، پروفیسر محمود رضا نصیری اور پروفیسر شریف حسین قاسمی کی صدارت سے شروع ہوا۔ اس اجلاس میں ایران سے تشریف لائے اسکالر پروفیسر محمد مہدی محقق اور پروفیسر بہمن سرکاراتی نے کافی علمی مقالہ پیش فرمایا۔ خصوصاً غالب شناسی کی جو روایت ایران میں زور پکڑ رہی اس پر آپ نے کافی تفصیل سے گفتگو کی۔ غالب کی کتاب 'دستنبو' کے حوالے سے بھی ان اساتذہ نے اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار کیا۔ اس اجلاس کی نظامت کا فریضہ ڈاکٹر وسیم بیگم نے انجام دیا۔

سمینار کے چوتھے اجلاس میں پروفیسر عبدالحق، پروفیسر باقری سرکاراتی، اور ڈاکٹر عراق رضا زیدی کو زحمت دی گئی تھی۔ اس اجلاس میں جناب شین۔ کاف نظام نے خطوطِ غالب کے حوالے سے کافی معلوماتی مقالہ پیش فرمایا۔ پروفیسر آزرمیدُخت نے بھی ''غالب کی فارسی مکتوب نگاری۔ پنج آہنگ کی روشنی میں'' کے عنوان سے کچھ نئی باتیں پیش فرمائیں اور پروفیسر شریف حسین قاسمی نے ''خطوط غالب میں قاطع برہان کا قضیہ'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ اس اجلاس کی نظامت کا فریضہ ڈاکٹر اشفاق عارفی نے انجام دیا۔ حسب دستور اس سال بھی غالب تقریبات کے تحت غالب کی زمین میں ۲۱ر دسمبر کی شب میں ایک آل انڈیا مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ مشاعرے کا افتتاح گلزار دہلوی نے کیا۔ نظامت کا فریضہ ملک زادہ منظور احمد نے انجام دیا۔ جن شعرا نے شرکت کی ان کے اسماء گرامی کچھ اس طرح ہیں ندا فاضلی (ممبئی)، مظہر امام (دہلی)، ملک زادہ منظور احمد (لکھنؤ)، پروفیسر شہریار (علی گڑھ)، گلزار دہلوی (دہلی)، گنیش بہاری طرز (ممبئی)، ولی بجنوری (بجنور)، حیات لکھنوی (دہلی)، ملکہ نسیم (جے پور)، رفعت سروش (دہلی)، شین کاف نظام (جودھپور)، فیاض رفعت (لکھنؤ) بلراج کومل (دہلی)، مالتی جوشی صنم، افضل منگلوری، منظر بھوپالی (بھوپال)، رئیس الدین رئیس (علی گڑھ)، پاپولر میرٹھی (میرٹھ)، سلطان اختر (پٹنہ)، وفا ملک پوری (پورنیہ ٹی)، اسلم الہ آبادی (الہ آباد)، شمس تبریزی (پنچکولہ)، ماجد دیوبندی (دہلی)، شکیل اعظمی (ممبئی)، شاہد ماہلی (دہلی)

سمینار کا پانچواں اجلاس، ۲۲ر دسمبر، صبح ۱۰ بجے شروع ہوا جس کی صدارت پروفیسر ظہور الدین، ڈاکٹر عین الحسن اور ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے انجام دی، اس اجلاس میں ''مکاتیب غالب'' کے عنوان سے ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے ''خطوطِ غالب میں مرقع نگاری'' کے عنوان سے ڈاکٹر ابنِ کنول اور ''غالب کے پرزے'' کے عنوان سے

ڈاکٹر اسلم پرویز، اپنا مقالہ پیش فرمایا۔ اس اجلاس کی نظامت کا فریضہ ڈاکٹر علیم اشرف نے انجام دیا۔

سمینار کے چھٹے اجلاس میں پروفیسر محمد حسن، پروفیسر آزرمیدُخت اور پروفیسر نثار احمد فاروقی نے صدارت کی۔

ڈاکٹر علی احمد فاطمی، پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر حنیف نقوی اور پروفیسر عبدالودود اظہر نے اپنے اپنے مقالے پیش فرمائے اس اجلاس میں ہر مقالہ اپنی جگہ پر کافی معیاری تھا۔ خصوصاً اس اجلاس میں غالب کے فارسی خطوط پر کافی علمی گفتگو ہوئی۔

اس اجلاس کی نظامت کا فریضہ ڈاکٹر محمود فیاض نے انجام دیا۔

سمینار کے ساتویں اجلاس کی صدارت پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر عبدالودود اظہر، پروفیسر قمر رئیس نے انجام دیا۔ اور ''غالب کے مکاتیب میں طنز و مزاح'' کے عنوان سے پروفیسر ظہور الدین نے اپنا مقالہ پیش فرمایا۔

نظامت کا فریضہ ڈاکٹر مولا بخش نے انجام دیا۔

سمینار کے اختتامی اجلاس میں پروفیسر نذیر احمد نے تمام سامعین اور مقالہ نگار حضرات خصوصاً ایرانی مقالہ نگار پروفیسر توفیق سبحانی، ڈاکٹر بہمن سرکاراتی، پروفیسر رضا نصیری، پروفیسر باقری سرکاراتی اور پروفیسر محمد مہدی محقق، کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کیا۔ ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر محمد حسن اور پروفیسر مہدی محقق نے اس تاثراتی اجلاس میں اپنے خیالات کا اظہار کیا اور سمینار کی کامیابی پر ڈائرکٹر غالب انسٹی ٹیوٹ کو مبارک باد دی۔ آخر میں شاہد ماہلی، ڈائرکٹر غالب انسٹی ٹیوٹ نے شکریہ کے کلمات کہے۔

غالب تقریبات کا اختتام ۲۳ر دسمبر کو ممبئی کے مشہور گلوکار جگجیت سنگھ کی غزلوں پر ہوا۔ آپ نے غالب کی غزلیں گا کر اس شام کو تاریخی بنا دیا۔

غالب اور رام پور کے عنوان سے دوروزہ سیمینار کا انعقاد

۲۶/اپریل ۲۰۰۳ء

غالب انسٹی ٹیوٹ اور رضا لائبریری رام پور کے زیرِ اہتمام ''غالب اور رام پور'' کے موضوع پر منعقد ہونے والے دوروزہ سیمینار کے موقع پر روہیل کھنڈ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر زاہد حسین نے سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ مرزا غالب جب معاشی دشواریوں سے گزر رہے تھے اور انہیں سہارے کی ضرورت تھی تب رام پور کے نواب یوسف علی خاں ناظم نے انہیں سہارا دیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ غالب کے خطوط میں نواب یوسف علی خاں کے بارے میں جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں انہیں پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ غالب کا رامپور سے قریبی رشتہ تھا۔ انہوں نے غالب کے دور میں علم و ادب کی ترقی کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ وہ دور ایسا تھا جب رامپور علم کی بلندیوں پر تھا۔ اس موقع پر غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے بتایا کہ مرزا غالب پر بین الاقوامی زبانوں میں تبصرے ہوئے ہیں اور عالمی ادب نے غالب کے ترجمے شائع کیے، انہوں نے کہا کہ مرزا غالب ایک زبان اور ایک طبقہ تک محدود نہیں، آپ نے واضح کیا کہ ہندوستان نے عالمی تہذیب کو جو دیا ہے اس کا قیمتی پہلو غالب ہے۔ ڈائرکٹر غالب انسٹی ٹیوٹ جناب شاہد ماہلی نے کہا کہ غالب کا رام پور سے جو گہرا لگاؤ تھا اس کا اندازہ ہمیں غالب کے خطوط کو پڑھ کر بخوبی ہوتا ہے سیمینار کے فوائد کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ اس دو دِن کے سیمینار میں پڑھے گئے مقالوں کو غالب انسٹی ٹیوٹ جلد ہی کتابی شکل میں شائع کرے گا۔ اس سیمینار کے صدر پروفیسر محمد حسن نے کہا کہ شاگردانِ غالب کا معاملہ کافی پیچیدہ ہے استاد کا اثر شاگردوں نے کتنا قبول کیا یہ معلوم نہیں البتہ غالب کے شاگرداُن کی کس زبان و انداز کی پیروی کرتے ہیں یہ معلوم ہے آپ نے فرمایا کہ غالب پر ڈرامہ بھی میں نے لکھا ہے اور مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ

غالب کا زندگی کے ساتھ کشمکش اور ٹکراؤ کا انداز علمی تھا۔ خواجہ حسن ثانی نظامی نے کہا کہ "غالب اور رام پور" عنوان سے قومی سمینار نہایت اہم ہے کیونکہ غالب بیک وقت دو ریاستوں رام پور اور لوہارو سے وابستہ تھے۔ رضا لائبریری کے افسر بکار خاص وقار الحسن صدیقی نے کہا کہ ۱۸۵۷ء کے غدر میں لکھنؤ اور دہلی کے اجڑنے کے بعد رام پور دبستان بنا اور علم و ادب کی ترقی ہوئی۔ آپ نے فرمایا کہ غالب نے ہی نواب یوسف علی خاں کو ناظم بنایا۔ پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ ریاست رام پور نے غالب کی مالی مشکلات کو کم کر دیا تھا انہیں دہلی میں سو روپے اور رام پور میں قیام کے دوران دو سو روپیہ ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔ اس موقع پر جن اہلِ دانش نے اپنے مقالات پیش کئے ان میں ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر اسلم پرویز، ڈاکٹر کمال احمد صدیقی، مولانا مظاہر اللہ خاں، ڈاکٹر شعائر اللہ خاں، پروفیسر حسن نظامی، ڈاکٹر ابن فرید، پروفیسر شریف حسین قاسمی، ڈاکٹر شاہ عبد السلام، پروفیسر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی، بشارت علی خاں اور ڈاکٹر شہزاد انجم قابلِ ذکر ہیں۔

فخر الدین علی احمد میموریل لکچر

۱۳ رمئی ۲۰۰۳ء

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کے زیرِ اہتمام فخر الدین علی احمد میموریل لکچر کے موقع پر مشہور اسلامی اسکالر اور سیاست داں ڈاکٹر رفیق ذکریا نے "ہندوانڈیا میں مسلمانوں کی شناخت" کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ جس طرح غالب ایک عظیم شاعر ہونے کے باوجود زندگی کی پریشانیوں سے دوچار تھے اور اُن معاصرین نے انہیں وہ اہمیت نہ دی جس کے وہ مستحق تھے ٹھیک اُسی طرح آج کا مسلم بھی اپنی شناخت کے مسئلے میں تذبذب کا شکار ہے۔ ہندو مسلم اتحاد پر گفتگو کرتے ہوئے آپ نے سر سید احمد خاں کے اُس قول کا بھی حوالہ دیا جس میں انہوں نے ہندو اور مسلم کو اس ملک کی دو خوبصورت آنکھوں سے تعبیر کیا تھا اور کہا تھا کہ ہندو اور مسلمان دو ایک قومیں

ہیں جو ایک فضا میں سانس لیتی ہیں، گنگا جمنا کا پانی پیتی ہیں اور اسی زمین کی پیداوار کو اپنی غذا بناتی ہیں اور دونوں کی مذہبی رسومات اور تہذیب و ثقافت قدرِ مشترک ہیں۔ مسلمانوں کے سامنے پیش آنے والے بیشمار مسائل کا تجزیہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ کچھ معاملات ایسے ہیں جس کے ہم سب مسلمان ذمہ دار ہیں۔ گجرات کے فسادات کے حوالے سے آپ نے کہا کہ ذاتی مفادات کے پیشِ نظر کسی بھی مسلم حکومت نے سرکاری سطح پر اس فساد کی مذمت نہیں کی۔ مسلمانوں کی شناخت کے مسئلے پر آپ نے فرمایا کہ عرب، ایران اور سینٹرل ایشیا کے کئی ایسے ممالک ہیں جو ہندوستان کے پڑوسی ممالک میں گنے جاتے ہیں اور انہوں نے اپنی علمی روایات اور تہذیب کے ذریعے اپنی شناخت برقرار رکھی ہے۔ ہندوستان کے بھی مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ خود طے کریں کہ اس ملک میں انہیں اپنی شناخت کیسے برقرار رکھنی ہے کیونکہ یہی ان کا ملک ہے اور وہ جسمانی اور جذباتی سطح پر اس ملک سے جڑے ہوئے ہیں، آپ نے ہندوستانی لیڈرشپ پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ آزادی کے بعد سے آج تک مسلمانوں کے کسی بھی مسئلے میں کوئی بھی لیڈر اور پارٹی سنجیدہ نہیں نظر آتی، اردو ہندوستان کی ایک بڑی زبان اور مسلمانوں کی مادری زبان ہے لیکن آج تک اس زبان کو اس کا حق نہ مل سکا اس موقع پر آپ نے سرکاری سیکٹر اور غیر سرکاری سیکٹر کے تقریباً تمام شعبوں میں مسلمانوں کی نمائندگی کا تفصیلی جائزہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کے تقریباً تمام شعبوں میں مسلمانوں کی نمائندگی بہت کم اور تقریباً تمام شعبوں میں مسلمانوں کے خلاف شدید نفرت پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر رفیق ذکریا کے لکچر سے پہلے غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اپنی استقبالیہ تقریر میں مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے غالب انسٹی ٹیوٹ کے بانی مرحوم فخر الدین علی احمد کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایک سیکولر دانشور اور ماہرِ تعلیم

تھے۔ فخر الدین علی احمد میموریل لکچر کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ یہ لکچر تقریباً ۲۰ سالوں سے ہو رہا ہے اور ملک کی ممتاز شخصیتوں نے ان لکچرز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ڈاکٹر رفیق ذکریا کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ آپ ایک مشہور دانشور اور سیاست داں ہیں اور آپ کی آج کی گفتگو سے بہت اہم باتیں ہمارے سامنے آئیں گی۔ اس موقع پر ملک کے سابق صدر جناب آر وینکٹ رمن نے اپنی صدارتی گفتگو میں ڈاکٹر رفیق ذکریا کے علمی اور معلوماتی لکچر پر انہیں مبارک باد دیتے ہوئے کہا کہ رفیق ذکریا اُن لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے ہمیشہ ہندو مسلم دوستی کی شمع کو روشن کیا ہے اسلام کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ اسلام امن کا مذہب کا اور دنیا کا کوئی بھی مذہب انسانیت کے خلاف نفرت کا سبق نہیں سکھاتا ہے ڈاکٹر رفیق ذکریا کے لکچر کے حوالے سے باتیں کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ آپ کی کافی باتوں سے میں متفق ہوں اور ان تمام مسائل کا حل اسی وقت ہو سکتا ہے جب دونوں فرقوں کے لوگ آپس میں بیٹھ کر ایک مضبوط رشتے کی بنیاد رکھیں۔ آخر میں ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی، ممبر راجیہ سبھا نے تمام سامعین خصوصاً جناب وینکٹ رمن اور ڈاکٹر رفیق ذکریا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ڈاکٹر رفیق ذکریا کو ان کے اس کامیاب لکچر پر انہیں مبارک باد دی اور کہا کہ اس طرح کی گفتگو سے مسلمانوں کے معاملات اور مسائل کو سمجھنے اور انہیں حل کرنے میں آسانی ہوگی۔ اس موقع پر جناب شاہد ماہلی، ڈائرکٹر غالب انسٹی ٹیوٹ، محترمہ محسنہ قدوائی، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر شریف حسین قاسمی، پروفیسر صادق، پروفیسر شمیم حنفی، جناب موسیٰ رضا، جناب سید شہاب الدین، جناب سراج حسین، ڈاکٹر کمال احمد صدیقی، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ، پروفیسر محمد حسن، کے علاوہ بڑی تعداد میں مختلف شعبے کے لوگ موجود تھے۔

غالب انسائیکلوپیڈیا

غالب انسٹی ٹویٹ کے بنیادی کاموں میں ایک غالب انسائیکلوپیڈیا کی تدوین ہے۔ اسکی اہمیت سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا چوں کہ یہ بنیادی کام ہے۔ یہ کام اب پروفیسر نذیر احمد صاحب کی نگرانی میں شروع ہوگیا ہے۔ اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ غالب کے تمام فارسی اور اردو آثار میں جن حضرات کا ذکر آیا ہے، جن مقامات کے نام موجود ہیں اور اسی طرح ان میں ادبی، ثقافتی، تاریخی، سماجی اور دیگر نوع کے وضاحت طلب امور نظر آتے ہیں ان پر حسب ضرورت روشنی ڈالی جائے۔ اس سلسلے میں غالب شناسوں اور صاحبانِ ذوق کو انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے خطوط لکھے گئے ہیں اور ان سے مختلف عنوانات پر تحقیقی مقالات لکھنے کی خواہش کی گئی ہے۔ ان عنوانات پر جو بھی کچھ لکھا جانا ہے وہ ان کے بارے میں غالب کے اظہارات وخیالات کی روشنی ہی میں لکھا جانا ہے۔ یہ کام آسان نہیں، لیکن ایسا بھی نہیں کہ ناممکن ہو۔ اسی لیے یہ پروجکٹ شروع کیا گیا ہے اور اس امید پر کہ غالب شناس اور دیگر متعلقہ دانشور اس کام میں دلچسپی کا مظاہرہ کریں گے اور گوناگوں موضوعات پر مقالات تالیف کریں گے اور غالب اور غالب شناسی سے اپنے تعلق خاطر کا ثبوت فراہم کریں گے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ نے غالب شناسوں ہی پر بھروسہ کیا ہے اور یہ کام شروع کیا ہے۔ امید یہ ہے کہ جب یہ پروجکٹ پایۂ تکمیل کو پہنچے گا تو غالب پر تحقیقی کام کرنے والوں کو دیگر ماٰخذ ومراجع سے بے نیاز کردے گا۔

Ghalibnama

NEW DELHI

July : 2003 VOLUME : 24 No. 2

Price : Rs. 120/-

Printer & Publisher

SHAHID MAHULI

Computer Composer

MOHD. UMAR KAIRANVI

Printed by:

AZIZ PRINTING PRESS

Tel. : 23285884

GHALIB NAMA

Aiwan-e-Ghalib, Aiwan-e-Ghalib Marg.

(Mata Sundri Lane), New Delhi-110002

Ph. : 23232583-23236518

Ghalibnama

Chief Editor :

PROF. NAZIR AHMAD

Editors :

PROF. SADIQUR RAHMAN KIDWAI

PROF. SHAREEF HUSAIN QASEMI

SHAHID MAHULI

GHALIB INSTITUTE

AIWAN-E-GHALIB MARG (MATA SUNDRI LANE),
NEW DELHI:110002

Ghalibnama

Vol. 24 No. 2 July 2003

مَیں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہُوں